تاریخ کی

مظلوم شخصیتیں

یعنی:-

ایسے درجن بھر مقدس مظلوم صحابہ کرامؓ کا تذکرہ جن کے اُجلے دامنوں کو تاریخ کی کہانیاں اور جعلی روایات نے
سیاہ الزامات کا نشانہ بنایا، ان کا دفاع کرنے کی کوشش کی گئی ہیں، قرآن و حدیث اور اصول روایت و درایت کی روشنی میں معاندین صحابہ کی سازشوں
اور ان سے اخذ کردہ نتائج کا سنجیدہ اور علمی تجزیہ، نیز تاریخ اور اس کی روایات پر اصولی بحث

از:

مولانا عبدالعلی فاروقی

فاضل دیوبند، ایم۔اے

ادارہ تحقیقات اہل سنت

بلال پارک بیگم پورہ لاہور

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا (صدق الله العظيم)

بڑی ہے وہ بات جو ان کے منہ سے نکلتی ہے یہ لوگ کچھ نہیں کہتے سوائے جھوٹ کے

تاریخ کی مظلوم شخصیتیں

یعنی:-

بعض ان مظلوم صحابہ کرام کا تذکرہ جن کے اُجلے دامنوں کو تاریخ کی پامال اور ضعیف روایات سے
داغدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن و حدیث اور اصولِ روایت و درایت کی روشنی میں ان مطاعن صحابہ کی حقیقت
اور ان سے اخذ کردہ نتائج کا سنجیدہ اور علمی تجزیہ نیز تاریخ اور اس کی روایات پر اصولی بحث

از:

مولانا عبد العلی فاروقی

فاضل دیوبند ایم اے

ناشر:

مکتبہ البدر، کاکوری، لکھنؤ ۲۲۶۱۰۱

دوسرا ایڈیشن

نام کتاب ـــــــــــ تاریخ کی مظلوم شخصیتیں

نام مصنف ـــــــــــ مولانا عبد العلی فاروقی

کتابت ـــــ شبیر احمد قاسمی

طباعت

قیمت



مکتبۂ "البدر" کاکوری لکھنؤ

۲۲۷۱۰۷

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحات
عرض ناشر	۵	حضرت علیؓ کی کعبہ میں ولادت	۶۰
اساس فکر	۶	حضرت علیؓ کی زرہ کا معاملہ	۶۴
سند رسالت	۷	حضرت علیؓ پر خلافت طلبی کا الزام	۷۳
راہِ ہدایت	۸	حضرت حسنؓ	۸۱
ظلم کیا ہے؟	۹	حضرت حسنؓ کی حضرت معاویہؓ سے مصالحت	۸۲
انتساب	۱۰	حضرت حسنؓ اور کثرت طلاق	۸۹
مقدمہ	۱۱	جوانانِ جنت کے سردار	۹۳
حضرت عثمان غنیؓ	۲۰	حضرت حسنؓ کی صحابیت	۹۷
خاندان کے افراد کو عہدے دینا	۲۱	تبصرہ	۱۰۹
مسلمانوں کے مال میں خیانت	۲۳	حضرت معاویہؓ	۱۱۱
عمال کی تقرری میں ظلم	۲۶	حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ	۱۱۳
ہرمزان کے قصاص کا معاملہ	۴۰	حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ سے اختلاف	۱۱۶
دیگر اعتراضات	۴۳	حضرت علیؓ کی دشمنی کا افسانہ	۱۲۴
حضرت علی مرتضیٰؓ	۴۷	یزید کی ولیعہدی	۱۳۶
اصل حقیقت	۴۹	کچھ اور کرم فرمائیاں	۱۴۸
ایک توجہ طلب امر	۵۲	حضرت معاویہؓ اور ملوکیت	۱۴۹
حضرت علیؓ کی مواخات	۵۵	حضرت معاویہؓ کے گورنروں کے مظالم	۱۵۲

مضامین	صفحات	مضامین	صفحات
حضرت حسنؓ کو زہر خورانی اور حضرت معاویہؓ	۱۵۵	حضرت مغیرہ بن شعبہؓ	۲۳۵
حضرت حسینؓ	۱۶۱	حیات وخدمات	۲۳۶
حضرت حسینؓ کی صحابیت	۱۶۳	نصب وعزل کی وجہ	۲۳۸
حضرت حسینؓ کی شہادت	۱۶۶	حضرت مغیرہؓ اور یزید کی ولیعہدی	۲۴۱
چند ضروری وضاحتیں	۱۷۴	حقیقت کیا ہے؟	۲۴۵
حضرت حسینؓ کی اصل مظلومیت	۱۸۳	الکامل کی غیر معتبر روایت	۲۵۰
حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ	۱۸۶	حضرت ابوذر غفاریؓ	۲۵۶
پس منظر	۱۸۶	حال ومقام	۲۵۷
حیات وکارنامے	۱۸۸	حضرت ابوذرؓ سے ابن سبا کی ملاقات	۲۶۰
تحکیم	۱۹۳	حضرت ابوذرؓ کی تحریک	۲۶۲
ثالثوں کا فیصلہ	۲۰۱	کیا حضرت ابوذرؓ کو جلاوطن کیا گیا؟	۲۶۳
وضاحت طلب امور	۲۰۵	کیا ابوذرؓ اشتراکی تھے؟	۲۶۵
فیصلہ پر ایک نظر	۲۰۹	حضرت ابوذرؓ کی مظلومیت	۲۶۹
تحکیم اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ	۲۱۰	حضرت عبداللہ بن سعدؓ	۲۷۰
حضرت عمرو بن العاصؓ	۲۱۶	حضرت عبداللہ بن سعدؓ کا ارتداد	۲۷۲
شخصیت وکردار	۲۱۸	افریقہ کے خمس کا معاملہ	۲۷۴
حضرت علیؓ پر قتل عثمان کی ذمہ داری ڈالنے کا شوشہ	۲۲۱	مصر کی گورنری کا معاملہ	۲۷۷
نیزوں پر قرآن بلند کرانے کی جنگی چال	۲۲۴		
فیصلہ میں بدعہدی	۲۳۲		

عرضِ ناشر

خدائے بزرگ و برتر کے اس احسان عظیم کا شکر ادا کرنے کی ہمارے قلم میں طاقت نہیں کہ اس نے "مکتبہ البدر" کی مطبوعات کی فہرست میں پیش نظر وقیع، علمی اور سنجیدہ کتاب "تاریخ کی مظلوم شخصیتیں" کو شامل فرمایا۔ ناشر کا کام ہی کتابوں کی اشاعت ہے، اور اس لحاظ سے ہرگز یہ کوئی کارنامہ نہیں ہے کہ مکتبہ البدر کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایک نئی کتاب پیش کی جارہی ہے، بلکہ ہماری خوشی کا اصل سبب اس کتاب کا موضوع اور اس کا مواد ہے، انشاء اللہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ بھی یہی فیصلہ کریں گے کہ ہماری خوشی حق بجانب ہے۔

کتاب میں کیا ہے؟ یہ تو آپ کو اس کے مطالعہ ہی سے معلوم ہوگا، لیکن اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ اس کے مواد کے جمع و ترتیب میں اس کے مؤلف نے جو محنت کی ہے اس کے پس پشت جس مبارک جذبے کی کارفرمائی ہے وہ لائق قدر بھی ہے اور مستحق پذیرائی بھی۔

بفضلہ تعالیٰ اس کتاب کو سنجیدہ اور علمی حلقوں کیساتھ ساتھ عوامی طور پر بھی بہت قبولیت حاصل ہوئی اور اس کا پہلا ایڈیشن کافی عرصہ پہلے ختم ہوگیا جبکہ کتاب کی مانگ برابر جاری رہی، لیکن محدود وسائل کیوجہ سے خواہش اور کوشش کے باوجود دوسرے ایڈیشن میں تاخیر ہوتی چلی گئی، اور اب ایک طویل وقفہ کے بعد اس کی نوبت آرہی ہے، امید ہے کہ ہماری مجبوریوں کا احساس کرتے ہوئے قارئین ہمیں معاف کریں گے، اور اب اس ایڈیشن کی بھی حسب سابق پذیرائی کریں گے۔

محمد شفیع قاسمی منیجر مکتبہ البدر، کاکوری لکھنؤ



مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْـَٔهُ فَاٰزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيمًا (الفتح آیت ۲۹)

اساسِ فکر

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ہمراہ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں مہربان ہیں۔ تو انہیں دیکھے گا رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی چاہتے ہیں ان کی نشانی ان کے چہروں میں سجدوں کے نشان سے ہے۔ یہ مثال ان کی تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے کہ جیسے کھیتی کہ اس نے اپنا پٹھا نکالا پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹا ہوا پھر اپنی نال پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ خوش کرتا ہے کاشت کاروں کو تاکہ ان سے کافروں کو غصہ دلائے۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کیے بخشش اور بہت بڑے اجر کا۔



عن عبد اللہ بن مغفل قال قال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوهم غرضًا
من بعدی فمن احبهم فبحبی احبهم ومن ابغضهم فببغضی
ابغضهم ومن اذاهم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ
ومن اذی اللہ فیوشک ان یاخذہ۔ (الحدیث. مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۵۴)

حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ: اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، میرے صحابہؓ کے معاملہ میں، کہ
میرے بعد ان کو اپنے طعن وتشنیع کا نشانہ نہ بنالینا، کیونکہ جس نے ان سے محبت کی
تو میری محبت کے ساتھ ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کے
ساتھ ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی
اور جس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی اور جس نے
اللہ کو تکلیف پہنچائی تو اندیشہ ہے کہ اللہ
اس کو عذاب میں پکڑ لے گا۔

راہِ ہدایت :

عن عبد اللہ مسعود انہ قال

من کان متأسیا فلیتأس باصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانھم ابرھذہ الامۃ قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا واقومھا ھدیا واحسنھا حالا قوم اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ واقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلاً واتبعوا آثارھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم۔ (الحدیث، شرح العقیدہ للسفارینی ج ۲ ص ۳۱)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا،
جو شخص اقتدا کرنا چاہتا ہے تو اسے اصحاب رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرنا چاہیئے
کیونکہ یہ لوگ اس پوری امت میں
اپنے دلوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ پاک اور علم کے اعتبار سے سب سے زیادہ گہرے اور تکلف کے اعتبار سے سب سے کم اور عادتوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ معتدل اور حالات کے اعتبار سے سب سے زیادہ بہتر ہیں۔
یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کیلئے چن لیا، تو تم لوگ ان کی فضیلت کو پہچانو اور
ان کے نقوش قدم کی پیروی کرو کیونکہ یہی لوگ سیدھے راستے پر ہیں۔

ظُلم کیا ہے

وَضعُ الشَّیٔ فِی غَیرِ مَحَلِّہٖ

کسی چیز کو اس کی اصلی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا

یعنی

جس طرح عالم کو جاہل ○ بادشاہ کو فقیر ○ باعزّت کو بے عزّت ○ اور غنی کو محتاج

قرار دینا ظلم ہے

اسی طرح

جاہل کو عالم ○ فقیر کو بادشاہ ○ بے عزّت کو باعزّت ○ اور محتاج کو غنی

قرار دینا بھی ظلم ہے

اور

مظلوم وہی نہیں جس کے رُتبہ کو گھٹا کر پیش کیا جائے بلکہ جس شخص کو اس کے واقعی اور حقیقی رُتبہ سے بڑھا کر پیش کیا جائے، وہ بھی مظلوم ہے!

!

انتساب

مادرِ علمی

دارُالعلوم دیوبند

کے نام

جس کے فیض تربیت نے اس خدمت گرامی کے لائق بنایا،

شورش عندلیب نے رُوح چمن میں پھونک دی

ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

عبدالعلی فاروقی



بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

تاریخ نویسی ایک ایسا فن ہے جس کے موجد مسلمان ہیں اور مسلمانوں ہی کی کاوشوں سے دنیا کو اس فن کا علم ہوا، لیکن جس طرح اور بہت سے علوم وفنون ہماری غفلت کوشیوں اور سہولت پسندیوں کی وجہ سے ہمارے ہو کر بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے اور اسلاف کرام کے عظیم سرمایہ کے وارث ان کے اخلاف اپنی وراثت کو ضائع کر کے گداگری کی زندگی بسر کرنے پر راضی ہو گئے، اسیطرح کا معاملہ اس فن کے ساتھ بھی پیش آیا، اور آج ہماری تہی دامنی، بے حسی اور غیرت سے محرومی کا یہ عالم ہے کہ ہمارا ایک مؤرخ، ایک مؤلف اور مقرر مغرب سے آئی ہوئی ہر بات کو سند کا درجہ دیتا ہے، اور ایک یہودی یا عیسائی مستشرق کی زہر میں ڈوبی ہوئی تحریر کو پیش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

یہ ایک المناک داستان ہے جس کی تفصیل بیان کرنیکا نہ یہ موقع ہے نہ ہی اس جگہ وہ ہمارا مقصود ہے لیکن اتنی بات بہرحال ہر مسلمان کے ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ فن تاریخ نویسی کے موجد ومخترع مسلمان ہیں، اور کم از کم اسلامی تاریخ کے مواد کے سلسلہ میں ان کے مرتب کردہ اصولوں کو اپنائے بغیر اس فن سے

صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، اس مقام پر ایک غور طلب بات یہ ہے کہ جب فن تاریخ نویسی کے موجد مسلمان ہیں تو یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ ان ہی کی مرتب کردہ تاریخ سے اسلامی عقائد، اسلامی اعمال اور اسلامی شخصیات کا مذاق اڑایا جا سکے، اور دنیا کے سامنے اسلام ایک انقلاب آفریں مذہب اور ایک تاریخ ساز تحریک کی صورت میں نہیں بلکہ فتنہ و فساد کی آماجگاہ اور شر در فتن کی تربیت گاہ کی صورت میں سامنے آئے؟

کیا مسلمان، خیر القرون یا ان سے قریب تر عہد کے مسلمان کسی ایسے فن کی ایجاد اور اس کی ترویج میں حصہ لے سکتے تھے جو ان کے عقیدوں کے فساد ان کے اعمال کے بگاڑ، اور ان کی شخصیات کی رسوائی اور پھر اس کے نتیجہ میں ان کے دین و مذہب کی ایک مکروہ و گھناونی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنے کا ذریعہ بنتا؟ حاشا للہ!

ہم تاریخ کے خشک اور دقت طلب موضوع کے سلسلہ میں کسی طویل تمہید کے بغیر ایک بات کی طرف سادہ انداز میں توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ عام طور پر ہم تین علحدہ علحدہ چیزوں کو ایک سمجھنے کے فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور بس یہی چیز ساری خرابیوں اور فساد کی جڑ ہے۔

تاریخی مواد، تاریخی داستان اور تاریخی واقعات یہ تین بالکل مختلف قسم کی چیزیں ہیں، اور ہماری بدنصیبی، لاپروائی اور محرومی یہ ہے کہ ایک منظم و منصوبہ بند سازش کے تحت ان تینوں ہی چیزوں کو ہمارے سامنے "تاریخ" بنا کر پیش کیا گیا، اور ہمارے عوام نہیں بلکہ ہمارے سہولت پسند، تن آسان اور مصنف بن جانے کے شوقین "خواص" نے تاریخی مواد پر مشتمل طبری کی "تاریخ الامم والملوک"، تاریخی داستانوں و افسانوں پر مشتمل واقدی کی "فتوح الشام" بلکہ صادق سردھنوی کے تاریخی ناولوں

اور راشد الخیری کے بجائی شہادت ناموں تک کو تاریخ کی کتابیں قرار دیکر ان میں درج شدہ چیزوں کو "روایت و درایت" کی کسوٹیوں پر پرکھے بغیر تاریخی واقعات کی حیثیت سے عوام کے سامنے پیش کر دیا، اور پوری جرأت و بیباکی کیساتھ "تاریخ طبری" اور "فتوح الشام" کے حوالوں سے استدلال کرنے لگے۔

یہاں پر اس سچائی کو بھی بیان کر دینا مناسب ہے کہ "تاریخ طبری" کو سند کا یہ مقام عطا کرانے میں مجوسیوں، یہودیوں اور سبائیوں جیسی اسلام دشمن طاقتوں کا بھرپور ہاتھ ہے، جنھوں نے ابن جریر طبری کی تاریخی مواد پر مشتمل کتاب کو وہ حیثیت دلادی جس کے بارے میں خود اس کے مؤلف نے بھی کبھی سوچا نہ ہوگا کیونکہ طبری نے تو تاریخی مواد پر مشتمل ایک گودام تیار کیا تھا جس میں انھوں نے واقعات سے متعلق قوی وضعیف ہر قسم کی روایات کو جمع کر کے رد کرنے یا قبول کرنے کی ذمہ داری "اصحاب تحقیق" پر ڈال دی تھی اور خود طبری نے کوئی ایسا معیار نہیں مقرر کیا تھا جس کے ذریعہ ان کی جمع کردہ روایات کے سلسلہ میں قوی یا ضعیف کا فیصلہ کیا جا سکے یہی وجہ ہے کہ طبری کی اس کتاب میں ایک ہی واقعہ کے بیان کے سلسلہ میں مختلف و متضاد روایات بھی مل جاتی ہیں، اور اس طرف کوئی اشارہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے قابل قبول کون ہے اور ٹھکرائے جانے کے قابل کون؟ مثلاً حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ پر حضرت علی مرتضیٰؓ کی بیعت خلافت کے سلسلہ میں طبری میں دو متضاد روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ سے سیرت نبویؐ و سیرت شیخین پر عمل کا وعدہ لے لیا تو حضرت علیؓ ہی نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے کہا کہ بس اب دیر کی ضرورت نہیں ہے ان ہی کے ہاتھ پر بیعت کیجئے، چنانچہ پہلے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے بیعت کی، اس کے فوراً بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی، جبکہ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی بیعت

کے بعد حضرت علیؓ ناراض ہو کر جانے لگے تو اہل شوریٰ نے ان کو پکڑ لیا، اور ان کو دھمکی دی کہ اگر آپ نے بیعت سے انکار کیا تو انجام ٹھیک نہ ہوگا، اس دھمکی پر مجبوراً حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی، ایک ہی واقعہ کے متعلق یہ دو بالکل متضاد بیانات ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ایک ہی صحیح ہوگا اور دوسرا غلط، درانحالیکہ طبری نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ صحیح بات کیا ہے؟ اسی طرح اور بھی واقعات ہیں جن کے سلسلہ میں طبری میں متضاد روایات بغیر کسی ترجیحی اشارہ کے موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم طبری کو اس لئے قصوروار نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے اپنے تک پہونچی ہوئی "ہر قسم کی" روایات کو بیان کر دینے ہی کی ذمہ داری لی ہے، چاہے وہ ان تک ابومخنف لوط بن یحییٰ جیسے کذاب اور رافضی ہی کے ذریعہ پہونچی ہو۔ یہ ذمہ داری تو طبری کی روایات کے ذریعہ "تاریخی واقعات" بیان کرنے اور ان کے ذریعہ استدلال کرنے والوں کی تھی کہ وہ "روایت و درایت" کے اصولوں کے ذریعہ اس بات کی تحقیق کریں کہ کون سی روایت واقعاتی ہے اور کون سی افترا محض؟ لیکن ہوا یہ کہ اسلام دشمن عناصر کی ذہن سازی کے نتیجہ میں "علماء سوء" کے ایک گروہ نے "تاریخ طبری" کو "کتاب مقدس" کا درجہ عطا کر دیا۔ اور ابن جریر طبری کے بارے میں اپنی طرف سے یہ فیصلہ سنا دیا کہ "طبری نے اپنی کتاب میں روایات اچھی طرح چھان پھٹک کر جمع کی ہیں" اور یہ چودھویں صدی ہجری میں کیا جانیوالا وہ بے بنیاد دعویٰ ہے جو تیسری صدی ہجری میں خود ابن جریر طبری نے بھی نہیں کیا تھا، یعنی "مدعی سست گواہ چست"۔ طبری کی اس کتاب کو یہ مقام اس لئے عطا کیا گیا کہ "تاریخ طبری" کے حوالہ کے بعد کسی تحقیق کی ضرورت کا احساس باقی نہ رہے اور پھر اسی "تاریخ طبری" کی روایات پر یاران ستم پیشہ و بندگان ہوس نے بنیاد رکھتے ہوئے ایسی ایسی "تاریخی و تحقیقی" کتابیں لکھ ماریں

کر جو دشمنان اسلام کے ہاتھوں کے ہتھیار بن گئیں اور قرنِ اول یعنی عہد صحابہ کرام ہی سے "تاریخ کی مظلوم شخصیتوں" کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور خرافات سے بھرپور کتابوں کے مطالعہ کے نتیجہ میں ملت اسلامیہ کا ایک طبقہ بھی متعدد اکابر صحابہ کرام کے سلسلہ میں سوء ظنی کا شکار ہو کر اپنی متاع ایمانی سے ہاتھ دھونے کے درپے ہو گیا۔ ذَالِکَ ھُوَ الخُسرانُ المُبِین۔

اس جگہ ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اسلام کے نام لیوا "ایک گروہ" نے تو جملہ اصحابِ رسول کو مجروح کرنے اور ان کے اعتبار کو ساقط کرنے ہی کو اپنے ایمان کی اساس قرار دے لیا ہے، درحقیقت یہ وہ اسلام دشمن گروہ ہے جس کو صحابہ کرام سے صرف اس وجہ سے عداوت ہے کہ یہ جماعتِ قدسیہ رسالت محمدی کی اولین گواہ اور دین محمدی کی پاسبان ہے، اور جماعتِ صحابہ کے سرخیل و امام سیدنا ابو بکر صدیق نے اپنے دور خلافت کے ابتدائی دنوں میں مانعین زکوٰۃ کی فتنہ پردازی کے موقع پر اپنے بے لچک موقف کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اَیَنقُصُ الدِّینُ وَاَنَا حَیٌّ (کیا دین میں کمی کر دی جائے اور میں زندہ رہوں) صحابہ کرام کے یہی وہ جذبات تھے جو اس اسلام دشمن ٹولہ کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ کیونکہ ان حوصلہ مندوں کی موجودگی میں اسلام دشمن عناصر کو کامیابی نصیب ہونے کا سوال ہی نہ تھا اس لئے اسلام کے نام لیوا اس شاطر گروہ نے تمام ہی صحابہ کو اپنے طعن و ملامت کا نشانہ بنایا، تاکہ رسالت محمدی کے ان اولین اور مضبوط ترین گواہوں کو مجروح کرنے کے بعد بآسانی دعوئ رسالت کو مشکوک کر کے اس میں من مانی تحریفیں کر سکیں۔ لیکن اس کتاب میں براہِ راست اس "شاطر گروہ" کے مطاعن پر اس لئے کوئی تبصرہ نہیں آئیگا کہ وہ تو اپنے کو "اصحاب دشمن" گروہ کی حیثیت سے پیش ہی کرتا ہے۔ اس کتاب میں تو ان "نادان دوستوں" کی ستم ظریفیوں

کا بیان ہوگا جنھوں نے مال کے ڈھیر میں سے "کھوٹے سکوں" کا انتخاب کر کے اپنی فکری کجروی اور دین بیزاری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ "ان نادان دوستوں" کو اپنے مدعا کے اثبات کے لئے "عیّار دشمنوں" ہی سے مدد لینا پڑتی ہے، اور اس طرح دونوں کے درمیان ایک فکری اتحاد خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں طبری اور فتوح الشام وغیرہ جیسے قدیم مآخذ پر بھی اعتماد نہ کیا جائے تو پھر اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیات سے صحیح اور معتبر انداز میں واقفیت کی کیا صورت ہو گی؟۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ایسی واضح اور محکم کتاب ہدایت ہے جس میں انسانی زندگی میں پیش آنیوالی ہر ضرورت کے لئے مکمل رہنمائی موجود ہے، اور یہی وہ کتاب مقدس ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے، کیونکہ اس کے ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا ذمہ خود پروردگار عالم نے لے لیا ہے۔ قرآن کے سوا "اعتبار و استناد کا یہ مقام" دنیا کی کسی کتاب یا کسی قول کو حاصل نہیں ہے، حتیٰ کہ احادیث نبوی کی صحت اور سقم کو جانچنے کے لئے بھی "روایت و درایت" کے اصول اسی لئے مقرر ہیں کہ ہر وہ قول جسے حدیث کی حیثیت سے پیش کیا جائے وہ حدیث ہی نہیں ہوتا، کیونکہ "احادیث" کے نام سے "موضوعات" کا ایک ذخیرہ بھی تیار کیا جا چکا ہے۔ پھر جب حدیث کی صحت جانچنے کیلئے "روایت و درایت" کی کسوٹیوں پر پرکھنا ضروری ہے تو تاریخی روایات کو "کتاب مقدس" کا درجہ دیکر بے چون و چرا کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟۔

طبری اور الکامل ہوں، یا فتوح الشام اور مروج الذہب، ان میں سے کسی کو نہ صرف مجموعۂ اکاذیب اساطیر قرار دیا جا سکتا ہے، نہ ہی ان کو قرآنی اعتبار حاصل

ہوسکتا ہے۔ بلکہ ان کی روایات کے سلسلہ میں ان ہی اصولوں کی پابندی کرنا ہوگی جو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں مقرر کئے جاچکے ہیں، اور وہ اصول درج ذیل ہیں۔

۱۔ کسی بھی واقعہ کا ذکر اگر قرآن مجید یا "حدیث صحیح" میں موجود ہے تو قرآن و حدیث ہی کے بیانات کو صحیح سمجھا جائیگا، اور اس کے خلاف اہم سے اہم "تاریخی روایت" کو بلا تامل رد کردیا جائے گا۔

۲۔ قرآن و حدیث میں کسی جماعت یا گروہ کے عمل و کردار کے سلسلہ میں جو بیان موجود ہوگا اس کی رعایت لازم ہوگی، اور اس کے خلاف تاثر دینے والی "تاریخی روایات" کی تاویل ممکن ہوگی تو کی جائے گی، ورنہ انھیں رد کردیا جائے گا۔

۳۔ جرح و تعدیل کے مقررہ اصولوں کے مطابق ہر راوی کی جانچ ضروری ہے، اس سلسلہ میں اس کی بھی رعایت کی جائے گی کہ اگر ایک ہی واقعہ سے متعلق دو روایتیں ہیں اور ایک کا راوی صاحب واقعہ کا حامی یا غیر جانب دار ہو، اور دوسری کا راوی مخالف تو ترجیح پہلے راوی کی روایت کو حاصل ہوگی، کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہزار احتیاط کے باوجود مخالفت اپنا رنگ کسی نہ کسی صورت میں دکھا ہی دیتی ہے۔

۴۔ ہر واقعہ کی تصدیق کے لئے "روایت" کیساتھ ساتھ "درایت" کی کسوٹی پر بھی پرکھا جانا ضروری ہے اور سند میں کوئی نقص نہ بھی ہو تو بھی "درایت" کیخلاف ہونا ہی اس واقعہ کے "خلاف واقعہ" ہونے کے لئے کافی دلیل ہے۔

مندرجہ بالا اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے کتب تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، تو ایسے افراد کی ایک طویل فہرست تیار ہوجائے گی، جن کو "تاریخ کی مظلوم شخصیتیں" قرار دینا حق بجانب ہوگا۔ خصوصاً انسانی تاریخ کی سب سے مقدس اور راستباز جماعت "صحابہ کرامؓ" کی مظلومیت تو اس اعتبار سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام مجید

ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں مجموعی طور پر اس جماعت کے تمام افراد سے اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا ہے، پھر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی صحابی رسولؐ ظالم و خائن ہو، یا دین کو پس پشت ڈال کر دنیا کے حصول کا طالب ہو؟ ۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ هٰذَا بهتان عظیم ۔

تاریخ کی مظلوم شخصیتوں کا انتخاب، اور ان شخصیتوں کے سلسلہ میں مکذوبہ روایات کی چھان پھٹک کے بعد ان کے دامن کو آلائشوں سے پاک کرنا ایک بڑا اور علمی کام ہے جس کیلئے وسیع مطالعہ اور کثیر معلومات کیساتھ ساتھ سلامت فکر بھی ضروری ہے،

راقم الحروف نے اپنی علمی بے بضاعتی کے باوجود اس کام کا ارادہ اس لئے نہیں کیا کہ اسے اپنی "تاریخ دانی" کا کچھ احساس ہو، نہ ہی اس کے ذریعہ تاریخ کی کوئی خدمت مقصود ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ توفیق ایزدی سے اس نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی، اور ایسے ماحول میں شعور کی منزلیں طے کیں کہ عظمت اصحابؓ کا بیان اور مطاعن اصحابؓ کا دفاع اس کی زندگی کا محبوب مشغلہ، اور بہترین نصب العین قرار پایا۔

وكفى به فخرا وابتهاجا۔

چونکہ تاریخ کی مظلوم شخصیتوں کا سلسلہ صحابۂ کرامؓ ہی سے شروع ہو جاتا ہے اس لئے فطری طور پر اس بیان کی ابتداء بھی صحابۂ کرامؓ ہی سے ہو گی، اور راقم الحروف ایسی ہی دس مظلوم شخصیتوں کا تذکرہ اس کتاب میں کر رہا ہے جس کا نام بھی "تاریخ کی مظلوم شخصیتیں" قرار پایا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ یہ مبارک کام آگے بڑھے گا، اور حق تعالیٰ ایسے افراد پیدا فرمائے گا جو اسلاف کے دامنوں پر اڑائی گئی غلاظتوں سے ان کے دامن کو صاف کر کے اسلام کی صحیح تاریخ کی تدوین میں ہاتھ بٹائے گا۔

آخر میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ راقم الحروف نے اپنی بساط بھر محنت و جانفشانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، بلا مبالغہ ہزاروں صفحات کے

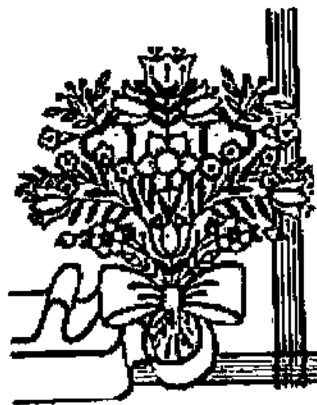
مطالعہ اور معمول کے مشاغل کیساتھ ساتھ کم ازکم ۶ ماہ کی شب و روز کی کاوش قلم کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے، پھر بھی یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ کتاب اغلاط و اسقام سے پاک ہوگی، لہٰذا اہل علم حضرات سے درخواست ہے کہ دورانِ مطالعہ انھیں جو قابل اصلاح نکات ملیں ان سے راقم الحروف کو ضرور مطلع کریں تاکہ آئندہ ان اصلاحات سے استفادہ کیا جاسکے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ؀

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اپنے مخدوم بزرگ حضرت مولانا عبدالوحید صاحب صدیقی صدر المدرسین مدرسہ اسلامیہ فتحپور اور ان کے لائق داماد مولانا محی الدین صاحب فتحپوری کا شکریہ نہ ادا کروں، جنھوں نے متعدد اہم اور کمیاب کتابوں سے راقم الحروف کو نہ صرف استفادہ کا موقع مرحمت فرمایا، بلکہ خالص علمی و دینی جذبہ سے یہ کتابیں کئی ماہ تک اپنے پاس رکھنے کی اجازت بھی دیدی۔ فجزاھما اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

عبدالعلی فاروقی

دارالعلوم فاروقیہ، کاکوری، لکھنؤ

۲۹ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ



حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

تاریخ کی مظلوم شخصیتوں میں سیدنا عثمان غنیؓ کا نام سرفہرست ہے۔ جن کو بے شمار ذاتی وصفاتی کمالات کے باوجود پامال اور جھوٹی روایات کا سہارا لیکر مطعون کیا گیا، اور ایک مظلوم شہید، اور ذوالنورین صحابیٔ رسولؐ کے بے داغ و قابل تقلید کردار کو مجروح کرکے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے جلیل القدر اسلاف سے برگشتہ کرنے کا سامان فراہم کیا گیا۔ فیا حسرتاً علی العباد۔

حضرت عثمان غنیؓ پر سبائیوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً کئے جانیوالے تمام مطاعن کو ماضیٔ قریب کے ایک "نامور محقق" اور ایک "فکر نو" کے بانی "نادان دوست" نے اپنی پسندیدہ کتاب "تاریخ طبری" کے بھرپور حوالوں سے بڑی سلیقہ مندی کیساتھ مرتب کرنے کے بعد اپنی "صاف ستھری اور بے لاگ تاریخی کتاب" میں جمع کرکے بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع کیا، اور امت مسلمہ کا یہ ذہن بنانے کی "دینی خدمت" انجام دی کہ نعوذ باللہ

حضرت عثمان غنیؓ ایک اقربا پرور، ظالم، خائن، متعصب اور نااہل حکمران تھے

ذیل میں ہم "معترض موصوف" کے حضرت عثمان غنیؓ پر اعتراضات اور ان کے

جوابات اختصار کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

خاندان کے افراد کو عہدے دینا

اعتراض:۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے عہد خلافت میں اپنے خاندان بنو امیہ کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدے عطا کئے جس کو دوسرے خاندانوں و قبیلوں کے لوگ تلخی کیساتھ محسوس کرنے لگے؟۔

جواب:۔ یہ اعتراض محض اس لئے ہے کہ اتفاقاً حضرت عثمان غنی رضؓ کا تعلق بھی بنو امیہ ہی سے تھا، اور "بنو امیہ" وہ نام ہے جس کو سنتے ہی اسلام دشمن عناصر کو بخار چڑھنے لگتا ہے، ویسے سچائی یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضؓ نے نہ تو بنو امیہ کو غیر ضروری اہمیت دی نہ ہی اس خاندان کے لوگوں کو ان کے دور میں کوئی ایسا اعزاز و منصب ملا جو اُن سے پہلے نہ ملا ہو۔ ہاں بنو امیہ کو اپنی فراست، تدبیر، حسن انتظام اور حرب و جنگ کی مخصوص صلاحیتوں کی وجہ سے عہد رسولؐ بلکہ اس سے بھی پہلے سے جو امتیازی مقام حاصل تھا اسے حضرت عثمان غنی رضؓ نے بیک جنبش قلم ختم نہیں کیا، اور نہ ہی وہ ایسا کر سکتے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ عہد رسالت کے ستّرہ عاملوں میں درج ذیل آٹھ عامل بنو امیہ میں کے تھے۔

۱۔ مکہ میں عتابؓ بن اسید، ۲۔ فدک میں عبداللہ بن سعیدؓ، ۳۔ خیبر میں عمرو بن سعیدؓ، ۴۔ یمن میں خالد بن سعیدؓ، ۵۔ عرینہ میں عثمان بن سعیدؓ، ۶۔ تیما میں یزید بن ابی سفیانؓ، ۷۔ بحرین میں ابان بن سعیدؓ، ۸۔ نجران میں ابو سفیان بن حرب۔

اس کے علاوہ درج ذیل اہم خدمات پر بنو امیہ ہی کے یہ افراد مامور تھے۔

کتابت وحی:۔ حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ، خالد بن سعیدؓ، عبداللہ بن سعیدؓ

اور عمرو بن سعیدؓ۔ بازار مکہ کے نگران اعلیٰ :۔ سعید بن سعیدؓ۔

اسی طرح شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں بھی خاندان بنو امیہ کے باصلاحیت افراد کی خدمات سے استفادہ کا سلسلہ برقرار رہا چنانچہ مملکت کے کل ۱۲ بڑے عہدیداروں میں سے درج ذیل ۷ بڑے عہدیدار اموی خاندان کے تھے۔

۱۔ افسر افواج :۔ خالد بن سعیدؓ۔ ۲۔ گورنر شام :۔ معاویہ بن ابی سفیانؓ۔ ۳۔ گورنر دمشق :۔ یزید بن ابی سفیان۔ ۴۔ گورنر یمن :۔ ابان بن سعیدؓ۔ ۵۔ گورنر مکہ :۔ عتاب بن اسیدؓ۔ ۶۔ گورنر عرب الجزیرہ۔ ولید بن عقبہؓ۔ ۷۔ عامل صدقات :۔ عتبہ بن ابی سفیانؓ۔

عہد رسالت اور عہد خلافت شیخین کے بعد اب عہد خلافت عثمانی رضؓ میں اموی خاندان کے عہدیداروں کی تفصیل پر ایک نظر ڈالیئے۔

کل ۲۷ گورنروں میں سے درج ذیل چار گورنر اموی تھے۔

۱۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ گورنر شام۔ ۲۔ حضرت ولید بن عقبہؓ گورنر کوفہ

۳۔ حضرت سعید بن العاصؓ گورنر عراق۔ ۴۔ حضرت عبداللہ بن عامرؓ گورنر بصرہؓ

ان چار کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے ایک اور رشتہ دار (رضاعی بھائی) حضرت عبداللہ بن سعدؓ بن ابی سرح عامری مصر کے گورنر تھے۔

گورنری کے علاوہ اہم عہدوں میں سے صرف ایک عہدہ یعنی میر منشی مروان بن الحکم اموی کے پاس تھا۔

اس طرح حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں اہم عہدیداروں میں سے کل چھ عہدیدار حضرت عثمان غنیؓ کے رشتہ داروں میں سے تھے، انہیں سے بھی حضرت ولید بن عقبہؓ اور حضرت سعید بن العاصؓ خلافت عثمانی ہی

میں معزول کر دیئے گئے تھے۔

مندرجہ بالا تفصیلات کو سامنے رکھ کر قارئین خود ہی فیصلہ کریں کہ حضرت عثمان غنی رضؓ پر عائد کئے جانیوالے اس الزام میں کتنی سچائی ہے کہ انھوں نے اپنے خاندان بنوامیہ کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدے عطا کر دیئے تھے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عہد رسالت کے ۱۰ گورنروں میں سے آٹھ بنوامیہ کے تھے اور بقیہ دو دوسرے خاندانوں کے۔ اس کے مقابلہ میں عہد خلافت عثمانی کے ۲۶ گورنروں میں سے صرف چار یا زیادہ سے زیادہ ۵ خلیفہ کے خاندان کے تھے، بقیہ ۲۳ یا ۲۲ اُن کے خاندانی اور رشتہ دار نہ تھے۔

اسی طرح حضرات شیخین رضؓ کے ۲۱ بڑے عہدیداروں میں سے ۷ بنوامیہ میں سے تھے، جبکہ حضرت عثمان غنی رضؓ کے عہد خلافت کے کم ازکم ۳۴ اہم عہدیداروں میں سے زیادہ سے زیادہ صرف ۶ عہدیداران کے خاندان کے تھے۔ اس طرح یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضؓ کے عہد خلافت میں عہد رسالت اور عہد خلافت ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ کے مقابلہ میں خاندان بنوامیہ کے عہدیداروں کا تناسب ہر طرح گھٹا ہے بڑھا نہیں۔ اس کے باوجود حضرت عثمان رضؓ پر اقربا پروری کا الزام عائد کرتے ہوئے یہ کہنا کہ "انھوں نے اپنے عہد خلافت میں اپنے خاندان بنوامیہ کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدے عطا کئے جس کو دوسرے خاندانوں اور قبیلوں کے لوگ تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے"، کیا حضرت عثمان کو تاریخ کی ایک اہم ترین مظلوم شخصیت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟۔

مسلمانوں کے مال میں خیانت

حضرت عثمان غنی رضؓ پر خیانت کا الزام عائد کرتے ہوئے یہ بات بیان کیجاتی

ہے کہ ایک موقع پر حضرت عثمانؓ نے خود کہا کہ

"ابوبکرؓ و عمرؓ بیت المال کے معاملہ میں یہ پسند کرتے تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقرباء کو بھی اسی حالت میں رکھیں، مگر میں اس میں صلہ رحمی پسند کرتا ہوں۔"

اور پھر انھوں نے اپنی اسی پالیسی کے مطابق مسلمانوں کی امانت (بیت المال) سے خیانت کر کے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کی اور ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدف اعتراض بن کر رہیں۔

جواب:۔ جہاں تک حضرت عثمان غنیؓ کی خیانت اور بیت المال کی رقموں میں اپنے رشتہ داروں کیساتھ صلہ رحمی کرنے کی پالیسی کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں ہم طبری ہی کی روایت سے حضرت عثمان غنیؓ کا وہ بیان نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو طبری کے بیان کیمطابق حضرت عثمان غنیؓ نے ایک ایسی مجلس میں دیا تھا جس میں صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت کے علاوہ عبداللہ بن سبا (منافق) بھی موجود تھا، اور حضرت عثمانؓ کے اس بیان کی حضرات صحابہؓ نے پوری پوری تائید و تصدیق کی تھی حضرت عثمان غنیؓ کا اس سلسلہ میں بیان یہ تھا۔

"ملحدین یہ کہتے ہیں کہ میں اپنے اقرباء کیساتھ محبت کرتا ہوں اور ان کیساتھ صلہ رحمی کرتا ہوں۔ تو اپنے اقرباء کے ساتھ محبت کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے لیکن میری محبت نے مجھے کبھی ظلم پر آمادہ نہیں کیا میں بیت المال سے اپنے اقرباء کے صرف جائز حقوق ادا کرتا ہوں باقی جو صلہ رحمی کرتا ہوں وہ اپنی جیب خاص سے کرتا ہوں، بیت المال کی رقم نہ اپنے لئے حلال سمجھتا ہوں نہ ہی اپنے اقرباء کے لئے"[1]

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۳۸۵

اب رہ گیا بیت المال سے اپنے اقربا کے جائز حقوق ادا کرنے کا معاملہ تو اُسے کسی بھی قانون سے جرم نہیں گردانا جا سکتا، کیونکہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی جاگیروں میں سے چار اپنے داماد اور چچازاد بھائی حضرت علیؓ کو اور دو دو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو عطا فرمائیں تھیں، جو حضور کے خسر تھے۔ اسی طرح خلیفۂ اوّل و بلا فصل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دو دامادوں حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کو ایک ایک جاگیر عطا کی تھی۔ اسی طرح خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ فاروق نے بھی اپنے دیگر رشتہ داروں کے علاوہ ینبع کا نخلستان اپنے خسر حضرت علیؓ کو عطا کیا تھا۔

ان روایات کی موجودگی میں حضرت عثمان غنیؓ کا اپنے رشتہ داروں کو بیت المال میں سے ان کے جائز حقوق دینا کیوں کر جرم و خیانت کہلا سکتا ہے؟ اور اگر بیت المال سے اپنے اقرباء کے جائز حقوق ادا کرنے کو خیانت سے تعبیر کرنے پر اصرار ہے تو یہ بھی کہنا پڑیگا کہ یہ "وہ جرم" ہے جس کی بنیاد نعوذباللہ خود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین ابوبکرؓ و عمرؓ ڈال چکے تھے۔ اور حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے سابقہ بزرگوں کی روش ہی کو اپنایا تھا اور اس کا سلسلہ اُن کے بعد بھی جاری رہا۔

یہی وجہ ہے کہ "سبائیوں" کی طرف سے خیانت کے الزام کے جواب میں حضرات صحابۂ کرامؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کی دی ہوئی صفائی کو تسلیم کیا تھا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ کے دور سے آج تک کے دولتوں کو حضرت عثمان غنیؓ پر اعتماد ہے ہاں ابن سبا اور اس کے حواریوں نے ان پر خیانت کا الزام عائد کیا تھا اور سبائی ذہنیت کے لوگ آج بھی "اپنے مقتدیٰ" کے اس الزام کو صحیح مان کر حضرت عثمان غنیؓ کے بیان صفائی اور صحابۂ کرامؓ کی تصدیق کو غلط ہی باور کرانے کے درپے ہیں، یہ ہے

حضرت عثمان غنیؓ کی مظلومیت ۱

عمّال کی تقرری میں ظلم

اعتراض: حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے "نااہل" اعزہ و اقربا کو عہدے و منصب دینے کی خاطر اُن سے کہیں زیادہ اہل و موزوں اکابر صحابۂ کرامؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے عزیزوں رشتہ داروں کا تقرر کر دیا۔ اور اس طرح انھوں نے اپنے ظالم و متعصب ہونیکا ثبوت فراہم کیا۔ چنانچہ کوفہ کی گورنری سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے ماں شریک بھائی ولید بن عقبہؓ کو، بصرہ کی گورنری سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامرؓ کو اور مصر کی گورنری سے حضرت عمرو بن العاصؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے دودھ شریک بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کر دیا۔

جواب:۔ مندرجہ بالا گورنروں کی تبدیلی کے اصل اعتراض سے پہلے قارئین درج ذیل چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں تو اصل مسئلہ سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

۱۔ عہدیداروں کی تقرری، برخاستگی اور تبدیلی ہر حکومت کا ایک خالص انتظامی مسئلہ ہوتا ہے اور ایسی کسی کارروائی پر اعتراض صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب دلائل کے ساتھ یہ ثابت ہو جائے کہ اس میں صاحب اقتدار کی بدنیتی کو دخل ہے ورنہ انتظامی و ملکی مصالح کے پیش نظر کسی عہدیدار کی تقرری، معزولی یا تبدیلی عام ڈھرّے کی کارروائی میں شمار ہوتی ہے۔ اور حکومت کے منصوبوں و پروگراموں کو بروئے عمل لانے اور کاموں کی رفتار میں تیزی و پھرتی لانے کیلئے ایسا کرنا ناگزیر بھی ہوتا ہے، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنے دور خلافت میں حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کرامؓ

کو ان کے عہدوں سے معزول کیا تھا۔

۲۔ ضروری نہیں کہ جو شخص اپنے ذاتی فضائل اور مکارم کی وجہ سے بلند مقام کا حامل ہو وہ انتظامی امور، ملکی مصالح، داخلی وخارجی معاملات اور سیاسی بصیرت کے لحاظ سے بھی اتنا ہی بلند مقام رکھتا ہو، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص عبادت وریاضت، خشیت وانابت اور ورع وتقویٰ کے اعتبار سے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں انتظامی صلاحیتیں اس شخص میں کہیں زیادہ ہوتی ہیں، جو ان فضائل ومکارم کے اعتبار سے اس سے فروتر شخصیت کا مالک ہوتا ہے، چنانچہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ روحانیت ودینداری ایک جداگانہ صلاحیت ہے اور امور نظم ونسق کی مہارت ایک جداگانہ صلاحیت، اسی لئے بار بار کے تجربات کے بعد خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کو اپنی مجلس شوریٰ کے سامنے یہ مسئلہ اٹھانا پڑا تھا کہ عمال ووالیوں کے سلسلہ میں کس صلاحیت کو ترجیح دینا چاہئے، خشیت وانابت الی اللہ وغیرہ جیسے ذاتی فضائل کو یا نظم ونسق اور انتظام ملکی میں مہارت کو؟ اور پھر بالآخر یہی طے پایا تھا کہ عوامی مناصب کے لئے دوسرے قسم کے اصحاب صلاحیت ہی کو ترجیح دینا مناسب ہوگا۔

۳۔ کسی ایک عہدہ دار کو معزول کر کے اس کی جگہ دوسرے عہدیدار کی تقرری ہمیشہ ایسی ہی صورت میں نہیں ہوتی کہ پہلے عہدیدار کے مقابلہ میں دوسرا عہدیدار فائق وبرتر ہو، نہ ہی یہ ضروری ہے کہ معزولی کے ذریعہ اس معزول عہدیدار کی تذلیل وتوہین کرنا مقصود ہو، بلکہ بسا اوقات یہ کارروائی کسی فتنہ کو فرو کرنے یا کسی عوامی مصلحت یا کسی اور اعلیٰ سیاسی مقصد کے تحت بھی ہوتی ہے چنانچہ حضرت فاروق اعظمؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ان کے عہدوں سے ان کی صلاحیتوں اور خدمات کے اعتراف کے باوجود

معزول کر دیا تھا، اور یہ معزولی نہ ان دونوں بزرگوں کی تذلیل و توہین کی خاطر ہوئی تھی نہ ہی ان بزرگوں نے اسے اپنی توہین و تنقیص سمجھا تھا۔

۴۔ شریعت اسلامیہ نے دین و دیانت اور اخلاق و امانت کے ساتھ ساتھ عہدہ و منصب کی مفوضہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کے علاوہ یہ شرط کہیں بھی نہیں لگائی ہے کہ صاحب اقتدار اپنے کسی عزیز یا رشتہ دار کو کسی بھی قیمت پر کوئی عہدہ نہ دے، بالفاظ دیگر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دین فطرت نے چہروں کو نہیں بلکہ کاموں کو صلاحیت کا معیار قرار دیا ہے، پھر کسی بھی شخص کو محض اس بات پر طعن کرنیکا حق کیسے مل جائیگا کہ فلاں خلیفہ یا امیر عام نے اپنے فلاں اور فلاں رشتہ داروں کو عہدیدار بنا دیا؟ جبکہ فطری طور پر ہر آدمی کو اپنے لائق و با صلاحیت رشتہ داروں سے غیروں کے مقابلہ میں زیادہ تعاون ملنے کی امید ہوتی ہے۔

بنیادی طور پر مندرجہ بالا امور سے اتفاق کر لینے کے بعد حضرت عثمان غنی رضؓ پر کئے جانیوالے اس اعتراض کی بے وقعتی پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انھوں نے متعدد اہم و موزوں عہدیداروں کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے رشتہ داروں کا تقرر کر دیا۔ پھر بھی ہم مندرجہ بالا تینوں گورنروں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی معزولی اور ان کی جگہ بالترتیب حضرت ولید بن عقبہؓ، حضرت عبداللہ بن عامرؓ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کی تقرری کے حقیقی اسباب و عوامل پر اس لئے روشنی ڈالدینا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین کے سامنے "سبائی سازشوں اور ان کے معصوم شکاروں" کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

جہاں تک کوفہ کی گورنری سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو معزول کر

کے ان کی جگہ حضرت ولید بن عقبہؓ کو مقرر کرنے اور بصرہ کی گورنری سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو معزول کر کے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو مقرر کرنے کا معاملہ ہے تو اس کو صحیح زاویہ سے سمجھنے کے لئے کوفہ اور بصرہ کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی شورش پسندی سے مختصر طور پر واقفیت ضروری ہے۔

کوفہ سبائی تحریک کا ایک بڑا مرکز تھا، اور "سبائی تحریک" یہاں سے بہت کچھ برگ و بار لائی۔ فساد پسندی اور فتنہ جوئی اہل کوفہ کی سرشت میں داخل تھی۔ یہاں کے لوگوں کا عام رویہ یہ تھا کہ جو شخص بھی یہاں گورنر ہو کر آتا کچھ دن تو یہ لوگ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے، اور پھر اسی "پسندیدہ گورنر" کی "عیب جوئی" میں لگ جاتے، اور نت نئے بہانے تراش کر اور بے بنیاد الزامات عائد کر کے خلیفہ سے گورنر کی تبدیلی کا مطالبہ کرتے، متعدد بار کی شاطرانہ کامیابیوں نے ان میں گورنروں کو تبدیل کرانے کا چسکا ڈال دیا تھا۔ اور وہ اسکو اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتے تھے کہ وہ جب چاہتے ہیں اپنی "صلاحیتوں" کو استعمال کر کے گورنر تبدیل کرا لیتے ہیں، چنانچہ حضرت فاروق اعظمؓ جیسے مدبر اور سخت گیر حکمراں کو بھی اپنے دور خلافت میں بار بار کوفہ کا گورنر تبدیل کرنا پڑا۔

سب سے پہلے انھوں نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا لیکن اہل کوفہ نے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور بار بار دربار خلافت میں ان کی شکایات لیکر پہونچنے لگے، اگرچہ ہر مرتبہ تحقیق کے بعد اہل کوفہ کی شکایات غلط ہی ثابت ہوتیں، لیکن فتنہ فرو کرنے کے لئے بالآخر فاروق اعظمؓ نے حضرت سعدؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت عمار بن یاسرؓ کا تقرر کر دیا۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کو حضرت سعدؓ کی بے گناہی کا یقین تھا، اور انھوں نے اس بات کا اظہار بھی فرما دیا تھا کہ میں سعدؓ کو ان کے کسی قصور کی وجہ سے نہیں بلکہ دفع شر کیلئے معزول

کررہا ہوں۔ اور حضرت عمرؓ کے حضرت سعدؓ پر اعتماد کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنے بعد اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے جن چھ بزرگوں کو منتخب کیا تھا ان میں سے ایک حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، بہر حال جب حضرت سعدؓ کی معزولی کے بعد حضرت عمار بن یاسرؓ کوفہ کے گورنر ہوئے، تو اہل کوفہ نے ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا اور ان کے خلاف بھی دربار خلافت میں شکایتیں پہونچانے لگے، اور پھر پونے دو برس کے بعد حضرت عمرؓ کو انھیں بھی معزول کر کے ان کی جگہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا تقرر کرنا پڑا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے مثالی دور خلافت میں کوفہ کے گورنروں کی اس طرح بار بار کی تبدیلی سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور سے ہی کوفہ کے حالات کس درجہ خراب تھے اور وہاں کے لوگوں کی تخریبی ذہنیت کا کیا عالم تھا، چنانچہ فاروق اعظمؓ جیسے مدبر ادرا ولوالعزم حکمراں نے اہل کوفہ کے سلسلہ میں اپنی برہمی وبے چینی کا یوں اظہار فرمایا۔

من عذیری من اھل الکوفة	پناہ بخدا۔ کوفہ کے لوگ بھی عجیب و غریب
ان استعملت علیھم القوی	ہیں، اگر میں ان پر کوئی مضبوط آدمی حاکم
فجروہ وان ولیت علیھم	بناتا ہوں تو یہ لوگ اس میں کیڑے نکالنے
الضعیف حقروہ۔	شروع کر دیتے ہیں، اور اگر کسی کمزور کو حاکم
(عثمان ذوالنورین صفحہ ۱۹۶ بحوالہ فتوح البلدان ۲۷۵)	بناتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں

حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کے ابتدائی دنوں میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ہی کوفہ کے گورنر رہے جن کا تقرر حضرت عمر فاروقؓ نے کیا تھا لیکن کوفہ کے لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق وہی، کامیاب حربہ،

حضرت مغیرہؓ کے خلاف بھی استعمال کیا، اور ان کی شکایات ہی پر حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت مغیرہؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک مرتبہ پھر کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ چونکہ حضرت عثمانؓ کو یہ بات معلوم تھی کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو کوفہ کی گورنری سے ان کے کسی قصور کیوجہ سے معزول نہیں کیا تھا، بلکہ دفع شر کے لئے انھوں نے یہ اقدام کیا تھا اس لئے حضرت عثمانؓ نے دوبارہ حضرت سعدؓ ہی کو گورنر کوفہ مقرر کرنا مناسب سمجھا کہ ان کو پہلے بھی اسی عہدہ پر رہنے کی وجہ سے کام کی نوعیت اور کوفہ کے لوگوں کی ذہنیت کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اندازہ تھا، اور ان سے بجا طور پر یہ توقع قائم کی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوں گے، لیکن اہل کوفہ کے لئے حضرت سعدؓ کسی طرح قابل برداشت نہ تھے، اور جب وہ حضرت عمرؓ جیسے سخت گیر حکمراں سے پیہم مطالبہ کر کے حضرت سعدؓ کو معزول کرا چکے تھے تو اب بھلا وہ دوبارہ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں ان کو کیوں کر برداشت کرتے؟ اور پھر یہی ہوا کہ اہل کوفہ کے مسلسل اصرار اور ان کی من گڑھنت شکایات پر حضرت عثمانؓ نے حضرت سعدؓ کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا۔

اس تفصیل سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے کن حالات میں اور کس طرح مجبور ہو کر حضرت سعدؓ کو کوفہ کی گورنری سے معزول کیا تھا، اور اس معزولی میں ان کی ”خواہش نفس“ کا کتنا دخل تھا۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ حضرت سعدؓ جیسے جلیل القدر، معمر اور بزرگ صحابیٔ رسول کی جگہ حضرت ولید بن عقبہؓ جیسے جوان العمر اور حدیث الاسلام صحابی کا تقرر کیا محض اس لئے ہوا کہ وہ حضرت عثمان غنیؓ کے ماں جائے بھائی تھے؟

تو اس کا جواب واضح طور پر یہی ہے کہ اس وقت کے حالات، حضرت عثمان غنیؓ کے کردار، اور حضرت ولید بن عقبہؓ کی اپنی شخصیت، ہر چیز سے اس الزام کی تردید ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوفہ کے گورنروں کے سلسلہ میں حضرت عثمانؓ کے سامنے حضرت عمرؓ کے دور سے لیکر اب تک کے حالات تھے، جن سے انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کوفہ کا گورنر کسی ایسے شخص کو بنایا جائے، جو جوانُ العمر ہونے کیساتھ ساتھ قوت فیصلہ کا مالک، عزم و استقلال میں پختہ، سخت گیر اور اچھی سوجھ بوجھ والا ہو، اور حضرت ولید بن عقبہؓ کو ان کی ان ہی صفات کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی مصطلق کا عامل صدقات اور حضرت فاروق اعظمؓ عرب الجزیرہ کا گورنر بنا چکے تھے، اور وہ ان اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا کامیاب تجربہ رکھتے تھے، اس لئے حضرت عثمان غنیؓ کی نگاہ انتخاب حضرت ولید بن عقبہؓ پر گئی، اور ان کو شورش زدہ کوفہ کا گورنر بنا دیا، چنانچہ حضرت ولیدؓ نے اپنے انتخاب کو صحیح ثابت کر دکھایا، اور حضرت عثمان غنیؓ کی توقعات کو اس طرح پورا کیا کہ ۲۵ھ سے ۳۰ھ تک پانچ سال بڑی شان و شوکت اور حسن انتظام و تدبیر کے ساتھ کوفہ کے گورنر رہے اور وہاں کے حالات پر بڑی حد تک کنٹرول حاصل کر لیا، جس کی تفصیل بیان کرنیکا یہ موقع نہیں ہے۔ [1]

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کا حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو

---

[1] کوفہ کے فتنہ جو اور شر پسند سبائیوں نے وقت اور تاخیر ہی کیساتھ سہی بہرحال حضرت ولیدؓ کی معزولی کیلئے بھی بہانہ تراش لیا، اور بڑی کوششوں اور خصوصی مہارت کے ساتھ ان پر شراب نوشی کا جھوٹا الزام عائد کر کے ان کو بھی معزول کرا دیا۔

معزول کر کے ان کی جگہ کوفہ کے گورنر کی حیثیت سے حضرت ولید بن عقبہؓ کو مقرر کرنا ایک سمجھا بوجھا، دانشمندانہ اور ملکی وانتظامی مصالح کے پیش نظر اہم فیصلہ تھا جس کو سبائیوں نے ایک ظالمانہ ومتعصبانہ فیصلہ کی حیثیت سے باور کرانے کی کوشش کی، اور ہمارے بے بصیرت تاریخ نویسوں نے اس "سبائی سازش" کو کامیاب بنانے میں کافی مدد کی ہے۔

اسی طرح بصرہ کا معاملہ بھی کوفہ سے ملتا جلتا تھا، عبداللہ بن سبا منافق جب مدینہ سے نکالا گیا تو سب سے پہلے بصرہ ہی آیا تھا اور وہاں کے حکیم بن جبلہ نامی شخص کیساتھ مل کر اپنی "سبائی تحریک" کا آغاز کیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ اس وقت کے گورنر کے تدبر اور فراست ایمانی نے جلد ہی اس کے خفیہ عزائم اور اسلام دشمن مزاج کو بھانپ لیا، اور ابن سبا کو بصرہ سے بھی راہ فرار اختیار کرنا پڑی، مگر اپنے قیام بصرہ کے زمانہ میں مذہب کے راستہ سے ہوس پسندی اور فتنہ پروری کے جو بیج اس نے بو دیئے تھے ان سے گل و بوٹے کھل کر رہے، اور اہل بصرہ کے دلوں میں بغاوت و سرکشی کے جراثیم نے اپنا گھر بنا لیا، چنانچہ فاروق اعظمؓ کے مضبوط اور چوکس نظام خلافت کے زمانہ سے ہی بصرہ کے لوگوں نے اپنی شورش پسندی اور فتنہ جوئی کا اظہار شروع کر دیا تھا، اور صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ جیسے پاکباز، جرأت مند اور مدبر گورنر کے خلاف سازش کر کے ان پر زنا کا الزام لگایا، اور حضرت فاروق اعظمؓ تک یہ شکایت پہونچائی حضرت فاروق اعظمؓ اہل بصرہ کی سرشت اور ان کی فسادپسندی سے بخوبی واقف تھے انھوں نے حضرت مغیرہؓ کے سلسلہ میں اہل بصرہ کی اس سازش کو بھی سمجھ لیا، مگر امن عامہ اور انتظامی مصالح کے پیش نظر انھوں نے حضرت مغیرہؓ کو بصرہ کی گورنری سے معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ

کا تقرر کر دیا۔ اور حضرت ابو موسیٰ کو ان کی تقرری کی اطلاع دیتے ہوئے بصرہ اور اہل بصرہ کے سلسلہ میں جو مختصر تبصرہ کیا وہ حضرت ابو موسیٰ کے لئے ایک آگاہی تھی کہ ان کو وہاں کام کرنے کیلئے کیا طریق کار اختیار کرنا ہوگا، چنانچہ فاروق اعظمؓ نے فرمایا۔

انی اسید ان ابعثک الی بلد قد عشش فیہ الشیطان۔ میں تم کو ایک ایسے شہر میں گورنر بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں، جہاں شیطان نے گھونسلہ بنا لیا ہے۔

یہ سن کر ابو موسیٰ نے درخواست کی کہ پھر تو میرے ساتھ کچھ مددگار بھی کر دیجئے، حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کی درخواست منظور کرتے ہوئے ان کے ساتھ چند مددگار بھی کر دیئے۔[1]

یہ تھے بصرہ کے وہ حالات جنھوں نے فاروق اعظمؓ جیسے صاحب عزم وہمت اور مدبر حکمراں کو حیران و پریشان اور کبیدہ خاطر بنا رکھا تھا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے فاروق اعظمؓ کی ہدایت کے مطابق ایسی حکمت عملی اپنائی کہ اہل بصرہ کو طویل عرصہ تک ان کے خلاف لب کشائی کا کوئی موقع نہ مل سکا، اور خلیفۂ دوم فاروق اعظمؓ اور پھر ان کے بعد خلیفۂ سوم عثمان غنیؓ کے دور خلافت کے ابتدائی ۶ سالوں تک بصرہ کے گورنر رہے، بالآخر ۲۹ھ میں اہل بصرہ نے ان کے خلاف بھی سازشوں کے جال بننا شروع کر دیئے، اور مختلف انداز میں خلیفۂ وقت تک ان کی اس منصب کے لئے نااہلی کی بات پہونچائی، ایک روایت کے مطابق

---

[1] عثمان ذوالنورین ص۱۹۵ بحوالہ فتوح البلدان ص ۳۴۰۔

غیلان بن فرشتہ نامی ایک شخص حضرت عثمان غنیؓ سے ملا، اور ان کو طعنہ دیا کہ "کیا آپ کو کوئی جوان آدمی نہیں ملتا جو ابو موسیٰ اشعری جیسے بوڑھے کو بصرہ کا گورنر بنا رکھا ہے؟" ایک دوسری روایت کے مطابق اہل بصرہ کا ایک طاقتور وفد دارالخلافہ مدینہ آیا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ سے اس بات کا پُرزور مطالبہ کیا کہ ابو موسیٰ کو بصرہ کی گورنری سے ہٹایا جائے، حضرت عثمان غنیؓ نے اگرچہ اہل بصرہ کے دباؤ اور اصرار پر حضرت ابو موسیٰ کو معزول کرکے اُن کی جگہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ کا تقرر کر دیا، لیکن انھیں اس بات کا اچھی طرح یقین تھا کہ اہل بصرہ نے ابو موسیٰ کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا ہے اور جس احسان فراموشی کا ثبوت دیا ہے، وہ ہرگز اس کے مستحق نہ تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی پوزیشن کی صفائی پیش کرتے ہوئے حضرت ابو موسیٰؓ کو لکھا کہ "میں آپ کو کسی کمزوری یا بد دیانتی کی وجہ سے معزول نہیں کر رہا ہوں، آپ مہاجرین اور السابقون الاولون میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں اور مجھے اس کا اعتراف ہے" ساتھ ہی تحریر فرمایا "میں نے عبداللہ بن عامرؓ کو حکم دیا ہے کہ وہ تینتیس ہزار درہم آپ کی خدمت میں پیش کر دے" [1]

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں حضرت عثمان غنیؓ پر یہ الزام کیونکر لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامرؓ کو بصرہ کا گورنر بنانے کی خاطر ابو موسیٰ اشعریؓ کو اس عہدہ سے معزول کیا؟

اب رہ گئی یہ بات کہ حضرت ابو موسیٰ کی معزولی کے بعد حضرت عبداللہ بن عامرؓ ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ تو سچائی یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے

---

[1] عثمان ذوالنورین ص ۲۰۲ بحوالہ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۲۔

یہ انتخاب اقربا پروری کے جذبہ سے ہرگز نہیں کیا بلکہ حضرت ابن عامرؓ میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو اس وقت کے حالات میں بصرہ کے گورنر کے لئے مطلوب تھیں۔ ان کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی، اور وہ ایک نہایت ہی ہوشمند، باحوصلہ اور جری نوجوان تھے، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا کہ اہل بصرہ کی یہ شکایت بھی تھی کہ ابو موسیٰ بہت بوڑھے ہیں، لہٰذا ان کو ہٹا کر بصرہ کا گورنر کسی جوان العمر شخص کو بنایا جائے، اور ابن عامرؓ وہ لائق فخر جوان تھے جن کے بارے میں حضرت علی مرتضیٰؓ کا ارشاد ہے کہ

ابن عامر سید فتیان قریش۔	ابن عامر قریش کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔

اس کے علاوہ عبداللہ بن عامرؓ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اور جتنے کامیاب گورنر ثابت ہوئے اس نے حضرت عثمان غنیؓ کے اس انتخاب کے جائز ہونے اور ان کی "جوہر شناسی" کی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا چنانچہ ایک طرف انھوں نے فارس و خراسان جیسے بغاوتوں و سازشوں کے مرکزوں کو فتح کر کے وہاں عربی و اسلامی اقتدار کے قدم جمائے، دوسری طرف بصرہ میں ایک کشادہ اور چوڑی سڑک تعمیر کرائی، اور تمام شاہراہوں پر سرائیں بنوائیں، نیز مہمان خانے تعمیر کرائے، اور پانی کے معقول انتظام کیلئے کنوئیں کھدوانے کے علاوہ کئی ایسی اہم نہریں تعمیر کرائیں جن کے بارے میں مؤرخین کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ "ابن عامر وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہریں بنوا کر ان میں چشموں کا پانی پہونچانے اور لوگوں کے سیراب ہونے کا انتظام کیا" غرضیکہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے نہ صرف یہ کہ اپنی حوصلہ مندی اور فراست کے ذریعہ بصرہ کے بگڑے ہوئے حالات پر قابو حاصل کیا، بلکہ اپنی حکمرانی کے

زمانے میں انھوں نے متعدد ایسے تعمیری و فلاحی کام کئے جن سے انکی اعلیٰ انتظامی قابلیت اور بہترین صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، اور حضرت عثمان غنی رضؓ کے دور خلافت میں ان کے خاندان کے اس پہلے عہدیدار نے اپنے روشن کارناموں کے ذریعہ اس الزام کی مکمل طور پر تردید کردی کہ اس کا انتخاب محض خلیفۂ وقت کی رشتہ داری کی وجہ سے ہوا ہے اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص سبائیوں کی زبان میں اپنی زبان ڈال کر گفتگو کرتا ہے تو اس کا علاج ہی کیا ہو سکتا ہے؟۔

کوفہ و بصرہ کے پرانے گورنروں کی معزولی کے اسباب اور نئے گورنروں کی تقرری کی مصلحتوں سے مفصل واقفیت حاصل کرنے کے بعد اب مصر کے معاملہ کو لیجئے جہاں حضرت عمرو بن العاصؓ کی جگہ پر حضرت عثمان غنی رضؓ کے دودھ شریک بھائی حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا تقرر گورنر کی حیثیت سے ہوا تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر حضرت عثمان غنی رضؓ کی جانب سے مقرر کئے جانیوالے گورنر حضرت عبداللہ بن سعدؓ حضرت عثمانؓ کے دودھ شریک بھائی تھے تو معزول کئے جانیوالے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ بھی کوئی غیر نہیں بلکہ ان کے بہنوئی تھے۔ ایسی صورت میں اس اعتراض کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کو اس لئے معزول کیا گیا تاکہ ان کی جگہ پر اپنے رشتہ دار عبداللہ بن سعدؓ کا تقرر کیا جا سکے۔ کیونکہ دونوں ہی خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ اگر حضرت عثمان غنی رضؓ کے پیش نظر رشتہ ہی عزل و نصب کے لئے بنیاد ہوتا تو اس کا لحاظ حضرت عمرو بن العاصؓ

کے سلسلہ میں "رشتہ کی نزاکت" کی وجہ سے زیادہ ضروری تھا۔

واقعہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے مصر کو نشیبی و بالائی دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور ایک حصہ کا گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کو دوسرے حصہ کا حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کو مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کو اپنے دور خلافت ہی میں حضرت عمرو بن العاصؓ سے یہ شکایت تھی کہ مصر جیسے سرسبز و شاداب اور زرخیز علاقہ سے جتنا خراج وصول ہونا چاہیئے وہ نہیں ہو رہا ہے۔ ان کے بعد جب حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ہوئے تو ان کو بھی حضرت عمرو بن العاصؓ سے یہ شکایت باقی رہی، جبکہ اس سلسلہ میں ان کو مصر کے دوسرے گورنر حضرت عبداللہ بن سعدؓ سے کوئی شکایت نہیں تھی، چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے اس سلسلہ میں تحریری طور پر حضرت عمرو بن العاصؓ سے شکایت بھی کی لیکن اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا،

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجموعی طور پر حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت عبداللہ بن سعدؓ کے درمیان کوئی مقابلہ نہ تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے جن کا شمار مدبرین عرب میں ہوتا تھا۔ وہ مصر کے فاتح بھی تھے اور اعلیٰ درجہ کے فوجی کمانڈر بھی لیکن خراج کی کم وصولی کے سلسلہ میں ان سے حضرت عمرؓ کو بھی شکایت رہی اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کو بھی۔

بعد میں حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی جدید اصلاحی اسکیم کے تحت مصر کو دو صوبوں کے بجائے ایک صوبہ بنا دیا، اور یہ طے کیا کہ اس صوبہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت عبداللہ بن سعدؓ دونوں کو ان کی خصوصی صلاحیتوں کے مطابق خدمات سپرد کی جائیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ حضرت عمرو بن العاصؓ فوجی کمانڈر رہیں، کیونکہ یہ ان کا خاص میدان ہے اور اس سلسلہ

میں ان کی زبردست خدمات بھی ہیں، لہٰذا وہ اس عہدہ پر رہ کر بہتر خدمات انجام دے سکیں گے۔ اور خراج وغیرہ کا مالیاتی شعبہ حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کی سپردگی میں رہے، کیونکہ وہ اس میدان میں حضرت عمروؓ کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

لیکن حضرت عمرو بن العاصؓ نے خلیفہ کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور وہ صرف فوجی کمانڈر کے عہدہ کے لئے راضی نہیں ہوئے، تب حضرت عثمان غنیؓ نے ان کو معزول کر کے حضرت عبداللہ بن سعدؓ کو پورے مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ اور فوج و مال وغیرہ کے سارے معاملات کا ان ہی کو ذمہ دار بنا دیا۔

اس تفصیل کی روشنی میں واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی معزولی ایک خالص انتظامی معاملہ میں ہوئی جس میں حضرت عثمان غنیؓ کی خواہش نفس کو کوئی دخل نہ تھا، اور نہ ہی وہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی قدر و منزلت کے منکر تھے، بلکہ خراج کی وصولی میں کمی کی اس شکایت پر جو ان کی طرف سے حضرت عمرؓ کو بھی تھی حضرت عثمانؓ نے یہ چاہا تھا کہ یہ شعبہ ان سے لیکر ایک ایسے آدمی کے سپرد کر دیا جائے جو حضرت عمرؓ کے دور سے اب تک اس سلسلہ میں کامیاب اور باصلاحیت ثابت ہوا ہے، اور جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس تبدیلی کو نامنظور کیا تو مجبوراً ان کی معزولی عمل میں آئی، کیونکہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی دیگر صلاحیتوں اور ان کی اعلیٰ قابلیتوں کے اعتراف کے باوجود حضرت عثمانؓ کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ مرکز کے مالیہ کو مستحکم کرنا بھی خلیفہ کی ذمہ داری ہے، اور اس سلسلہ میں مناسب و جائز ذرائع آمدنی پر پوری طرح نگاہ رکھنا ضروری ہوتا ہے، یہ ہے حضرت عثمان غنیؓ پر سبائیوں کی طرف سے عائد کئے جانے

والے اس الزام کی حقیقت کہ ،، انھوں نے اپنے اعزا و اقربا کو عہدے دینے کی خاطر ان سے کہیں زیادہ اہل و موزوں اکابر صحابہؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے عزیزوں و رشتہ داروں کا تقرر کر دیا ،، کیا اس وضاحت کے بعد بھی تاریخ کی جھوٹی اور پامال روایات کا سہارا لیکر حضرت عثمان غنیؓ جیسے معتمد صحابی پر اتنا سنگین الزام عائد کر کے انھیں مطعون کرتے رہنا کوئی ،، اسلامی خدمت ،، کہلا سکتا ہے ؟ ۔

ہرمزان کے قصاص کا معاملہ

اعتراض یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے ہرمزان کے قاتل عبیداللہ بن عمرؓ سے ان کا جرم ثابت ہونے اور حضرت علیؓ کے قصاصاً عبیداللہ کو قتل کا مشورہ دینے کے باوجود عبیداللہ کو قتل نہیں کرایا ، جبکہ اسلام کا یہ قانون واضح ہے کہ قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائیگا ۔ اس واقعہ سے عثمان غنیؓ کی نااہلی بالکل عیاں ہو جاتی ہے ۔

اصل اعتراض کے جواب سے پہلے اس پس منظر کا سمجھ لینا ضروری ہے جس میں حضرت عبیداللہ بن عمرؓ نے ہرمزان کو قتل کیا تھا ۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ پر جس دن قاتلانہ حملہ ہوا ، اس سے پہلے والی رات میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے دیکھا کہ ابولولو فیروز ، ہرمزان اور جفینہ تینوں ایک جگہ کھڑے ہوئے کچھ کانا پھوسی کر رہے ہیں ۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو دیکھکر یہ لوگ گھبرا گئے ، اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں ان کے کپڑوں سے ایک دو دھاری خنجر گرا ۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے یہ واقعہ دوسرے ہی روز حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ کے بعد بیان کر دیا تھا

جبکہ ان پر قاتلانہ حملہ کرنے والا اصل ملزم ابولولو فیروز پکڑا گیا تھا، اور اس کا وہ خنجر بھی ضبط ہو گیا تھا جس سے اس نے حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ابولولو نے تو قاتلانہ حملہ کے بعد ہی خودکشی کر لی، لیکن حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے عبیداللہ نے انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر ہرمزان اور جفینہ کا کام اپنے ہاتھ سے تمام کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت عبیداللہؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کے بیان کی بنیاد پر اور وہ خنجر دیکھ کر جس سے ان کے والد گرامی پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا، سازش قتل میں شرکت کی وجہ سے ہرمزان اور جفینہ کو قتل کیا تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت تنہا ایک فرد کی شہادت نہ تھی۔ بلکہ یہ مجوسیوں عیسائیوں و دیگر اسلام دشمن عناصر کی طرف سے اسلام کے سیل رواں پر روک لگانے کی ایک کامیاب اور منصوبہ بند سازش تھی۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کے قتل اور اس کے منصوبہ میں شریک تین افراد میں سے ابولولو اور ہرمزان مجوسی تھے جبکہ جفینہ عیسائی تھا۔ اور دوسری طرف حضرت عمرؓ کی شہادت سے سارا عالم اسلام سوگوار ہوا۔ اور بعد کے حالات سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کے قتل سے اسلام کی ایک جلیل القدر شخصیت ہی کا خاتمہ نہیں ہوا، بلکہ پورا اسلامی نظام اور مسلمانان عالم ایک ایسے زلزلہ کے صدمہ سے دوچار ہوئے جس کی تلافی نہ ہو سکی۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ کے قاتل یا قتل کے منصوبہ میں شریک لوگوں کے لئے کسی مسلمان کے دل میں کوئی جگہ نہ تھی، لیکن ان سب کے باوجود حضرت عبیداللہ بن عمرؓ نے جذبات سے مغلوب ہو کر قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا جرم کیا تھا، اس لئے حضرت عثمان غنیؓ کے خلیفہ ہوتے ہی ہرمزان کے ورثاء کی طرف سے اُن کے دربار میں پہلا مقدمہ

یہی پیش ہوا کہ عبیداللہ ہرمزان کے قاتل ہیں اور اُن پر جُرم ثابت ہے۔

حضرت عثمان غنی رض اس اسلامی قانون سے بخوبی واقف تھے کہ قتل ناحق کی سزا یہی ہے کہ قاتل کو بھی قصاص میں قتل کر دیا جائے، لیکن ان کے سامنے دو حقیقتیں اور بھی تھیں، اوّل یہ کہ ہرمزان کا قتل ہر طرح قتل ناحق نہ تھا دوم یہ کہ عبیداللہ بن عمر رض اپنے اُن جذبات کے سلسلہ میں تنہا نہیں ہیں جن سے مغلوب ہو کر انھوں نے ہرمزان کو قتل کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سبروں کے برعکس عبیداللہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ بہر حال حضرت عثمان غنی رض نے اس مقدمہ کو اپنی مجلس شوریٰ کے سامنے رکھا۔ حضرت علیؓ نے تو یہی رائے دی کہ عبیداللہ قاتل ہیں، لہٰذا قصاصًا ان کو بھی قتل کیا جائے، لیکن حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس رائے کی مخالفت کرتے ہوئے یہ کہا کہ کل عمر بن خطاب رض کو ایک غلام نے قتل کر دیا، اور آج ان کا بیٹا خلیفہ کے حکم سے قتل کر دیا جائے تو دنیا کیا کہے گی؟ اور پھر اپنی رائے پیش کی کہ اگر عبیداللہ رض کو معاف کر دیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ قیامت کے دن اس پر باز پُرس نہ ہو گی۔

حضرت عثمان غنی رض کے سامنے دو انتہائی رائیں آئی تھیں، ایک یہ کہ عبیداللہ بن عمر رض کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کی جائے، اور انھیں قتل ناحق کا ملزم گردان کر قتل کے پس منظر کا لحاظ کئے بغیر قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے، دوسری یہ کہ حضرت عمر رض کے قتل سے ہرمزان کے قتل تک کی تمام کڑیوں پر نگاہ رکھ کر عبیداللہ کے ساتھ معاملہ کیا جائے تو وہ ہر طرح رعایت اور معافی کے مستحق ٹھہرتے ہیں، لہٰذا ان کو معاف کر کے مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

حضرت عثمان غنی رض نے درمیانی فیصلہ یہ کیا کہ ہرمزان کے قتل کی

دیت منظور کرلی اور یہ دیت خود اپنی جیب سے ادا کردی۔

اب رہا یہ اعتراض کہ حضرت عثمان غنی رضؓ نے اس سلسلہ میں اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کی تو یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ قاتل سے قصاص یا دیت (خوں بہا) دونوں ہی لیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ حضرت فاروق اعظم رضؓ کے دور خلافت میں بھی اسی طرح کا ایک مقدمہ پیش ہوا تھا، اور آپ نے قاتل سے، دیت میں ایک غلام یا اس کی قیمت دلوائی تھی۔ [1]

یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمانؓ کے اس فیصلہ کو تمام صحابۂ کرامؓ نے سراہا۔ حتیٰ کہ ہرمزان کے لڑکوں نے بھی اس فیصلہ کو بطیب خاطر مانا۔ اور کوئی اختلاف نہیں کیا۔ [2]

تعجب ہے کہ سبائیوں کو ہرمزان سے خود اس کے ورثاء حتیٰ کہ بیٹوں سے بھی زیادہ محبت ہوگئی اور حضرت عثمان غنی رضؓ کے اس منصفانہ فیصلہ کو چیلنج کرنے کی صلاحیت صحابۂ کرامؓ سے زیادہ طبری کا مطالعہ کرکے مورخ و نقاد بننے کے دعویداروں میں پیدا ہوگئی ہے۔

آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے!

دیگر اعتراضات

یوں عدد اور گنتی میں حضرت عثمان غنیؓ پر اس سے زیادہ اعتراضات کئے گئے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہی وہ چار اعتراض تھے جن کے جوابات معلوم ہونے کے بعد الگ الگ عنوانوں سے کئے گئے دیگر اعتراضات کی

---

[1] کنز العمال ج ۷ صفحہ ۳۰۴ [2] تاریخ الامت ج ۲ صفحہ ۱۰۵۔

حقیقت بھی بآسانی سمجھ میں آجائے گی، مثلاً بنیادی حیثیت سے حضرت عثمانؓ پر سب سے سنگین اور دوررس اعتراض "اقربا پروری" کا کیا جاتا ہے، اور پھر اسی اعتراض کو بنوامیہ کو بڑے بڑے عہدے دینا۔ بنوامیہ کے نوجوانوں کو دیگر اصحاب فضل پر قرابت کیوجہ سے ترجیح دینا۔ بنوامیہ کے نااہل اور غیر موزوں افراد کو کلیدی مناصب عطا کرنا۔ اپنے خاندان کے کھلنڈرے اور بے فکر نوجوانوں کو عہدرسالت اور عہد شیخینؓ کے آزمودہ کار اور پختہ عمر لوگوں پر ترجیح دینا، اپنے خاندان کے فاسقوں کے جرائم کی پردہ پوشی کرنا۔ سرکاری خزانے (بیت المال) میں بیجا تصرف کرنا۔ اپنی قرابت داری کی وجہ سے کسی خدمت کے بغیر نااہل افراد کو مسلمانوں کی جاگیریں عطا کرنا۔ شکایت کے باوجود اپنے خاندانی افراد کو عہدیداروں کی حیثیت سے عوام کی گردنوں پر مسلط کئے رہنا۔ کسی جرم و خطا کے بغیر پرانے عہدیداروں کو صرف اس لئے معزول کرنا کہ ان کی جگہ اپنے اقربا کا تقرر کرسکیں وغیرہ جیسے متعدد عنوانوں سے پیش کرکے ان ہی واقعات سے استدلال کیا گیا ہے، جن کا ذکر پچھلے صفحات میں ہوچکا۔

ہم نے اعتراضات کے عنوانات کا لحاظ کئے بغیر پہلے تین اعتراضات کے جوابات میں ان "سبائی بنیادوں" کی حقیقت "تاریخی صداقتوں" کے ذریعہ بیان کردی ہے۔ ناظرین غور کریں گے تو ان کو الگ الگ عنوانوں سے کئے جانے والے تمام اعتراضات کے جوابات ان ہی تین اعتراضات اور ان کے جوابات میں مل جائیں گے۔

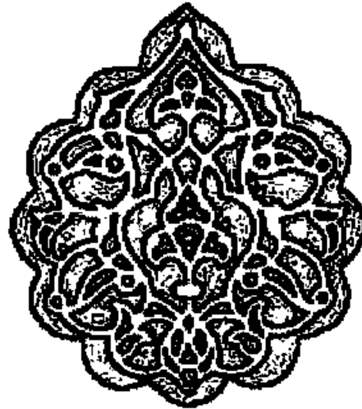
البتہ چوتھے اعتراض کا تعلق "اقربا پروری" کے زمرہ سے نہیں ہے بلکہ اسے حضرت عثمان غنیؓ کی ایک نااہلی اور ناانصافی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس اعتراض کی حقیقت بھی آپ کے سامنے آگئی۔

اس کے علاوہ کچھ اعتراضات وہ ہیں جن سے "سبائی عداوت" اس قدر عیاں ہے کہ صرف تحقیق کے نام پر آسانی کے ساتھ "ہمارے محققین" ان کو ذکر کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے، ہاں "سبائی ترجمان" ان کو بھی زبان وقلم پر لا سکتے ہیں اور لاتے ہیں مثلاً یہ اعتراض کہ حضرت عثمان غنیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخینؓ کے طریقہ کے خلاف منیٰ میں قصر کرنے کے بجائے چار رکعت نماز ادا کی ہے۔

اس اعتراض کا ایک جواب تو وہ ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے دیا ہے کہ ظاہر ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ مجتہد فی الفقہ تھے اور امام شافعیؒ کی طرح وہ بھی سفر کی نمازوں میں قصر کو "رخصت" و رعایت قرار دیتے تھے اور عزیمت "اسی میں سمجھتے تھے کہ قصر کے بجائے اتمام یعنی پوری نماز پڑھی جائے ——— اور ایک مجتہد اگر ایک اجتہادی مسئلہ میں اپنی رائے کے مطابق عمل کرے تو اسے ہرگز "مجرم" نہیں کہا جا سکتا لیکن دوسرا اہم اور واضح وغیر نزاعی جواب وہ ہے جو اپنے اس عمل کے سلسلہ میں حضرت عثمان غنیؓ نے خود دیا تھا کہ "قصر مسافر کے لئے ہے مقیم کے لئے نہیں، اور میں نے مکہ میں قیام کا ارادہ کر لیا ہے اس لئے میں (شرعی) مسافر نہیں ہوں" اس واضح جواب کے بعد بھی حضرت عثمان غنیؓ کے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھنے اور قصر کے بجائے اتمام کرنے کو سنت رسول اور سنت شیخین کے خلاف "بدعت عثمانؓ" قرار دینے والا کوئی کھلا ہوا دشمن دین تو ہو سکتا ہے سچا مسلمان نہیں،

یہ ہے حضرت عثمان غنیؓ پر کئے جانیوالے اعتراضات کی حقیقت، جنکو ابھارنے والے تو سبائی تھے لیکن بلا تحقیق و تفتیش نقل در نقل کے ذریعہ ہم تک پہونچانے والے ہمارے وہ غیر ذمہ دار "مؤرخین و محققین" ہیں جنکو اصحاب

رسولؐ کی عظمت کو داغدار کرتے ہوئے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ وہ مقدس جماعت ہے جس کو پروردگار عالم اور علام الغیوب کی طرف سے رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا دائمی پروانۂ خوشنودی و رضا مل چکا ہے۔



حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

تاریخ کی مظلوم شخصیتوں میں ایک اہم ترین نام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی و داماد اور آپ کے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کا بھی ہے جن کی مثالی اور پاکباز شخصیت پر "دوہرے" پردے ڈال کر ایسے متضاد انداز میں پیش کیا گیا کہ آج ایک مسلمان کے لئے ان کی شخصیت و کردار سے افراط و تفریط کے بغیر بالکل صحیح صحیح واقفیت حاصل کرنا مشکل ترین کام ہو گیا ہے۔

ایک طرف اسلام کے نام پر برپا ہونے والے "ایک فرقہ" نے نہ صرف یہ کہ حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کو "امام معصوم و مفترض الطاعۃ" قرار دیا، بلکہ ان کے مقامِ امامت کو مقامِ نبوت سے بھی بلند تر قرار دیکر گویا حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کو اس نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل قرار دینے کی سعی لاحاصل کی، جس کے ساتھ نسبت ہونا ہی ان کا سب سے بڑا نشان افتخار ہے۔ اور جن کی جوتیوں سے وابستگی ہی ان کا ذریعۂ نجات ہے۔ تو دوسری طرف اسلام ہی کے نام سے اپنا تعارف کرانے والے ایک "دوسرے گروہ" نے حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے سلسلہ میں ایسا سنگدلانہ اور غارت گر ایمان موقف اپنایا کہ وہ حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کو اس دین

اسلام ہی سے منحرف گرداننے لگا، جس کی گود میں پل کر وہ جوان ہوئے تھے اور شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد سے زندگی کی آخری سانس تک جس دین کی حمایت ونصرت اُن کی زندگی کا نصبُ العین رہا تھا۔

حضرت علی مرتضےٰؓ نے اپنی ذات کے سلسلہ میں ان ,,دو متضاد فکروں،، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں ان ,,دو متضاد فتنوں،، کو سر اٹھاتے دیکھکر واضح طور پر فرمادیا تھا کہ

,,میری ذات کے سلسلہ میں افراط وتفریط کرنے کی وجہ سے دوگروہ ہلاکت میں پڑیں گے، ایک میری تعریف میں غلو کرنے والا، جو میری ایسی تعریفیں کریگا جو مجھ میں نہیں ہیں۔ دوسرا مجھ سے بغض رکھنے والا جو دشمنی کی وجہ سے میرے اوپر بہتان باندھنے کی طرف مائل ہو جائیگا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ میں نہ تو پیغمبر ہوں، نہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ میں تو بس حتی الوسع کتابُ اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی خاطر میں تم کو جو حکم دوں اس کی تعمیل تم پر واجب ہے چاہے تم کو وہ پسند ہو یا ناپسند،، [1]

لیکن یہ تو وہ دوگروہ ہیں جن کی ہلاکت وبربادی کے سلسلہ میں خود حضرت علی مرتضیٰؓ نے واضح طور پر اشارہ کردیا تھا، اور ملت اسلامیہ میں ان دونوں گروہوں نے اپنی الگ شناخت قائم کر کے عملی طور پر بھی اور اعتقادی طور پر اپنا ایک علیحدہ گروہ ,,ہونا تسلیم کرلیا ہے۔ اور عام مسلمانوں کے علم میں بھی ان کی صحابۂ کرامؓ کے ساتھ عداوت اتنی واضح ہو چکی ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی ,,گروہ،، اپنی اصل

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۳۵۶

حقیقت بتا کر اپنے "معروف نام" کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے کسی صحابیؓ کے سلسلہ میں کوئی بات کہے تو مسلمان آسانی کے ساتھ اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتے۔

اسی لئے ہم یہ بات پہلے ہی واضح کرچکے ہیں کہ جن لوگوں کی عداوت صحابہؓ ظاہر ہے ان کے عقائد یا ان کے بیانات کے سلسلہ میں گفتگو کرنا ہمارا مقصود نہیں ہے۔ ہم تو ان "ماہرین فن" کے کارناموں کی حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اسلام اور اسلامی شخصیات سے بھرپور عقیدت مندی کے اعلان کے ساتھ ان "آلودگیوں" کو جمع کرکے بڑے سلیقہ کے ساتھ "تاریخ" کے نام سے پیش کرنے کا "کارنامہ" انجام دیا ہے۔ جن سے اسلام کا تقدس پامال اور اسلامی شخصیات کا وقار مجروح ہوا ہے۔

اصل حقیقت

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے فضائل یا نقائص کے سلسلہ کی جعلی اور غیر معتبر روایات اور اُن پر تبصرہ سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ مختصر طور پر حضرت علی مرتضیٰؓ کی شخصیت کی اصل حقیقت پر روشنی ڈال دیں تاکہ ان کے سلسلہ میں "دونوں قسم کی" مبالغہ آمیز یا مکذوبہ روایات کو سمجھنا آسان ہوجائے۔

حضرت علیؓ اُن خداترس اور السابقون الاولون مسلمانوں میں سے تھے جن کے بارے میں یہ تصور کرنا بھی گناہ ہے کہ وہ ایسی روش اپنا سکتے تھے جو اس دین میں اختلاف و انتشار کا ذریعہ بن سکے۔ جس کو خود انھوں نے اور ان کے مخلص ساتھیوں نے انتہائی محنت و جانفشانی کے ساتھ پروان چڑھایا تھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ پر یہ ایک بہتان ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

سے کے بعد اپنے ہی کو خلافت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے اور اس حق کو وہ اس وقت تک جتاتے رہے جب تک ان کو خلافت حاصل نہ ہو گئی، حقیقت تو یہ ہے کہ حضرات شیخین یعنی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مقابلہ میں فضیلت کیا معنی ان کی ہمسری کا بھی کبھی حضرت علیؓ نے دعویٰ نہیں کیا، بلکہ اس کے برخلاف ان کا یہ ارشاد گرامی احادیث کی کتابوں میں اسّی سندوں سے منقول ہے کہ

خیر الامۃ بعد نبیھا ابوبکر ثم عمر — پوری امت میں سب سے بہتر ابوبکرؓ ہیں پھر ان کے بعد عمرؓ۔

اسی طرح انھوں نے اپنے دور خلافت میں یہ گشتی فرمان لکھ کر شائع کرایا کہ

"جو شخص مجھے ابوبکرؓ و عمرؓ سے افضل کہے گا اس کو میں وہ سزا دونگا جو مفتری کو دی جاتی ہے، یعنی اسّی کوڑے کی مار دوں گا۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں حضرت علیؓ نے ایک مخلص اور سچے مسلمان کی طرح ہر محاذ پر اسلام کی خدمت کر کے اس کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم کیا۔ غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد، غزوۂ خیبر و دیگر غزوات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے پھر حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے دست مبارک پر بیعت کر کے اپنی غیر مشروط وفاداری کا عہد کیا اور اسے ہر طرح پورا کر کے دکھایا۔ اسی طرح خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے دست حق پرست پر بیعت کر کے ان کا اعتماد خاص حاصل کیا اور ان کے وزیر بن کر امن و جنگ ہر حالت میں نہ صرف ان کو مخلصانہ مشورے دیئے بلکہ ان کی "مجلس مشاورت" کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے ہر معاملہ میں ان کے شریک کار رہے، حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد ان کے جنازہ کو مخاطب کر کے ان بلند کلمات میں اپنی گہری عقیدت کا اظہار فرمایا۔

"اے ابو حفص آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں، خدا کی قسم رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جس کے اعمال پر مجھے رشک آتا اور ایسے اعمال نامہ کے ساتھ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کو پسند کرتا۔ ؎۱

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے بعد خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے ساتھ بھی حضرت علیؓ نے اپنے مخلصانہ تعاون کا سلسلہ جاری رکھا، اور جب حضرت عثمانؓ کا باغیوں نے محاصرہ کیا تو حضرت علیؓ نے اپنے کو جوکھم میں ڈال کر اور باغیوں کی ناراضگی مول لے کر حضرت عثمانؓ کی حتی المقدور مدد کی، ان کے دروازہ پر پہرہ دار کی حیثیت سے اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی ڈیوٹیاں لگائیں، اور جب ان پر پانی بند کر دیا گیا تو حضرت علیؓ خود اپنی سواری پر گئے، اور بڑی مشکلوں سے ایک مشکیزہ پانی لیکر حضرت عثمان غنیؓ تک پہونچایا حالانکہ اس عمل کیوجہ سے باغیوں نے ان کو بہت سخت سست کہا اور ان کی سواری کا جانور بھی بھگا دیا۔ ؎۲

پھر خود اپنے دور خلافت میں حضرت علیؓ نے اپنے سے پہلے کے تینوں خلفاؓ کی روش پر چلنے ہی کو اپنایا، یہ الگ بات ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد حالات نے جو کروٹ لی اور بدامنی و انتشار کا جو دور دورہ ہوا، اس نے حضرت علیؓ کو سکون کے ساتھ کام کرنے کا موقع ہی نہ دیا، اور ان کے پورے دور خلافت میں کفار سے جہاد موقوف رہا، اور اسلامی فتوحات میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا، جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان کے نام سے تین جنگوں کا آپ کو سامنا کرنا پڑا، ان میں سے اول الذکر دونوں ایسی تھیں کہ جن کے بارے میں یقینی

؎۱ مسند احمد ؎۲ البدایہ والنہایہ ج ۷، ص۱۸۱۔

طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فریقین میں سے کوئی بھی جنگ کا خواہش مند نہ تھا مگر منافقوں، فتنہ پردازوں اور اسلام کے باغیوں کی شاطرانہ چالوں کی وجہ سے یہ جنگیں ہوگئیں، جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے مقابل ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ تھیں، اور جنگ صفین میں کاتب وحی حضرت معاویہؓ تھے، ان دونوں ہی جنگوں کو عام صحابہ کرامؓ نے بڑی ناگواری، تکلیف اور دکھ کے ساتھ برداشت کیا، حتیٰ کہ محتاط صحابہؓ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان جنگوں سے کنارہ کش رہے اور فریقین میں سے کسی کے ساتھ شریک ہو کر جنگ کرنا پسند نہیں کیا، خود فریقین بھی ایک دوسرے کے ایمان واخلاص کے منکر نہ تھے بلکہ کھلے دل سے معترف تھے۔ البتہ جنگ نہروان جو خارجیوں سے ہوئی تھی، اسے باتفاق رائے تمام ہی صحابہؓ نے پسند کیا، اور حضرت علیؓ کے موقف کی تائید کی۔

یہ تھی حضرت علیؓ کے اصلی کردار کی ایک ہلکی سی جھلک، جس سے بخوبی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کھیل جو حضرت علیؓ کا نام لے کر کھیلا گیا، اور کھیلا جا رہا ہے، اس کا خود حضرت علیؓ کی ذات گرامی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ پچھلے صفحات میں گذر چکا کہ انھوں نے تو اپنے نام پر کھیلے جانے والے اس "دوہرے کھیل" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود ہی آگاہ کر دیا تھا کہ میرے سلسلہ میں راہ اعتدال چھوڑ کر افراط و تفریط اپنانے والے ہلاکت میں پڑیں گے۔

اور بس یہی ہے حضرت علیؓ کی مظلومیت، کہ بے قید عقیدت اور بے خوف عداوت کے جذبوں نے ان کے سلسلہ میں ایسی ایسی داستانیں وضع کر کے "یقینی واقعات" کی حیثیت سے پیش کر دیں، کہ حضرت علیؓ کے اصل مقام کی معرفت بھی ایک دشوار مسئلہ بن گیا۔

ایک توجہ طلب امر:- خوارج جنھوں نے حضرت علیؓ سے جنگ صفین

کے موقع پر "تحکیم" کے معاملہ میں اختلاف کیا تھا، اور پھر یہ اختلاف اس درجہ بڑھا کہ بالآخر ۳۷ھ یا ۳۸ھ میں[1] حضرت علیؓ کو خارجیوں سے باقاعدہ جنگ کرنا پڑی، جو جنگ نہروان کے نام سے موسوم ہوئی۔ خارجی اپنے ظاہری اعمال اور پابندیٔ شریعت کے لحاظ سے بہت ہی سچے اور مخلص مسلمان معلوم ہوتے تھے، انھوں نے حضرت علیؓ سے مخالفت بلکہ ان کے خلاف بغاوت و جنگ کے لئے بنیاد بھی اس چیز کو قرار دیا تھا کہ حضرت علیؓ نے "اللہ کے حکم" کے بجائے جنگ صفین میں "انسانوں کے حکم" کو اختیار کیا۔ اور اس عمل کو وہ لوگ اللہ اور اس کے دین کے منافی قرار دیتے ہوئے حضرت علیؓ کو (نعوذ باللہ) خارج از اسلام گردانتے لگے تھے۔

اس موقع پر اپنے موقف کی حمایت و تائید میں انھوں نے کیا کچھ گل افشانیاں کی ہوں گی اور کس کس طرح حضرت علیؓ کو مطعون کر کے اپنے موقف کا برسرِ حق ہونا بیان کیا ہو گا، قارئین بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

عام صحابۂ کرامؓ اور مخلص مسلمانوں نے خارجیوں کو سمجھانے اور عام مسلمانوں کو ان کے مکر و کید سے بچانے کی خاطر اس موقع پر حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قرابت قریبہ کا چرچا کیا۔

عبداللہ بن سبا منافق اور اس کا گروہ (جو حضرت عثمانؓ غنی کے دور خلافت ہی سے "محبت اہل بیت" کا حسین غلاف ڈال کر اور حضرت علیؓ کی امامت کی فرضیت اور "خلافت بلافصل" کا اعلان کر کے اسلام اور اس کے حقیقی نظام کو تاراج

---

[1] جنگ نہروان کے سنہ کے سلسلہ میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے، مشہور قول ۳۸ھ کا ہے جو طبری اور دوسری کتابوں میں مذکور ہے لیکن البدایۃ والنہایۃ میں ۳۷ھ ذکر کیا گیا ہے

کرنے کی پیہم کوششیں کر رہا تھا) بھلا اس "موقع فرصت" کو کیسے ہاتھ سے جانے دیتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ان "سبائیوں" نے بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر "فضائلِ علیؓ" کی ایسی ایسی روایات وضع کیں کہ علی مرتضیٰؓ کو نہ صرف جماعت صحابہؓ میں سب سے افضل بنا ڈالا، بلکہ جماعت انبیاء اور خود سیّد الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی حضرت علیؓ کو افضل قرار دیدیا۔

خارجیوں نے تو کھلے عام حضرت علیؓ سے اپنی دشمنی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے سلسلہ میں انتہائی بے رحمانہ اور سنگدلانہ انداز اختیار کیا۔ اور ان عیوب سے ان کو متصف کیا جن سے حضرت علیؓ کا دامن پاک تھا ـــــ لیکن سبائیوں" نے بظاہر عقیدت و محبت کا راستہ اپنایا، اور اس راستہ سے حضرت علیؓ کی شخصیت کو داغدار کیا۔ اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے حضرت علیؓ کی شخصیت اور دین اسلام کو خارجیوں سے کہیں زیادہ سبائیوں سے نقصان پہونچا اور آجتک پہونچ رہا ہے۔

"سبائی تحریک" اور اس سے پہونچنے والے نقصانات اس جگہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہے لیکن اس بات کی وضاحت بہرحال ضروری ہے کہ "سبائیت" کا زیر زمین فتنہ اتنا منظم اور اتنا طاقتور تھا کہ ہماری تاریخ اور ذخیرۂ حدیث کوئی چیز بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی، ذیل میں ایسی ہی کارروائیوں کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ گروہ کتنا سخت جان تھا کہ باوجود حضرت علیؓ کی بھرپور "احتیاطی تدابیر" کے بھی اس نے ان کی شخصیت کو اس خوبصورتی کے ساتھ مجروح کر دیا کہ آج اچھے اچھے ذی علم لوگ "سبائی مکذوبات" کو فضائل علیؓ کے نام سے بے دھڑک بیان کر دیتے ہیں، اسی لئے امام محمد بن سیرینؒ نے فرمایا کہ "حضرت علیؓ پر جتنا جھوٹ بولا گیا دوسرے کسی فرد پر نہیں بولا گیا" ـــــ اور

بس یہی ہے حضرت علیؓ کی مظلومیت۔

حضرت علیؓ کی مواخاۃ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ، حق تعالیٰ کے حکم سے جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے گئے اس وقت ان مہاجرین کی بے سروسامانی کا عالم یہ تھا کہ نہ ان کے پاس سر چھپانے کی اپنی کوئی جگہ تھی نہ ہی پیٹ بھرنے کے لئے ایک دانہ۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبردست حکمت عملی کے ذریعہ اپنے ان خانماں برباد ساتھیوں کو مدینہ میں جس عزت و وقار کے ساتھ بسایا، اس کی دوسری مثال پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے، آپ نے مہاجرین (مکہ سے مدینہ آنیوالے اصحابؓ) اور انصار (مدینہ کے باشندے اصحابؓ) کے درمیان اس طرح مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کیا کہ ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کے حوالہ کر کے دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا، تاکہ جب تک مہاجرین، مدینہ کے حالات کو سمجھ کر اپنے قدموں پر نہ کھڑے ہو جائیں اس وقت تک ان کے قیام و طعام کا کوئی مسئلہ نہ ہو۔

اس مواخات کے کیا اثرات رونما ہوئے؟ اور مہاجرین و انصار صحابہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم فرمودہ اس بھائی چارے کی کس کس طرح لاج رکھی؟ یہ ایک مستقل اور تفصیل طلب موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے لیکن ہمیں اس جگہ صرف اتنی بات سے بحث ہے کہ حضرت علیؓ کا بھائی چارہ کس سے ہوا تھا؟ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ذہن میں رہنے کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مواخات (بھائی چارہ) اس اہم ہنگامی ضرورت کے تحت مہاجرین اور انصار صحابہؓ کے درمیان کرایا تھا کہ مکہ سے اللہ

کے حکم پر اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کر کے آنے والے بے سروسامان صحابہؓ کی کفالت کا انتظام بھی ہو جائے اور اتنی بڑی تعداد میں مہاجرین کے آنے سے انصار پر ناقابل برداشت بوجھ بھی نہ پڑنے پائے، اسی لئے ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بنایا تھا ـــــ اور پھر بھائی چارہ کی اس بنیادی ضرورت کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو حافظ ابن کثیر کا یہ بیان کس قدر واضح، صحیح اور قرین قیاس نظر آتا ہے۔

ھاجر علیؓ بعد خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ وکان قد امرہ بقضاء دیونہ ورد ودائعہ ثم یلحق بہ فامتثل ما امر بہ ثم ھاجرہ اخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بینہ وبین سھل بن حنیفؓ[1]	حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے ہجرت فرمانے کے بعد ہجرت کی، اس لئے کہ حضورؐ نے ان کو اپنے قرضوں کی ادائگی اور امانتوں کی واپسی کے بعد اپنے پاس آنے کا حکم دیا تھا چنانچہ حکم کی تعمیل کے بعد انھوں نے ہجرت کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور سہل بن حنیف کے درمیان بھائی چارہ کرایا۔

اب اس صاف اور واضح بیان کے بعد اس روایت پر بھی غور کیجئے کہ:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اصحابؓ کا بھائی چارہ کرایا تو حضرت علیؓ روتے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ آپ نے ہمارے دوسرے ساتھیوں کا تو بھائی چارہ کرا دیا لیکن میرا کسی سے نہیں کرایا، حضورؐ نے فرمایا کہ تم تو دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو"[2]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۷، ص ۲۲۵ [2] ترمذی شریف ج ۲ ص ۲۱۳

اس روایت سے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ہجرت کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اصحابؓ مہاجرین کا بھائی چارہ تو اصحابؓ انصار کیساتھ کرادیا، لیکن حضرت علیؓ کا بھائی چارہ کسی انصاری سے نہ کرا کے ان کو خود اپنا بھائی بنایا ـــــــ اور یہ ہے حضرت علیؓ کی ایک بہت بڑی فضیلت،

علامہ طاہر پٹنی حضرت علیؓ کے بھائی چارہ کی سلسلہ کی تمام روایات کے بارہ میں تذکرۃ الموضوعات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ روایت کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے بھائی چارہ کیا، اور ان کے بھائی چارہ کی جملہ روایات، نیز ترمذی کی روایت سب ضعیف ہیں"[1]

اسی طرح علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب منہاج السنۃ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ان احادیث المواخاۃ لعلی کلھا موضوعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یواخ احدًا ولا آخی بین مھاجری ومھاجری ولا بین ابی بکر وعمر ولا بین انصاری وانصاری ولکن آخی بین المھاجرین والانصار فی اول قدومہ المدینۃ	حضرت علیؓ کے بھائی چارہ کے سلسلہ کی تمام روایات موضوع ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ خود اپنا کسی سے بھائی چارہ قائم کیا اور نہ ایک مہاجر اور دوسرے مہاجر کے درمیان، اور نہ ابوبکرؓ وعمرؓ کے درمیان، اور نہ ایک انصاری اور دوسرے انصاری کے درمیان، لیکن حضورؐ نے تو مدینہ تشریف لاتے ہی مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ کرایا تھا۔
منہاج السنۃ جلد ۴ صـ ۹۶	

---

[1] تذکرۃ الموضوعات صـ ۹۶

محدثین کرام نے روایت و درایت دونوں کسوٹیوں پر پرکھنے کے بعد ترمذی کی اس روایت کے ضعیف بلکہ موضوع ہونے کا فیصلہ کیا ہے، چنانچہ ترمذی کی سند میں حکیم بن جبیر[۱]، علی بن قادم[۲]، اور جمیع بن عمیر تیمی[۳] یہ تین راوی ساقط الاعتبار اور ناقابل اعتماد ہیں۔ اس جگہ ہم ان تینوں راویوں کے سلسلہ میں علماء جرح و تعدیل کی آراء کو "میزان الاعتدال" کے حوالہ سے مختصر طور پر علٰحدہ علٰحدہ نقل کئے دیتے ہیں۔

۱۔ حکیم بن جبیر :۔ احمد کہتے ہیں کہ حکیم بن جبیر ضعیف ہے، منکر الحدیث ہے نسائی کہتے ہیں قوی نہیں۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ متروک الحدیث ہے، معاذ کا بیان ہے کہ میں نے شعبہ سے کہا کہ آپ ہم سے حکیم بن جبیر کی احادیث بیان کیجئے تو انھوں نے کہا کہ اس کی احادیث بیان کرنے سے مجھے جہنم میں جانے کا خوف ہے۔ جوزجانی کہتے ہیں کہ حکیم بن جبیر کذاب ہے۔[۱]

۲۔ علی بن قادم :۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، ابن سعد کہتے ہیں کہ غالی شیعہ تھا، منکر الحدیث ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی بہت سی روایات منکر ہیں۔[۲]

۳۔ جمیع بن عمیر التیمی :۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ یہ کٹر رافضی ہے، اپنے دل سے روایتیں وضع کرتا تھا، ابن نمیر کہتے ہیں کہ سب سے بڑے جھوٹوں میں اس کی بھی گنتی ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی عام روایتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں بس یہی بیان کرتا ہے کوئی دوسرا نقل نہیں کرتا۔[۳]

قارئین خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس روایت کی سند میں ایک دو نہیں بلکہ تین تین ایسے رسوائے زمانہ فنکار موجود ہوں اس کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

---

[۱] میزان ج ۱ ص ۲۷۳ [۲] میزان ج ۲ ص ۲۲۵ [۳] میزان ج ۱ ص ۱۹۵۔

پھر درایتہً بھی غور کیا جائے تو اس کہانی کا مہمل ہونا بالکل واضح ہے کیونکہ مواخاۃ یعنی بھائی چارہ کا عمل تو ایک خاص ضرورت کے تحت تھا۔ اور مہاجرین وانصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کرکے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسی زبردست حکمت عملی اور بے نظیر مدبرانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا اس کی دنیا آج تک معترف ہے، اور مصلحت وقت کا تقاضا بھی یہی تھا، اور احادیث معتبرہ سے اسی کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہ بھائی چارہ مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوا تھا نہ کہ مہاجرین و مہاجرین یا انصار وانصار کے درمیان ـــــ پھر بھلا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے درمیان بھائی چارہ قائم ہونے سے کیا فائدہ؟ جبکہ یہ دونوں حضرات مہاجر تھے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے ساتھ اپنا بھائی چارہ قائم فرما کر ان کو اعزاز بخشا، اور اس بھائی چارے کا مقصد حضرت علیؓ کے اس "قرب خاص" کا اظہار تھا جو ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاصل تھا ـــــ تو اس کا واضح اور بدیہی جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ تو حضور علیہ السلام کے خونی رشتے سے ہی بھائی تھے۔ اور یہ بات بالکل عیاں اور سب کو معلوم تھی، پھر بھلا ان کو "منہ بولا بھائی" بنانے کی کیا ضرورت تھی، اور اس سے ان کا کیا اعزاز بڑھ گیا؟

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ یہ "ایک تیر سے دو شکار" کی سبائی سازش کا کرشمہ ہے کہ حضرت علیؓ کی اس "فضیلت" کے پردہ میں یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ مدینہ کے کسی انصاری مسلمان نے حضرت علیؓ سے بھائی چارہ قائم کرنا گوارہ نہ کیا جس کا ان کو اتنا ملال ہوا کہ وہ "روتے ہوئے" حضورؐ کے پاس آئے اور شکوہ کیا کہ میرا تو آپ نے کسی سے بھائی چارہ کرایا ہی نہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ان کی اشک شوئی کی خاطر، فرمادیا کہ تم تو میرے بھائی ہو۔

حالانکہ حقیقت وہی ہے جس کا ذکر حافظ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے ابتداء میں کیا گیا کہ دوسرے مہاجرین کی طرح حضرت علیؓ کا بھائی چارہ بھی ایک انصاری صحابی حضرت سہل بن حنیفؓ سے حضور علیہ السلام نے کرایا تھا۔

حضرت علیؓ کی کعبہ میں ولادت

بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ کی ولادت کعبہ مکرمہ کے اندر ہوئی، اور سبائی اسے حضرت علیؓ کی ایک بہت بڑی فضیلت قرار دیتے ہوئے انھیں "مولود کعبہ" کی حیثیت سے اس طرح مشہور کرتے ہیں کہ گویا یہ حضرت علیؓ کی وہ فضیلت ہے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے، اس سلسلہ میں درج ذیل امور پر نگاہ رہنا ضروری ہے۔

ا۔ حضرت علیؓ کی کعبۂ مکرمہ کے اندر ولادت ہوئی یا نہیں ؟ اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔ چنانچہ مشہور و معتبر شیعی کتاب نہج البلاغۃ (جس کے بارے میں شیعوں کا دعوی ہے کہ یہ حضرت علیؓ کے خطبات و مکاتیب کا مجموعہ ہے) کے شارح ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ:۔

> "سیدنا علی علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے کہ کہاں ہوئی تھی۔ شیعوں کی بڑی جماعت کو یقین ہے کہ ان کی پیدائش اندرون کعبہ ہوئی۔ محدثین نے اسکو تسلیم نہیں کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ کعبہ میں جو صاحب پیدا ہوئے تھے وہ حکیم ابن حزام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی ہیں"۔ [۱]

---

[۱] المرتضیٰ صفحہ ۴۹ بحوالہ شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید۔

-: سبائیوں کے علاوہ یہ دعویٰ بہرحال کسی کا بھی نہیں ہے کہ کعبہ مکرمہ کے اندر پیدا ہونے والی شخصیت تنہا حضرت علیؓ کی ہے ، اس لئے کرام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حضرت حکیم بن حزامؓ کی کعبہ مکرمہ کے اندر ولادت اتنی معروف اور مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو اکلوتا "مولود کعبہ" باور کرانے کی جسارت صرف سبائی ہی کر سکتے ہیں کیونکہ ان کا تو مشن ہی یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے مبالغہ آمیز بلکہ خلاف حقیقت "فضائل" بیان کرکے دوسری اسلامی شخصیات کو مجروح اور اسلامی تاریخ کو غیر معتبر بنایا جائے۔ ہمارے لئے تعجب اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ تاریخ اسلامی پر گہری نظر رکھنے کے دعویدار بعض "خود ساختہ مؤرخین" "مولود کعبہ" کی حیثیت سے حضرت علیؓ کا نام تو کچھ اس انداز میں لیتے ہیں کہ جیسے یہ بالکل غیر نزاعی اور تسلیم شدہ حقیقت ہے لیکن حضرت حکیم بن حزام کا اس موقع پر ذکر بھی نہیں کرتے جبکہ ان کے "مولود کعبہ" ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے ، اور امام نووی نے اپنی شرح مسلم شریف میں ان کے بارے میں لکھا ہے

حکیم بن حزام الصحابی و	حکیم بن حزام صحابی ہیں۔ ان کے فضائل
من مناقبہ انہ ولد فی الکعبۃ	میں سے یہ بھی ہے کہ وہ کعبہ میں پیدا ہوئے
قال بعض العلماء ولا یعرف	بعض علماء نے کہا ہے کہ اس فضیلت
احد شارکہ فی ھذا قال	میں ان کا کوئی شریک نہیں[1]۔ علماء نے کہا
العلماء ومن طرف اخبارہ	کہ ان کے حالات میں ایک خاص بات یہ
انہ عاش ستین سنۃ فی	ہے کہ انھوں نے ساٹھ سال دور جاہلیت
الجاھلیۃ وستین فی الاسلام	میں زندگی پائی اور ساٹھ سال حالت[2] اسلام

---

[1] اس قول کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ "مولود کعبہ" تنہا حضرت حکیم بن حزام ہیں (بقیہ صــ پر)

واسلم عام الفتح ومات بالمدینة سنة اربع وخمسین فیکون المراد بالاسلام من حین ظهورہ وانتشارہ واللہ اعلم ۔ ؎	ہیں، اور فتح مکہ کے سال انھوں نے اسلام قبول کیا اور ۵۴ھ میں مدینہ میں وفات پائی، اور اسلام سے مراد اس کے ظہور و انتشار کا وقت ہے ۔

(حاشیہ ص ۶۲ کا) اور حضرت علیؓ یا دوسرا کوئی فرد مولود کعبہ نہیں ہے ۔

؎ مشہور قول یہی ہے کہ حضرت حکیم بن حزام کی کل عمر ایک سو بیس ۱۲۰ سال ہوئی، اس میں سے ۶۰ سال حالت کفر میں گذرے اور ساٹھ سال اسلام کی حالت میں ۔ مگر علامہ ابن اثیر جزری نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میں کہتا ہوں کہ یہ جو ان لوگوں نے کہا ہے کہ واقعۂ فیل سے پہلے پیدا ہوئے اور ۵۴ھ میں وفات پائی، اور ساٹھ برس زمانۂ جاہلیت میں زندہ رہے، اور ساٹھ برس زمانۂ اسلام میں زندہ رہے اس میں اعتراض ہے کیونکہ یہ فتح مکہ کے سال اسلام لائے تھے، لہٰذا ان کی عمر حالت شرک میں چوہتر برس گذری، تیرہ برس قبل واقعۂ فیل کے، اور چالیس برس بعثت تک بقیاس عمر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے، اور تیرہ برس مکہ میں ہجرت تک بربنائے قول صحیح، یہ کل چھیاسٹھ برس ہوئے، اور آٹھ برس فتح مکہ تک، یہ مجموعہ چوہتر برس ہوا ۔ اور زمانۂ اسلام میں ان کی عمر چھیالیس سال ہوئی ۔ اور اگر ہم ان کی عمر اسلام میں اس وقت سے رکھیں جب سے رسولؐ خدا مبعوث ہوئے تو بالکل صحیح نہیں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بعد بعثت کے تیرہ ۱۳ برس رہے، اور ہجرت سے حکیم کی وفات تک چوّن ۵۴ برس ہوتے ہیں، اس کا بھی مجموعہ سڑسٹھ ۶۷ برس ہوتا ہے اور ان کی عمر زمانۂ جاہلیت میں بعثت تک ترپن ۵۳ برس رہتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے تیرہ ۱۳ برس اور بعثت تک چالیس ۴۰ برس، شاید یہ صحیح ہو کہ ان کی پوری عمر ایک سو بیس ۱۲۰ برس ہو مگر یہ تفصیل درست نہیں (کہ ساٹھ برس ان کے زمانۂ جاہلیت میں گذرے اور ساٹھ برس اسلام میں) بہر حال میں (بقیہ ص ۶۴)

۳۔ کسی بھی شخص کا کعبہ مکرمہ میں پیدا ہونا ایک اتفاقی اور ناگہاں واقعہ تو ہو سکتا ہے جیسا کہ حکیم بن حزامؓ کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کی والدہ دوسری عورتوں کے ساتھ کعبہ میں گئی تھیں، ناگہاں ان کو وہیں دردِ زہ ہونے لگا، اور پھر وہیں حکیم کی ولادت ہوگئی، لیکن بچہ کی پیدائش کے لئے ماں کا خاص طور پر کعبہ میں جانا، دیوار کعبہ کا شق ہونا اور پھر کعبہ کے اندر بچہ کی ولادتؑ ہونا۔ نہ قابل یقین بات ہے نہ ہی کوئی پسندیدہ عمل، کیونکہ کعبہ کی حیثیت اول دن ہی سے عبادت گاہ کی رہی ہے، اور زمانۂ جاہلیت میں بھی اسے عبادت گاہ ہی سمجھا جاتا تھا، اور اسی لئے اس کے اندر بت رکھے گئے تھے جن کی پوجا ہوتی تھی، اور مشرکین مکہ عام طور پر وہیں جمع ہو کر اپنی پنچائتیں لگایا کرتے تھے، پھر ایک عبادتگاہ کو بالقصد و بالارادہ "زچہ خانہ" بنانے کی کیسے کوئی ہمت کریگا، اور لوگ بھلا اسے کیونکر گوارہ کر سکیں گے؟ اور ایک عوامی جگہ پر کسی عورت کا بچہ جننے کے لئے جانا نہ کوئی پسندیدہ فعل کہلا سکتا ہے نہ ہی کوئی معمولی سے معمولی عورت ایسی بے شرمی کا مظاہرہ کر سکتی ہے چہ جائیکہ مکہ کے معزز سردار عبدالمطلب کی بہو فاطمہ بنت اسد اتنی کھلی بے حیائی پر آمادہ ہوئی ہوں۔

۴۔ حکم الٰہی کے مطابق کعبہ کی فضیلت اپنی جگہ، اور اس کے اساس کی بنا مبارک سہی، لیکن یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں مشرکین مکہ نے اسے بت خانہ میں تبدیل کر کے اس میں تین سو ساٹھ بت سجا دیئے تھے، اور فتح مکہ

(بقیہ صـ کا) ان کی عمر میں اس قول کو صحیح نہیں سمجھتا، واللہ اعلم۔ (ترجمہ اسد الغابہ ج ۲ صـ ۵۱)

لـه شرح المسلم للنواوی ج ۱ ص ۷۷۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لـه حضرت علیؓ کی کعبہ میں ولادت کے سلسلہ میں یہ اور اس سے زائد تفصیلات شیعی کتاب "جلاء العیون" میں بیان کی گئی ہیں جن کا ذکر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ سے ان بتوں کو ہٹا کر اس آلائش سے پاک کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کی ولادت کے وقت کعبہ کے اندر یہ تمام بت موجود تھے، پھر سوال یہ ہے کہ خاص اس مقام پر جسے مشرکین نے اپنا "بت خانہ" بنا رکھا تھا حضرت علیؓ کا پیدا ہونا ان کے لئے وجہ فضیلت کیونکر ہو سکتا ہے؟ نیز یہ کہ حضرت علیؓ کی والدہ فاطمہ بنت اسدؓ ایسے وقت میں اس جگہ کیوں گئیں، جبکہ "سبائیوں" کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے قبل بلکہ حضرت علیؓ کی ولادت سے بھی قبل اللہ کی وحدانیت پر ایمان لا چکی تھیں، اور بت پرستی نہیں کرتی تھیں۔؟

۵۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر کرکے اگر حضرت علیؓ کا "مولود کعبہ" ہونا بھی تسلیم کر لیا جائے اور کعبہ میں ولادت کو ایک بڑی فضیلت بھی مان لیا جائے تو بھی یہ وہ فضیلت ہے جسے ان سے پہلے حضرت حکیم بن حزام حاصل کر چکے تھے، لہذا زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ بھی اس فضیلت میں حضرت حکیم بن حزامؓ کے شریک ہوئے۔

مندرجہ بالا امور پر غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت علیؓ کے "مولود کعبہ" ہونے کا حال بیان کرنے والے کس ذہنیت کے مالک تھے اور "فضیلت علیؓ" کی اس آڑ میں انھوں نے کیا کیا کارروائیاں کی ہیں؟ جبکہ ہم نے ولادت کی ان سبائی تفصیلات کو جنکو ہمارے مؤرخین عام طور پر قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور جن سے یہ بات صاف طور پر سامنے آجاتی ہے کہ یہ ایک میٹھا زہر ہے جس کے ذریعہ اسلامی شخصیات کو مجروح کرنا ہی مقصود ہے ذکر نہیں کیا۔

حضرت علیؓ کی زرہ کا معاملہ:۔ حضرت علیؓ کے عدل وانصاف کے باب

میں یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ان کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ ان کی زرہ ایک یہودی کے پاس پہونچ گئی حضرت علیؓ نے اسے پہچان کر یہودی سے مانگا، مگر اس نے دینے سے انکار کیا، بالآخر مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں پہنچا، لیکن چونکہ حضرت علیؓ اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے اسلامی قانون کے مطابق گواہ نہیں پیش کر سکے، اس لئے قاضی نے حضرت علیؓ کا دعویٰ خارج کر کے مقدمہ یہودی کے حق میں فیصل کر دیا۔ اور حضرت علیؓ نے باوجود حاکمِ وقت ہونے اور اس بات کا یقین ہونے کے کہ زرہ ان ہی کی ہے قاضی کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ یہودی اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔

امام ذہبیؒ نے حکیم بن حزام راوی کے تذکرہ کے ذیل میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ ہم اس روایت کو ذیل میں درج کرنے کے بعد اس کے سلسلہ میں درایۃً وروایۃً کچھ گذارشات پیش کریں گے۔ پہلے روایت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

ابو الاشعث العجلی حدثنا حکیم بن حزام حدثنا الاعمش عن ابراهیم التیمی قال عرف علی رضی اللہ عنہ درعا لہ مع یہودی فقال درعی سقطت یوم کذا فقال الیہودی درعی وفی یدی بینی وبینک قاضی المسلمین فلما رآہ شریح قام لہ عن مجلسہ	ابو الاشعث کہتے ہیں کہ ہم سے حکیم بن حزام نے بیان کیا، اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اعمش نے ابراہیم تیمی سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انھوں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زرہ کو ایک یہودی کے پاس دیکھکر پہچان لیا اور کہا کہ یہ میری زرہ ہے جو فلاں دن گر گئی تھی، تو یہودی نے کہا کہ یہ میری زرہ ہے اور میرے ہی قبضہ میں ہے میرے اور آپکے درمیان فیصلہ مسلمانوں کا قاضی کریگا، پھر جب (قاضی)

وجلس علی ثم قال لو
کان خصمی مسلما
جلست معه ولکنی سمعت
رسول الله صلی علیه
وسلم یقول لا تساووهم
فی المجالس ولا تعودوا
مرضاهم واضطروهم
الی اضیق الطریق فان
سبوکم فاضربوهم
فان ضربوکم فاقتلوهم
ثم قال درعی قال
صدقت یا امیر المومنین
ولکن بینة فدعی قنبرا
والحسن فشهد له فقال
اما مولاک فنعم واما
شهادة ابنك فلا فقال
انشدك الله أسمعت
عمر یقول قال رسول
الله صلی الله علیه وسلم
الحسن والحسین سیدا
شباب اهل الجنة

شریح نے حضرت علی کو دیکھا تو ان کے
استقبال کے لئے اپنی جگہ سے کھڑے ہو
گئے اور اس جگہ حضرت علیؓ بیٹھ گئے پھر انہوں
نے کہا کہ اگر میرا حریف مسلمان ہوتا تو میں اسی کے
ساتھ بیٹھتا لیکن میں نے رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ان
لوگوں کو (غیر مسلموں کو) مجلسوں میں اپنے برابر
بٹھاؤ، اور نہ ہی ان کے مریضوں کی عیادت
کرو، اور انکو سب سے تنگ راستہ پر چلنے کیلئے مجبور
کرو، پھر اگر یہ تمہیں برا بھلا کہیں تو انکو مارو، اور
اگر یہ تمہیں ماریں تو تم انکو قتل کرو، پھر کہا کہ یہ
زرہ میری ہے، قاضی شریح نے کہا کہ امیر المومنین
آپ نے سچ کہا لیکن گواہ پیش کیجئے تو حضرت
علیؓ نے قنبر (اپنے غلام) اور حسنؓ (اپنے بیٹے) کو
بلایا، اور ان دونوں نے ان کے حق میں گواہی
دی، تو قاضی شریح نے کہا کہ آپکے غلام کی گواہی
(آپکے حق میں) تو ٹھیک ہے لیکن آپکے بیٹے
کی گواہی معتبر نہیں۔ تو حضرت علیؓ نے کہا
کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کہ
کیا تم نے حضرت عمرؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا
ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

قال اللهم نعم قال افلا
تجيز شهادة الحسن والله
ليأتين الى بالقضاء
فلنقضين بين اهلها
اربعين يوما ثم سلم
الدرع الى اليهودى فقال
اليهودى امير المومنين
مشى معى الى قاضيه
فقضى عليه فرضى به
صدقت انها الدرع
التقطها واسلم فقال
على الدرع لك وهذا
الفرس لك فرض له وقتل
بصفين

(ميزان الاعتدال)
(جلد ا ص ۲۷۵)

حسنؓ اور حسینؓ جوانان جنت کے سردار
ہیں؟ شریح نے کہا کہ اللہ کی قسم ہاں (سنا ہے)
حضرت علیؓ نے کہا کہ پھر کیا تم حسنؓ کی شہادت
کافی نہیں سمجھتے؟ خدا کی قسم یہ لوگ بھی ضرور
ہمارے پاس اپنا فیصلہ کرانے آئیں گے تو
ہم ان کے اہل کے درمیان چالیس دن
میں فیصلہ کریں گے، پھر انھوں نے زرہ
یہودی کے سپرد کر دی۔ تو یہودی نے کہا
کہ امیر المومنین میرے ساتھ اپنے قاضی کے
پاس چل کر آئے، پھر جب ان کے خلاف
فیصلہ ہو گیا تو اس سے راضی بھی ہو گئے۔
(اے امیر المومنین) آپ نے سچ کہا یہ زرہ آپ
ہی کی ہے جو میں نے پڑی پائی تھی، اور اس
نے اسلام قبول کر لیا۔ تو حضرت علیؓ نے کہا
کہ یہ زرہ بھی تم لے لو، اور یہ گھوڑا بھی لے لو
(علاوہ ازیں) اس کے لئے وظیفہ مقرر کیا
اور وہ (یہودی) جنگ صفین میں قتل کیا گیا

اس تفصیلی روایت کے سامنے آنے کے بعد سب سے پہلا اس کی سند پر غور کیجئے تو اس میں ایک نام حکیم بن حسن ام کا ہے جن کے بارے میں امام ذہبی نے اس روایت کو نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے۔

"ابو حاتم نے کہا کہ یہ متروک الحدیث ہے اور بخاریؒ نے کہا ہے کہ یہ

منکرالحدیث ہے، قدری ہے، اور قواریریؒ نے کہا کہ میں اس سے ملا ہوں اور یہ اللہ کا ایک نیک بندہ تھا۔“ ؎

حکیم بن حذام کی موجودگی کے علاوہ اس سند میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس کے آخری راوی ابراھیم تیمی ہیں جن کی ولادت ۳۶ھ اور وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی، اور ۳۶ھ میں ولادت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے اوپر بھی اس واقعہ کے کوئی عینی راوی ہیں۔ کیونکہ جنگ صفین صفر ۳۷ھ میں ہوئی، جس میں اس نو مسلم یہودی کا قتل ہونا بیان کیا گیا ہے جبکہ ابراہیم اس وقت چند ماہ کے رہے ہونگے اور ظاہر ہے کہ زرہ کی چوری کا واقعہ اس سے بھی پہلے کا ہے جس وقت کہ وہ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ اور ان راوی کا نام لئے بغیر ابراہیم کا ذکر کرنا اس روایت کو مرسل بنا دیتا ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ابراہیم تیمی کی طرف اس روایت کی نسبت ہی غلط طور پر کر دی گئی ہو اور حقیقتاً وہ اس کے راوی نہ ہوں۔ غرضیکہ سند کے اعتبار سے یہ روایت قابل استناد نہیں ہے۔

سند کے علاوہ متن پر غور کیا جائے تو درایۃً مندرجہ ذیل امور لائق توجہ اور قابل غور ہیں۔

۱۔ اسلامی قاضی سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی عدالت میں آنے والے مقدمہ کے فریقین کے درمیان اس طرح امتیاز برتے کہ ایک فریق کا عدالت پر سے اعتماد ہی اٹھ جائے، ظاہر ہے کہ جب قاضی شریح امیر المومنین حضرت علیؓ سے جو اس مقدمہ کے مدعی تھے اس طرح مرعوب ہوئے ہوں گے کہ ان کو

؎ ائمہ جرح و تعدیل جب کسی کے بارے میں ایسا جملہ بولتے ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اپنی ذات سے نیک آدمی تھا لیکن قابل استناد نہیں ہے۔

عدالت میں دیکھتے ہی اپنی مسند چھوڑ کر ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے ہوں۔ اور پھر مسند عدالت پر مدعی یعنی حضرت علیؓ بیٹھ گئے ہوں تو یہ منظر دیکھ کر مدعا علیہ یعنی یہودی کو اس عدالت سے انصاف ملنے کی توقع کیونکر قائم رہی ہو گی؟ اور جب کرسی عدالت پر حضرت علیؓ بیٹھ گئے تو کیا قاضی شریح نے مقدمہ کی سماعت کھڑے کھڑے کی؟ کیا نقشہ ہو گا اس عدالت کا کہ ایک طرف قاضی دبکا ہوا کھڑا مقدمہ کی سماعت کر رہا ہے، دوسری طرف مدعا علیہ بھی کھڑا ہوا ہے، اور مدعی صاحب کرسی عدالت پر تشریف فرما ہیں؟ اور پھر لطف یہ کہ ایک طرف تو قاضی شریح کی اس مرعوبیت اور مدعی کے ساتھ اس ظالمانہ وغیر منصفانہ رعایت کا ذکر کیا جا رہا ہے، دوسری طرف ان ہی کے اس انصاف اور جرأت مندانہ فیصلہ کو بھی بیان کیا جا رہا ہے کہ انھوں نے امیر المومنین حضرت علیؓ کے دعوی کی سچائی کو تسلیم کرنے کے باوجود اسلامی قانون کے مطابق گواہ نہ پیش کر سکنے کی وجہ سے مقدمہ ان کے خلاف فیصل کر دیا یعنی ع۔

جناب شیخ کے نقش قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

۲۔ اگر ہم اپنے دل پر جبر کر کے اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ قاضی شریح اسلامی قوانین سے اتنے ہی نابلد اور عدل و انصاف کے تقاضوں سے اتنے ہی بے خبر تھے تو بھی حضرت علیؓ جیسی بلند قامت شخصیت کے بارے میں یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک قاضی کی "چاپلوسی" اور اسلامی عدالت کے وقار کو مجروح کرنے والی حرکت پر اس کی سرزنش کرنے کے بجائے نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی کی ہو گی بلکہ مقدمہ کے ایک فریق ہوتے ہوئے خود کرسی عدالت پر جا کر بیٹھ گئے ہوں گے؟۔

۳۔ روایت میں حضرت علیؓ نے اپنے حریف یعنی مدعا علیہ کے ساتھ نہ بیٹھنے

کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "غیر مسلمین کو اپنی مجلسوں میں اپنے برابر نہ بٹھاؤ، نہ ہی ان کے مریضوں کی عیادت کرو اور ان کو تنگ ترین راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دو، اور اگر وہ تمہیں برا بھلا کہیں تو ان کو مارو، اور اگر وہ تمہیں ماریں تو ان کو قتل کر دو" حالانکہ ہمیں صحیح روایات سے غیر مسلمین کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سلوک کا علم ہوتا ہے کہ مسجد نبوی کے اندر آپ غیر مسلمین کے وفود سے نہ صرف اپنے برابر بٹھا کر گفتگو کرتے بلکہ ان کی عرفی حیثیت کی رعایت فرماتے ہوئے ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرتے[1]، ان کے مریضوں کی عیادت بھی فرماتے[2] اور ان کے حقوق کی پوری پوری رعایت فرماتے، اسی طرح بدلہ کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں واضح طور پر ہدایت فرمائی ہے کہ :-

جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

برائی کا بدلہ اسی طرح کی برائی ہے مگر جو درگذر کرے اور (معاملہ کو) درست کر دے تو اس کا بدلہ خدا کے ذمہ ہے اس میں شک نہیں کہ

---

[1] سورۂ عبس کا نزول ہی حضور علیہ السلام کو اس بات پر تنبیہ کرنے کیلئے ہوا کہ حضورؐ نے مشرکین مکہ سے گفتگو فرماتے ہوئے اپنے ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کی رعایت نہیں فرمائی تھی اور دوران گفتگو ان کے بار بار سوال کرنے پر اس خیال سے اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا تھا کہ مشرکین کی طرف سے توجہ ہٹا کر ابن ام مکتومؓ کی بات پوری کرنا کہیں ان لوگوں کو ناگوار نہ گذر جائے چنانچہ اس پر حق تعالیٰ نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى الخ (چیں بہ جبیں ہوئے اور پیٹھ پھیر لی اسوقت جبکہ ان کے پاس ایک نابینا آیا الخ) ترمذی ج ۲ ص ۱۶۸ [2] اپنے اوپر کوڑا پھینکنے والی غیر مسلم بوڑھی عورت کی عیادت (بقیہ ص پر)

الظَّالِمِيْنَ (الشوریٰ۔ ۴۰) وہ ظلم کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔

پھر کیا ان واضح ہدایات اور عملی مثالوں کی موجودگی میں حضور علیہ السلام کیطرف اس قول کو منسوب کرنا اس کے جھوٹ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے؟ اور حضرت علیؓ کی طرف ایک غیر مسلم کے ساتھ بدسلوکی کرنے اور پھر اس کی وجہ جواز کے طور پر فرمان رسول سے استدلال کرنے کی نسبت کرنا حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر صحابی پر تہمت نہیں ہے؟۔

۴۔ روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے گواہوں کی حیثیت سے اپنے غلام قنبر اور اپنے صاحبزادے حضرت حسنؓ کو پیش فرمایا، اور دونوں نے قاضی شریح کے سامنے گواہی دی، قاضی شریح نے حضرت علیؓ کے غلام قنبر کی گواہی تو مان لی لیکن صاحبزادے حضرت حسنؓ کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس طرح حضرت علیؓ اور قاضی شریح دونوں کو اسلام کے قوانین قضا و شہادت سے بے خبر اور ظالم گردانے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے کیونکہ شہادت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی آدمی کے حق میں اس کے بیٹے اور اس کے غلام کی شہادت معتبر نہیں ہوتی۔ پھر حضرت علیؓ کا اپنے بیٹے اور اپنے غلام ہی کو گواہی میں پیش کرنا یا تو اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ اس اسلامی قانون سے واقف ہی نہ ہوں یا اس لئے کہ قانون سے واقفیت کے باوجود اپنی شخصیت اور اپنے اقتدار کا ناجائز استعمال کر رہے ہوں۔ اور قاضی شریح پر تو اس سے بھی زیادہ گھناؤنا الزام عائد کیا گیا ہے کہ انھوں نے غلام کی گواہی قبول کی لیکن بیٹے کی گواہی رد کر کے گویا اسلامی قانون میں من مانی تحریف کر دی، حالانکہ اسلامی قانون کے مطابق نہ بیٹے کی گواہی باپ کے

(حاشیہ صـ ۷۰) کے لئے حضور کا اس کے گھر تشریف لیجانا مشہور واقعہ ہے۔

حق میں معتبر ہے نہ ہی غلام کی گواہی آقا کے حق میں ۔

۵۔ روایت میں ہے کہ جب قاضی شریح نے حضرت حسنؓ کی گواہی قبول کرنے سے انکار کیا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے قاضی سے سوال کیا کہ کیا تم نے حضرت عمرؓ کو یہ روایت کرتے ہوئے نہیں سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسنؓ و حسینؓ جوانان جنت کے سردار ہیں؟ اور جب قاضی شریح نے جواب میں کہا کہ ہاں یہ سنا ہے، تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس کے باوجود تم حسنؓ کی شہادت نہیں قبول کر رہے ہو؟ اور پھر قاضی شریح کو سمجھ لینے کی، دھمکی دی ۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ حسنؓ و حسینؓ کے جوانانِ جنت کے سردار ہونے کی کوئی روایت حضرت عمرؓ سے مروی ہے ہی نہیں، پھر حضرت علیؓ یہ کیسے فرما سکتے ہیں کہ کیا تم نے عمرؓ کو یہ کہتے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ......؟ اور اگر حضرت عمرؓ کی ایسی کوئی روایت ہو بھی تو اس سے تو حضرات حسنینؓ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے جس کا نہ قاضی نے انکار کیا تھا نہ ہی اس کے بیان کرنے کا کوئی موقع تھا، قاضی نے تو حضرت حسنؓ کی شہادت اس لئے رد کی تھی کہ وہ مدعی یعنی حضرت علیؓ کے بیٹے تھے اور باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت معتبر نہیں ہوتی ۔ پھر کیا حضرت علیؓ پر یہ بیہودہ الزام تسلیم کیا جائے کہ انھوں نے عدالت پر ناجائز دباؤ ڈالنے کے لئے حضورؐ کی بیان فرمودہ حضرت حسنؓ کی فضیلت کا ذکر کیا اور قاضی کو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ کرنا چاہا؟ یہی نہیں بلکہ جب اس کے باوجود بھی قاضی شریح نے حضرت حسنؓ کی شہادت حضرت علیؓ کے حق میں قبول نہیں کی تو حضرت علیؓ نے ان کو انتقام کی دھمکی دی؟ ـــ اور اس طرح گویا حضرت علیؓ نے نعوذ باللہ ایک جاہل و بے دین آدمی کی سطح پر اُتر کر بات کی ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔

مندرجہ بالا امور پر غور کرنے سے اس "روایت" کی حقیقت اور اس کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے اور بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ عدل و انصاف کو آڑ بنا کر کس طرح حضرت علیؓ جیسی پاکباز شخصیت پر الزامات عائد کئے گئے ہیں، اور ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے کس طرح حضرت علیؓ کی زبان سے وہ باتیں کہلوائی گئی ہیں جو اسلامی تعلیمات اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف ہیں۔

کیا اس "فضیلت" کے سلسلہ میں اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ "سبائیوں کی دوستی" کا ایک نمونہ ہے۔ سچ ہے کہ ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

حضرت علیؓ پر خلافت طلبی کا الزام

حضرت علیؓ پر ان کے "عیار دشمنوں" کی طرف سے (جن کو از راہ توسع کچھ لوگ "نادان دوست" کے نام سے یاد کرتے ہیں) یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کا اوّلین حقدار سمجھتے تھے، اور انھوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد اپنا یہ دعویٰ پیش بھی کیا تھا ——— پھر جب صحابہ کرامؓ نے اُن کے اس حق اور دعویٰ کی رعایت نہ کر کے سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفۃ الرسولؐ کی حیثیت سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب کر لیا، تو حضرت علیؓ کو اس کا بیحد ملال بھی ہوا، اور انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن بالآخر چھ ماہ بعد امت کو اختلاف و انتشار سے بچانے کے لئے بیعت تو کر لی، مگر ان کے دل میں اس کی کسک بہر حال باقی رہی کہ انھیں ان کے ایک جائز اور آئینی حق سے محروم کیا گیا۔ [1]

---

[1] کہا جاتا ہے کہ یہ مطالبہ تنہا حضرت علیؓ ہی کا نہ تھا، بلکہ تمام بنو ہاشم نبی صلی اللہ علیہ وسلم (بقیہ ص ۸۳ پر)

حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرت علیؓ پر سبائیوں کا وہ گھناونا الزام ہے جس سے "جاہ پرستی" اور "جاہلانہ عصبیت" کی بو آتی ہے اور ہم یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علیؓ ان دنائتوں سے قطعی طور پر پاک تھے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نہ صرف حضرت ابوبکرؓ کو بلکہ ان کے بعد اور اپنے سے پہلے کے دونوں خلفاء حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو بھی برحق سمجھتے تھے اور انھوں نے ان خلفائے ثلثہ کے ہاتھوں پر برضا و رغبت اور بلا توقف بیعت کی تھی، اور ان تینوں خلفاء کو اپنا مخلصانہ تعاون بھی دیا تھا، نہ ان کو خلافت کی طلب تھی نہ ہی انھوں نے اس کا دعویٰ کیا اور نہ ہی ان کو خلفائے ثلاثہ میں سے کسی کی خلافت پر کوئی اشکال ہوا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے اصرار پر انھوں نے خلافت قبول فرمائی تھی، اس وقت بھی ان کو خود اس کی کوئی طلب نہ تھی۔ [1]

(حاشیہ صـ ۷۳) کی خلافت کا حقدار حضرت علیؓ ہی کو سمجھتے تھے اور ان میں حضور کی صاحبزادی اور حضرت علیؓ کی زوجہ محترمہ حضرت فاطمہ زہراؓ بھی شامل تھیں، حضرت علیؓ نے خاص طور پر حضرت فاطمہؓ ہی کی رعایت میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے ان کی زندگی بھر توقف کیا، ۶ ماہ بعد جب حضرت فاطمہؓ کی وفات ہو گئی تب حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت قبول کی، ایسا یہ لوگ کیوں سمجھتے تھے؟ اس کی ایک عام وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت علیؓ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے قریبی رشتہ دار اور معتمد تھے، اس کے علاوہ "قصۂ قرطاس" یا "اعلان غدیر خم" جیسی چیزوں کا ذکر ہم اس لئے نہیں کرنا چاہتے کہ ان واقعات سے خلافت علیؓ پر صرف روافض استدلال کرتے ہیں اور ان کا رد اس جگہ مقصود نہیں ہے۔

[1] حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد سب سے پہلے مصری باغیوں نے حضرت علیؓ سے بیعت خلافت لینے کے لئے اصرار کیا، پہلے تو حضرت علیؓ اس مطالبہ کو منظور کرنے سے گریز کرتے رہے (بقیہ صـ ۷۵ پر)

جہاں تک حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا معاملہ ہے تو اس کے سلسلہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں۔

قد صحح ابن حبان وغیرہ	ابن حبان اور ان کے سوا دوسرے محدثین نے
من حدیث ابی سعید الخدری	بھی حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت
ان علیا بایع ابابکر فی	کو صحیح کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے شروع ہی
اول الامر[1]	میں حضرت ابو بکرؓ سے بیعت کر لی تھی۔

اسی طرح حافظ ابن عبد البر نے خود حضرت علیؓ کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔

عن قیس بن عباد قال	قیس بن عبادؓ سے روایت ہے وہ کہتے
لی علی بن ابی طالب ان رسول	ہیں کہ مجھ سے علیؓ بن ابی طالبؓ نے فرمایا
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کئی شب وروز
مرض لیالی وایاما ینادی	بیمار رہے ان دنوں میں نماز کی اذان
بالصلوٰۃ فیقول مروا ابابکر	ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ ابو بکرؓ کو
یصلی بالناس فلما قبض	حکم پہنچا دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
نظرت فاذا الصلوٰۃ علم الاسلام	ہو گئی تو میں نے غور کیا کہ نماز اسلام کا جھنڈا
وقوام الدین فرضینا الدنیانا	اور دین کا رکن ہے، لہٰذا ہم نے اپنی دنیا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) پھر جب انھوں نے یہ اندازہ کیا کہ یہ لوگ میرے سوا کسی دوسرے کی بیعت سے اتفاق نہیں کریں گے تو اس شرط پر خلافت قبول کرنے کیلئے آمادگی ظاہر کی کہ اہل مدینہ کی رائے معلوم کر لی جائے، چنانچہ جب اہل مدینہ کی رائے معلوم کی گئی تو انھوں نے بھی حضرت علیؓ ہی کی خلافت کی بات کی تب انھوں نے امت کے مفاد میں خلافت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

[1] سیرت خلفائے راشدین ص ۴۴ بحوالہ فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۶۔

من رضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لدیننا فبایعنا ابابکر (سیرت خلفائے راشدین ص۴۵ بحوالہ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب)	کی پیشوائی کے لئے اس شخص کو پسند کرلیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کی پیشوائی کے لئے پسند فرمایا پس ہم نے ابوبکرؓ سے بیعت کرلی۔

ان دونوں بیانوں سے واضح طور پر یہی بات معلوم ہو رہی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب ہوتے ہی بلا تاخیر و بلا توقف بیعت کرلی تھی، اور اس سلسلہ میں ان کا اپنا نہ کوئی دعویٰ تھا نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی ملال تھا، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار فرمایا اور ان ہی کو اس منصب کا سب سے زیادہ اہل گردانتے ہوئے ان کے مقابلہ میں دعوائے خلافت کرنے سے انکار کردیا۔ چنانچہ سوید بن غفلہ کی روایت ہے کہ۔

"ابوسفیانؓ۔ حضرت علی اور حضرت عباس (رضی اللہ عنہما) کے پاس آئے اور کہا اے علی! اور اے عباس! کیا بات ہے کہ خلافت قریش کے اس قبیلہ میں گئی جو مرتبے کے اعتبار سے پست اور تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہے، بخدا اگر تم دونوں آمادہ ہو تو ہم مدینہ کو اپنے حامیوں اور مؤیدین کے لشکر سے بھر دیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا:۔ خدا کی قسم میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر ہم نے ابوبکرؓ کو اس خلافت کا اہل نہ سمجھا ہوتا تو ہم آسانی کے ساتھ منصب خلافت ان کے حوالہ نہ کرتے۔ اے ابوسفیان! اہل ایمان کا شعار خلوص و صداقت ہے، وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، خواہ ان کے مستقر اور ان کے اجسام میں مکانی طور پر کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو، قلب و زبان کا تفاوت اور قول و عمل کا تضاد منافقین کا شیوہ ہے۔ لے (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس روایت سے نہ صرف یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ کے ایمان واخلاص پر کامل اعتماد تھا اور ان کی خلافت پر وہ دل اور زبان سے راضی تھے بلکہ روایت میں اس بات کی بھی صراحت موجود ہے کہ حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کی اس متفقہ خلافت کے مقابلہ میں کسی قسم کے زبانی مطالبہ ہی نہیں بلکہ دلی چاہت کو بھی نفاق شمار کرتے تھے ـــــ پھر بھلا یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ جس چیز کو خود حضرت علیؓ "منافقین کا شیوہ" قرار دے رہے ہوں اس کا انھیں سے ارتکاب ہو؟۔

شیعی کتاب شرح نہج البلاغۃ میں بھی اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے، اس میں حضرت علیؓ کا جواب اگرچہ مختلف ہے لیکن حصول وطلب خلافت سے اس میں بھی انکار ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لہ المرتضیٰ ص ۵۲-۱۵۱ بحوالہ کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۱ - بعض "بیمار ذہن" لوگوں نے حضرت ابوسفیانؓ کی اس پیش کش کو ان کے خلاف اپنا دلی غبار ظاہر کرنے کا بہانہ بناتے ہوئے یہ کہا ہے کہ حضرت علیؓ تو بیشک مخلص تھے اور ان کو خلافت کی کوئی طلب نہ تھی، جیسا کہ ان کے جواب سے ظاہر ہے، لیکن ابوسفیانؓ کا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے پاس جانا اور ان کو حضرت ابوبکرؓ کے خلاف بغاوت پر اکسانا اس بات کی دلیل ہے کہ ابوسفیانؓ کے دل سے جاہلی عصبیت کے جراثیم پوری طرح ختم نہیں ہوئے تھے اور فتنہ وفساد سے ان کی دلچسپی برقرار تھی، اس کے جواب میں عرض ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ حضرت ابوسفیانؓ نے یہ پیشکش حضرت علیؓ وحضرت عباسؓ کو ٹٹولنے کے لئے کی ہو کہ دیکھیں ان لوگوں کا موقف کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خانوادۂ رسالت کے افراد ہونے کے ناطے حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کا عندیہ معلوم کرنا اور انکو اعتماد میں لینا ایک مستحسن فعل تھا، اور منافقین کی ہوا خیزیوں اور ریشہ دوانیوں کے مقابلہ میں حضرت ابوسفیانؓ کا ان دونوں بزرگوں سے یہ انداز گفتگو نہایت ہی مدبرانہ تھا جس پر ان کو کسی طرح مطعون نہیں کیا جاسکتا۔

"جب ابوسفیان نے حضرت علیؓ سے اجازت طلب کی کہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیں تو حضرت علیؓ نے جواب دیا، تم ہم سے ایسی بات کے طالب ہو جو ہمارا کام نہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک ایسی وصیت کی ہے جس پر ہم قائم ہیں؟ ابوسفیان یہ سنکر حضرت عباس کے گھر گئے اور کہا اے ابوالفضل تم اپنے برادرزادہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانشینی کے زیادہ مستحق ہو ہاتھ بڑھاؤ میں تمہیں خلیفہ تسلیم کرتا ہوں، جب میں تم سے بیعت کرلوں گا تو کوئی بھی تمہارے بارے میں اختلاف نہیں کریگا حضرت عباس یہ سنکر ہنسے اور کہا اے ابوسفیان! جس چیز کو علیؓ نامنظور کریں اس کا میں طالب ہوں؟ یہ سن کر ابوسفیان ناکام واپس آگئے" ۔ؔلہ

اسی کتاب میں خلافت ابوبکر صدیقؓ ہی کے سلسلہ میں ایک دوسری روایت بھی ہے جس سے اس موقف کی اور بھی زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ حضرت علیؓ خلافت کے طالب نہ تھے اور سبائیوں کے اس الزام کا من گھڑت ہونا بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کا اپنے کو حق دار سمجھتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو ناجائز سمجھتے تھے، وہ روایت یہ ہے:۔

"جب فضل بن عباس نے کہا! اے بنی تیم آپ نے ایک نبی کی خلافت حاصل کی ہے (اور وہ نبی ہمارے خاندان کا تھا) تمہارے مقابلہ میں ہم (خاندانی طور پر) اس کے زیادہ حقدار ہیں، ابولہب بن عبدالمطلب بن ہاشم کے بعض فرزندوں نے اس طرح کا کوئی شعر بھی کہا، زبیر کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے یہ سنا تو ان کو بلا کر ان کو روکا، اور کہا کہ خبردار! آئندہ ایسی بات

لہ المرتضیٰ صفحہ ۵۳-۵۲ بحوالہ شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید ج ۶ ص ۱۸۔

زبان پر نہ لاتا اور فرمایا۔ سلامۃ الدین احب الینا من غیرہ یعنی
دین کی بقا ہمیں دوسری باتوں کی نسبت زیادہ عزیز ہے۔" لہ

ان تمام سنی و شیعہ روایات سے اس ایک ہی بات کی وضاحت ہوتی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کے اولین خلیفہ کی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کے تقرر کو حضرت علیؓ برضا و رغبت نہ صرف صحیح سمجھتے تھے، بلکہ دین اسلام کی بقا اور اس کی بھلائی بھی اسی میں سمجھتے تھے اور یہی سمجھ کر انھوں نے بلا جبر و اکراہ اور بلا توقف حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اور حضرت علیؓ پر محض قرابت کی بنیاد پر خلافت طلبی کا الزام لگانا ان کے بلند کردار کو داغدار کرنے کی ایک ناپاک کوشش کے سوا کسی دوسرے نام سے نہیں یاد کیا جا سکتا۔

اب رہ گیا ان بعض روایات کا معاملہ جن سے علم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر ان کی خلافت قائم ہونے کے چھ ماہ بعد بیعت کی، تو حافظ ابن حجرؒ، حافظ ابن کثیرؒ، حافظ ابن عبد البرؒ اور دوسرے اہل علم کی تصریحات کے مطابق یہ دوسری مرتبہ بیعت تھی جو پہلی ہی بیعت کی تجدید و توثیق تھی اور اس دوبارہ بیعت کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ حضرت علیؓ نے پہلی بیعت مجمع عام میں نہیں کی تھی، اس لئے عوام کو غلط فہمی سے بچانے کی خاطر چھ ماہ بعد مجمع عام میں بیعت کی، تا کہ کسی کو ہوا خیزی کا موقع نہ مل سکے۔ ٢ہ

لہ المرتضیٰ ص ۱۵۲، ۱۵۳ بحوالہ شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید ج ۶۔ ص ۲۱

٢ہ ابن کثیرؒ نے بیہقی کے حوالے سے درج ذیل روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے پہلی بیعت بھی مجمع عام میں کی تھی، ایسی صورت میں دوبارہ بیعت کی غرض اپنے موقف کی وضاحت اور فتنوں کا سد باب ہی ہو سکتی ہے۔ روایت یہ ہے کہ (باقی ص ۸۰ پر)

حضرت علیؓ کے چوتھے خلیفۂ راشد ہونے کی مناسبت سے ان کے سلسلہ میں درج بالا چار روایات کی حقیقت کے بیان پر اکتفا کیا جا رہا ہے، اور ان ہی چار روایتوں سے قارئین کو اندازہ ہو جائیگا کہ حضرت علیؓ پر سبائیوں کی خصوصی طور پر کس طرح، کرم فرمائیاں، رہی ہیں اور فضیلت کے پردہ میں ان پر کیسے کیسے بیہودہ الزام عائد کرکے، ہجو ملیح، کا حق ادا کیا گیا ہے ۔ اور یہی وہ بات ہے جو حضرت علیؓ کو تاریخ کی مظلوم شخصیتوں میں شمار کرانے کے لئے کافی ہے ۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) "حضرت ابوبکرؓ منبر پر چڑھے، اور لوگوں پر نظر دوڑائی، ان میں حضرت علیؓ کو نہیں پایا تو ان کو بلاکر کہا: اے رسول اللہ کے عم زاد بھائی اور آپکے داماد! کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے؟ حضرت علیؓ نے کہا: مجھے کوئی شکایت یا رنجش نہیں، اے خلیفۂ رسولؐ اللہ، یہ کہہ کر آپنے بیعت کرلی، یہی الفاظ تھے یا اس کا یہی مفہوم ہے "۔
حافظ ابن کثیرؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔
"اس واقعہ کا ایک اہم اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے پہلے ہی دن بیعت کی ہے یا وفات کے دوسرے روز، اور یہی حقیقت امر ہے کیونکہ حضرت علیؓ نے کسی وقت حضرت ابوبکرؓ کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور کسی نماز میں بھی غیر حاضر نہیں رہے" (البدایۃ والنہایۃ ج۵ ص ۲۴۹)
(منقول از المرتضیٰ ص ۵۱،۱۵۰)

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما

تاریخ کی اہم ترین مظلوم شخصیتوں میں ایک نام حضرت حسنؓ بن علیؓ کا بھی ہے ان کی مظلومیت کے لئے یہی بات کیا کم ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ بن علیؓ کے حالات اور ان کے کارنامۂ شہادت پر تو غلط، صحیح، ہر قسم کی بیسیوں کتابیں اُردو زبان میں بھی مل جاتی ہیں، لیکن حضرت حسنؓ کے حالات پر مشتمل کوئی ایک مستقل اور معیاری کتاب بھی راقم الحروف کے محدود و ناقص مطالعے سے نہیں گذری۔ راقم الحروف کو اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ ایسی کوئی کتاب آج تک لکھی ہی نہیں گئی، کیونکہ اسے اپنے قصور علم و مطالعہ کا برملا اعتراف ہے لیکن اس سے یہ بات تو سمجھ میں آ ہی جاتی ہے کہ ہمارے تاریخ نگاروں نے حضرت حسنؓ کی طرف وہ اعتنا نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ـــــــ اور بس یہی بات ان کی مظلومیت کے اظہار کے لئے کافی ہے۔ مزید برآں ہم جب دیکھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کے مقابلہ میں کہیں کم مرتبہ لوگوں کے نسبی وذاتی فضائل کا حال، رطب و یابس، ملاکر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے، اور خود حضرت حسنؓ کے بھائی حضرت حسینؓ اور ان کے والد ماجد حضرت علیؓ کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبی قرابت کا لحاظ کرتے ہوئے بھرپور توجہ کی گئی ہے، تو حضرت حسنؓ کی طرف سے اس بے اعتنائی کی وجہ دریافت

کرنا ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام میں نسبی فضیلت کو مدارِ کمال ٹھہرانے کی گنجائش نہیں ہے اور صرف اس بنیاد پر ہمیں حضرت حسنؓ کے حالات کی تفصیلات تلاش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، لیکن جب ہم اس ناقابلِ انکار حقیقت کی طرف نظر کرتے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے اپنی بے نفسی، اخلاص اور دینِ اسلام کے ساتھ غیر مشروط وفاداری کے ذریعہ تاریخ کا وہ عدیم المثال کارنامہ انجام دیا جس کی وجہ سے اسلامی تاریخ ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی، تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ جن اسلام دشمن عناصر کو حضرت حسنؓ کا یہ "کارنامہ" پسند نہیں آیا تھا، اور جن لوگوں نے ان کی جان ومال اور عزت وآبرو سے کھیلنے میں دریغ نہیں کیا تھا، ان ہی عناصر نے ان کو "گوشۂ گمنامی میں" ڈالنے کی "سزا" دی ہے، اور ہمارے بعد کے مؤرخین کی یہ "سادہ لوحی" بھی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے بھی "گمنام" کو "نیک نام" کرنے سے زیادہ "مشہور" کو "مشہور تر" ہی کرنے کی طرف توجہ کی۔

حضرت حسنؓ کی حضرت معاویہؓ سے مصالحت

حضرت حسنؓ کا وہ بے مثال کارنامہ ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے اس "سبائی فتنہ" کا سدِ باب کرنا ہے جس نے کم وبیش دس برس سے پوری ملتِ اسلامیہ کو مضطرب وبے چین بنا رکھا تھا، حضرت حسنؓ نے اپنی ۶ ماہی خلافت سے دست بردار ہو کر زمامِ خلافت حضرت معاویہؓ کو اس وقت سونپی جبکہ چالیس ہزار افراد ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، اگرچہ ان افراد میں وہ منافق سبائی بھی تھے جنھوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اور ان کو ہر طرح اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے بعد بھی ان سے غداری کی تھی، لیکن ان میں ایسے مخلص بھی تھے

جو حضرت حسنؓ کے ایک اشارہ پر اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے، حضرت حسنؓ چاہتے تو ایک دوسری "جنگ صفین" برپا کرا سکتے تھے، لیکن ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے "خون سے رنگین خلافت" قبول کرنے کے بجائے اس سے دست بردار ہو جانا پسند کیا، اگرچہ اس صلح کی وجہ سے حضرت حسنؓ کو ان لوگوں کی طرف سے جو اُن کے "اپنے" بنتے تھے طرح طرح کی جسمانی و روحانی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کو طعنے دیئے گئے اور انھیں عارالمؤمنین اور مذل المومنین جیسے بیہودہ خطابات سے پکارا گیا، جیسا کہ حافظ ابن کثیرؒ تحریر کرتے ہیں۔

"ایک شخص نے جسے ابو عامر کہا جاتا تھا حضرت حسنؓ بن علیؓ کو یوں مخاطب کیا السلام علیك یا مذل المومنین (اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے السلام علیکم) کیونکہ آپ نے شامیوں سے جنگ نہیں کی تھی، حضرت حسنؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اے ابو عامر! اس طرح نہ کہو، میں نے مومنوں کو ذلیل نہیں کیا ہے، ہاں اس چیز کو ناپسند کیا ہے کہ میری حکومت کی خاطر ان کا خون بہے"۔ ؎

یا اسی طرح جب ان کو یا عارالمومنین (اے مومنوں کے لئے باعث ننگ و عار) کہہ کر پکارا جاتا تو آپ جواب میں فرماتے العار خیر من النار (عار جہنم کی آگ سے بہتر ہے یعنی اپنی حکومت بچانے کی خاطر مسلمانوں کو جنگ و قتال میں مبتلا کر کے جہنم کی آگ کا خطرہ مول لینے سے تمہارے اس عار دلانے اور ملامت کے ان تیروں کے سہہ لینے کو میں بہتر سمجھتا ہوں۔

اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ حضرت حسنؓ وہی تو تھے جن کے بارے میں رسولِ خدا

؎ البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۸۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے برسر منبر بڑے فخر کے ساتھ فرمایا تھا۔

ان ابنی ھذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین[1]

بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے، اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کو تو پورا ہونا ہی تھا اور حضرت حسنؓ کو یہ اعزاز ملنا ہی تھا کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہ جنگ وجدال کے راستہ سے ہٹ کر صلح ومصالحت کا راستہ اپنائیں، اور ظاہر ہے کہ اس اعزاز کے مقابلہ میں ان عار دلانے والے "دوست نما دشمنوں" کی حضرت حسنؓ کیا پرواہ کرتے۔

رہ گیا یہ الزام کہ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں بزدلی کا مظاہرہ کیا اور حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے انھوں نے اپنے "خیر خواہوں" کے حوصلے پست کئے، تو اس الزام میں کوئی صداقت نہیں ہے، کیونکہ باوجود فطری طور پر صلح پسند ہونے کے بھی اپنے "حامیوں" کے اصرار پر انھوں نے حضرت معاویہؓ سے جنگ کا ارادہ کر لیا تھا، اور باقاعدہ فوج کے ساتھ پیش قدمی بھی کر لی تھی، مگر پھر ان حامیوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، اس کی کچھ تفصیل حافظ ابن کثیرؒ کے اس بیان سے معلوم ہوتی ہے۔

"حضرت حسنؓ رضی اللہ عنہ کا کسی سے جنگ کرنے کا ارادہ نہ تھا، مگر لوگوں نے اصرار کے ساتھ ان پر جنگ کے لئے دباؤ ڈالا اور اتنی بڑی تعداد میں جمع ہو گئے جس تعداد میں پہلے نہیں جمع ہوئے تھے، چنانچہ حضرت حسنؓ بن علی رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد کو بارہ ہزار کی فوج کے ساتھ آگے بھیجا، اور خود پوری فوج کے ساتھ شام کی طرف بڑھے کہ معاویہؓ اور اہل شام

---

[1] بخاری شریف ج ۱ ص ۳۷۳

سے جنگ کریں، جب مدائن سے آگے نکلے تو وہاں آکر ٹھہر گئے اور قیس بن سعد والے، مقدمۃ الجیش کو اپنے آگے ٹھہرایا، جب وہ لشکر کیسا تھ مدائن کے باہری حصہ میں تھے کسی نے چیخ کر کہا کہ، قیس بن سعد قتل ہو گئے،، (یہ سنکر) لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی، اور ایک دوسرے کا سامان لوٹنے لگے، یہاں تک کہ حضرت حسنؓ کے خیمے اکھاڑ دیئے گئے، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ جس فرش پر بیٹھے تھے اسے بھی لوگ کھینچنے لگے، اور اسی حالت میں ایک دوسرے کو زخمی کرنے لگے، خود حضرت حسنؓ بھی زخمی ہو گئے مگر زخم کاری نہ تھا، وہ زخمی ہونے کے بعد اٹھ کر سوار ہوئے، اور مدائن کے قصر میں چلے گئے . . . . ،، [1]

ایسے ،، حامیوں،، کی حمایت پر یقین کر کے اگر حضرت حسنؓ، حضرت معاویہؓ اور اہل شام سے جنگ کرتے تو اس کا کیا نتیجہ سامنے آسکتا تھا؟ اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے، ان حالات کے پیش نظر اگر حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے اپنی شرطوں کے مطابق صلح کر کے مسلمانوں کو قتل عام سے بچا لیا تو کیا اسے ان کی بزدلی سے تعبیر کرنا، ظلم عظیم، نہیں ہے؟ -

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حالات کی ناسا عدت، اور ساتھیوں کی مسلسل بے وفائیوں، اور بے صبری کے مظاہروں کے باوجود حضرت حسنؓ نے اپنی طرف سے صلح کی پیش کش نہیں کی تھی، بلکہ حضرت معاویہؓ کی پیش کش کو چند شرائط کے ساتھ منظور کرتے ہوئے انھوں نے مصالحت قبول فرمالی تھی، جیسا کہ صحیح بخاری کی اس روایت [2] سے ظاہر ہے :-

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۴ - [2] حافظ ابن کثیرؒ، علامہ ابن الاثیر جزریؒ اور دوسرے بعض مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح کی باقاعدہ پہل (باقی صـ پر)

عن ابي موسى قال سمعت
الحسن يقول استقبل
والله الحسن بن علي على
معاوية بكتائب كامثال
الجبال فقال عمرو بن
العاص اني ارى كتائب
لاتولي حتى تقتل اقرانها
فقال له معاوية و
كان والله خير الرجلين
اي عمرو ان قتل هؤلاء
هؤلاء وهؤلاء هؤلاء من لي
بامور الناس من لي
بنسائهم من لي بضيعتهم
فبعث اليه رجلين من
بني عبد الشمس عبدالرحمن

حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں
کہ میں نے حضرت حسنؒ (بصری) کو یہ کہتے سنا
کہ خدا کی قسم حضرت حسنؓ بن علیؓ، حضرت معاویہؓ
کے مقابلہ پر پہاڑوں کی طرح فوجوں کے پرے
لیکر نکلے تھے، پس حضرت عمرو بن العاصؓ
نے فرمایا کہ میں تو فوجوں کے ایسے پرے
دیکھ رہا ہوں جو اپنے مقابل کو قتل کئے بغیر
نہ پلٹیں گے، تو ان سے حضرت معاویہؓ نے
کہا اور وہ خدا کی قسم ان دونوں میں بہتر شخص
تھے[1] کہ اے عمرو! اگر ان لوگوں نے ان
لوگوں کو، اور ان لوگوں نے ان لوگوں کو قتل
کر دیا تو لوگوں کے انتظام میں میرا شریک
کون ہوگا؟ ان کی عورتوں کی نگہداشت
کے لئے میرے پاس کون آدمی ہوگا؟ میرا
کون ہوگا ان کے سامان کی حفاظت کیلئے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) حضرت حسنؓ کی طرف سے ہوئی تھی، مگر ظاہر ہے کہ صحیح بخاری کی اس روایت کے مقابلہ میں ان بیانات کو ترجیح نہیں دی جا سکتی، تطبیق کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت حسنؓ کے جس خط کو "صلح کی پیش کش" سے تعبیر کیا گیا ہے وہ "پیشکش" نہیں بلکہ حضرت معاویہؓ کی "پیشکش" کا جواب ہو۔ [1] دونوں شخصوں سے مراد حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ ہیں کیونکہ حضرت معاویہؓ مصالحت کی بات کر رہے تھے اور حضرت عمروؓ جنگ کی۔ (حاشیہ بخاری)

بن سمرة وعبد الله بن
عامر فقال اذهبا الى هذا
الرجل فاعرضا عليه و
قولا له واطلبا عليه فاتياه
ودخلا عليه فتكلما وقالا
له وطلبا اليه فقال لهم
الحسن بن علي انا بنو عبد
المطلب قد اصبنا هذا المال
وان هذه الامة قد عاثت
في دمائها قالا فانه يعرض
عليك كذا وكذا ويطلب
اليك ويسألك قال فمن
لي بهذا قالا نحن لك به
فما سألهما شيئا الا قالا
نحن لك به فصالحه
قال الحسن ولقد سمعت
ابا بكرة يقول رأيت رسول
الله صلى الله عليه وسلم على
المنبر والحسن بن علي الى
جنبه وهو يقبل على الناس
مرة وعليه اخرى ويقول

پھر آپ نے بنو عبد شمس میں سے دو آدمیوں
عبدالرحمن بن سمرۃؓ اور عبداللہ بن عامرؓ کو حضرت
حسنؓ کے پاس بھیجا اور ان سے کہا کہ تم دونوں
ان صاحب (حضرت حسنؓ) کے پاس جاؤ، پھر
انکے روبرو صلح کا معاملہ رکھو اور ان سے گفتگو
کرو اور اپنے مطالبات ان کے سامنے پیش کرو
تو یہ دونوں حضرت حسنؓ کے پاس آئے، ان
تک پہونچے، پھر ان سے بات چیت کی اور اپنی
بات کہی اور مطالبہ پیش کیا، تو حضرت حسنؓ بن
علیؓ نے ان سے فرمایا کہ ہم عبدالمطلب کی اولاد
تو اس مال کو پا چکے اور اس امت نے اپنے
ہاتھ اپنے خون میں رنگ لئے، ان دونوں نے
ان سے کہا کہ آپ کیلئے یہ اور یہ پیشکش ہے اور
یہ اور یہ آپ سے مطالبہ ہے اور آپ سے مانگ کی گئی
ہے (حضرت حسنؓ نے) فرمایا کہ ان چیزوں کا ذمہ دار
کون ہوگا؟ ان دونوں نے کہا کہ آپ کیلئے ہم
ذمہ دار ہیں، پھر جو کچھ بھی انھوں نے مانگ کی
وہ دونوں کہتے رہے کہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں
تب حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح
کر لی، حسنؓ (بصری) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت
ابو بکرہؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ

ان ابنی هذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ فئتین عظیمتین من المسلمین

[بخاری شریف جلد ۱ ص ۳۷۲-۳۷۳ کتاب الصلح]

صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر اس حالت میں دیکھا کہ آپ کے پہلو میں حضرت حسنؓ بن علیؓ تھے اور حضورؐ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی حضرت حسنؓ کی طرف اور فرماتے کہ بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔"

مندرجہ بالا تفصیلی روایت سے بوضاحت دو باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ حضرت حسنؓ اپنی پوری فوجی تیاری کے ساتھ میدان جنگ میں قتال کے لیے پہونچے تھے اور ان کی عظیم الشان فوج کو دیکھکر حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے مدبر و فرزانہ صحابی نے حضرت معاویہؓ کو جنگ کی تحریض کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ یہ فوج تو اتنی کثیر ہے کہ اپنے مقابل والوں کو قتل کرکے ہی لوٹے گی (منشا یہ تھا کہ آپ بھی اسی اعتبار سے مقابل میں فوج بھیجئے) دوم یہ کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عمروؓ کے مشورہ کو قبول نہ کرکے حضرت حسنؓ کے پاس اپنے دو بااختیار قاصد مصالحت کا پیغام لے کر بھیجے، اور ان قاصدوں نے ہر طرح ان کو مطمئن کرکے مصالحت پر آمادہ کیا، اور قاصدوں کی ذمہ داری پر حضرت حسنؓ نے مصالحت منظور فرمائی۔ ایک تیسری اور اہم بات اس صلح کے سلسلہ میں وہ ہے جس کی طرف حضرت ابوبکرہؓ نے توجہ دلائی ہے کہ یہ وہی صلح ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ "میرا یہ بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔"

خلاصہ یہ ہے کہ مصالحت کی اولین باقاعدہ کوشش حضرت معاویہؓ کیطرف سے

ہوئی تھی۔ جسے امت مسلمہ کے بہترین مفاد میں حضرت حسنؓ نے منظور فرماکر اپنے کردار کی عظمت، دین کے ساتھ غیر مشروط وفاداری اور مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا ثبوت فراہم کیا تھا، اسی لئے امت نے صلح کے اس سال کو عام الجماعۃ کے نام سے موسوم کیا۔

اب ظاہر ہے کہ حضرت حسنؓ کے اس مثالی کارنامے اور بے نفسی کے مظاہرہ کو فخر ومسرت کے بجائے ذلت وعار اور بزدلی کی یادگار قرار دینے والے وہی لوگ ہوسکتے ہیں جن کو مسلمانوں کا اتحاد کھٹکتا اور ان کا انتشار وافتراق بھلا معلوم ہوتا ہے، اور ایسے لوگ کیوں نہ حضرت حسنؓ کو "بلیک آوٹ" کرنے کی کوشش کریں گے۔

حضرت حسنؓ اور کثرتِ طلاق

جس طرح حضرت معاویہؓ کے ساتھ حضرت حسنؓ کی مصالحت کے عظیم الشان کارنامے کو غلط رنگ دیکر اسے حضرت حسنؓ کی ایک ناکامی کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی، اسی طرح حضرت حسنؓ جیسے متبع سنت اور کریم النفس صحابی پر پروپیگنڈے کی پوری طاقت کے ساتھ یہ الزام بھی عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کو بکثرت طلاق دیا کرتے تھے، حتیٰ کہ بعض "بسیار نویس" لوگوں نے ان کی یہ "فضیلت" بیان کی ہے کہ انھوں نے تین سو عورتوں کو طلاقیں دیں۔ ایک مشہور اردو مؤرخ اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ عورتوں کو طلاق بہت دیا کرتے تھے، بجز اس کے جس کو آپ سے محبت ہو جاتی، حتیٰ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اہل کوفہ سے کہنا پڑا کہ تم میرے بیٹے حسن کو لڑکیاں نہ دو، لیکن ہمدان نے کہا کہ ہم سے یہ نہ ہوگا کہ لڑکیاں انکے نکاح میں نہ دیں"۔ (تاریخ اسلام ج ۱ ص ۵۰۵ از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

اللہ جانے ان "مؤرخ اسلام" نے یہ بے سند بات کہاں سے لکھدی؟ یہ عبارت تو صاف طور پر یہی تاثر دے رہی ہے کہ حضرت حسنؓ نعوذ باللہ نکاح اور طلاق کو ایک کھیل سمجھتے تھے، اور عورت کو ایک کھلونا سمجھ کر جب تک چاہتے اس سے کھیلتے اور جب چاہتے اسے طلاق دیکر الگ کر دیتے؟ خط کشیدہ الفاظ "بجز اس کے جس کو آپ سے محبت ہو جاتی" میں تو بڑی خطرناک بات کہدی گئی، کیا عام طور پر عورتوں کو حضرت حسنؓ جیسے محبوب النبی شخص سے نفرت ہی رہتی تھی؟ اور پھر لطف یہ کہ عام طور پر عورتوں کو ان سے محبت نہ ہونے، اور حضرت علیؓ کے اہل کوفہ سے اس کہنے کے باوجود کہ "تم میرے بیٹے حسنؓ کو لڑکیاں نہ دو"، ان کو لڑکیاں ملتی رہیں، وہ نکاح کرتے رہے اور طلاق پر طلاق دیتے رہے؟ کیا یہ تسلیم کر لینا درست ہوگا کہ حضرت حسنؓ دین کے مزاج سے واقف نہ تھے؟ ان کو نکاح کے مقصد اصلی سے واقفیت نہ تھی؟ اور ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان ابغض الحلال عند اللہ الطلاق[1] (حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے) کا علم نہ تھا؟ یا یہ کہ علم کے باوجود وہ اسے نظرانداز ہی کرتے رہے؟

یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ طلاقیں تو حضرت حسنؓ دیا کرتے تھے اور اس کی ذمہ داری ان عورتوں پر ڈالی جا رہی ہے جن کو طلاق دی گئی کہ وہ حضرت حسنؓ سے محبت کرنے والی نہ تھیں؟ ہمارے ایمان اور ضمیر اس کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ حضرت حسنؓ جیسے لائق فخر شوہر کو پانیوالی عورتیں اپنی قسمت پر ناز کرنے کے بجائے ان سے محبت نہ کر کے ایسا ماحول بناتی ہوں گی کہ حضرت حسنؓ ان کو طلاق دیدیا کرتے ہوں گے، طلاق کی شرعی حیثیت "ایک ضرورت" کی ہے، اور کسی بھی معاشرہ میں اسے "قابل فخر نسبت" نہیں گردانا گیا، پھر ان عورتوں کے پیش نظر کون

---

[1] ابوداؤد شریف

سادیجی یا دنیاوی نفع ہوتا تھا جو پہلے تو حضرت حسنؓ سے نکاح کریں اور پھر ان سے محبت نہ کر کے ان کو طلاق دینے پر مجبور کر دیتیں؟ ایک دو عورتوں کی بات ہوتی تو قابلِ یقین بات ہو بھی سکتی تھی لیکن جب معاملہ "بہت طلاق دینے" کا ہو، اور حضرت حسنؓ سے طلاق پانے والی عورتوں کی تعداد سیکڑوں میں بیان کی جا رہی ہو تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ "اس فضیلت" کے پردے میں حضرت حسنؓ کی کیسی گھناونی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔

اُردو ہی کے ایک دوسرے مؤرخ نے "بڑی احتیاط" سے کام لیتے ہوئے "طلاق" کی بات تو نہیں لکھی۔ لیکن بات گھما کر انھوں نے بھی یہی "افسانہ" بیان کرنا چاہا ہے، چنانچہ تحریر کرتے ہیں:-

"آپ نے بہت سی شادیاں کیں، عام روایتوں کے مطابق تو آپ کی بیویوں کی تعداد مبالغہ آمیز حد تک پہونچ جاتی ہے، لیکن اتنا صحیح ہے کہ آپ کے حبالۂ عقد میں بہت سی عورتیں آئیں[1]"

تعجب ہے کہ "عام روایتوں" میں بیان کی گئی تعداد کو مبالغہ آمیز تسلیم کرنے کے بعد، لیکن اتنا صحیح ہے .... کہہ کر پھر "بہت سی عورتوں" کے حضرت حسنؓ کے حبالۂ عقد میں آنے کی تصدیق کر دی گئی۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے کہ مؤلف کی نظر میں وہ "عام روایتیں" کون سی ہیں، جن پر اعتماد نہ کر کے انھوں نے "صحیح روایتوں" کے ذریعہ "بہت سی عورتوں کے" حبالۂ عقد میں آنے کی بات اس قدر جزم و یقین کے ساتھ کہی ہے؟ اور اس سلسلہ میں "عام و صحیح" کا فیصلہ صادر کرنے کے لئے ان کا پیمانہ کیا ہے؟ کیونکہ مؤلف نے نہ کسی "عام روایت" کے لئے کوئی حوالہ دیا ہے نہ ہی "صحیح روایت" کے لئے۔

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل ص ۳۹۰ - از شاہ معین الدین احمد ندوی

واقعہ یہ ہے کہ حوالہ دیں تو کس کا؟ شیعی کتاب نہج البلاغہ کے شیعی شارح ابن ابی الحدید کا، جس نے حضرت حسنؓ کے ستر عورتوں کو طلاق دینے کا ذکر کیا ہے؟ یا قوت القلوب کے معتزلی[1] مصنف ابوطالب محمد بن علی کا، جس نے ڈھائی سو اور تین سو بیویوں کا ذکر کیا ہے؟ اگر یہ یا اس جیسے دوسرے غیر معتبر حوالے نقل کریں تو "سبائی سازش" کا حال ظاہر ہو جائے، اور اگر اعتبار کی شرط کے ساتھ حوالے دینا چاہیں تو لائیں کہاں سے؟ اس لئے ہمارے ان مؤرخین نے ایسی باتیں "روایت و درایت" کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر بس بیان کر دیں اور یہ خیال نہیں کیا کہ اس سے کیسی کیسی شخصیتیں مجروح ہو جائیں گی۔ بعد کی نسلوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے، اور دشمنان اسلام کو ہوا خیزی کے لئے کیسے کیسے مواقع مل جائیں گے؟ اسی گرفت سے بچنے کے لئے چودھویں صدی کے ایک مشہور "مؤرخ و محقق" نے بڑی عجیب بات کہی ہے کہ:۔

"یہ شرائط اگر تاریخی واقعات کے معاملہ میں لگائی جائیں، تو اسلامی تاریخ کے ادوار مابعد کا تو سوال ہی کیا ہے، قرن اول کی تاریخ کا بھی کم از کم ۹/۱۰ حصہ غیر معتبر قرار پا جائے گا"۔[2]

یعنی "اسلامی تاریخ" کو بچانے کی خاطر روایت و درایت کے ان اصولوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے جو ائمہ جرح و تعدیل نے روایات کو رد یا قبول کرنے کیلئے ضروری قرار دیئے ہیں، اور تاریخ کے نام سے ہر "رطب و یابس" کو قبول کر لینا

---

[1] علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے قوت القلوب کے مصنف کے بارے میں لکھا ہے۔ و ذکرہ الندیم فی مصنفی المعتزلۃ (ندیم نے اس کا ذکر معتزلی مصنفین کی فہرست میں کیا ہے) لسان المیزان ج ۵ ص ۳۰۰۔

[2] خلافت و ملوکیت ص ۳۱۸۔

چاہیئے، ورنہ قرن اول کی تاریخ کا بھی ۹/۱۰ حصہ غیر معتبر قرار پا جائے گا۔ سبحان اللہ یہ بھی کیا انداز فکر ہے کہ چاہے صحابۂ کرام کا تقدس پامال ہو جائے، اور تربیت نبوی پر حرف آجائے، لیکن "اسلامی تاریخ" کے نام سے بیان کی جانے والی ہر جھوٹی سچی بات معتبر قرار پا جائے؟ اِنَّ ھٰذَا الشَّيْءٌ عَجِيْبٌ۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کو مطلاق قرار دیکر ان پر بکثرت عورتوں کو طلاق دینے کا الزام ان "سبائیوں" نے ہی لگایا ہے جن کو حضرت حسنؓ سے صرف یہ شکایت تھی کہ انھوں نے حضرت معاویہؓ سے صلح کرکے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کو جنگ و جدال سے کیوں بچالیا؟ وہ حسنؓ کو نسبی حیثیت سے مجروح کر نہیں سکتے تھے، البتہ ان کی "اعتباری حیثیت" مجروح کرنے کے لئے اس قسم کے افسانے گڑھ دیئے، جہاں تک حضرت حسنؓ کی واقعی بیویوں کا معاملہ ہے تو معتبر روایات کے مطابق مختلف اوقات میں ان کے نکاح میں آنیوالی عورتوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد آٹھ بیان کی گئی ہے، ان میں سے بعض کو آپ نے طلاق بھی دی ہے، جیسے خثمیہ کو۔[1] اور یہ تعداد یقیناً ایسی نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر ان کو "بہت سی عورتوں سے نکاح کرنیوالا یا عورتوں کو بہت طلاق دینے والا" کہا جا سکے۔

جوانان جنت کے سردار

ترمذی میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان الحسن والحسین سید اشباب اھل الجنة[2] (بیشک حسنؓ و حسینؓ جوانان جنت کے سردار ہیں)

---

[1] السنن الکبریٰ ج ۷ ص ۲۵۷ باب المتعۃ [2] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹۔

بعض حضرات نے اس روایت کی سند اور متن دونوں پر اعتراض کرتے ہوئے اپنا یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ "یہ روایت قطعاً قابل قبول نہیں ہے"۔

روایت کی سند میں تین راویوں اسرائیل بن ابی اسحاق، میسرہ بن حبیب اور منہال بن عمرو پر کلام کرتے ہوئے انھیں ناقابل اعتماد گردانا گیا ہے، جہاں تک پہلے راوی اسرائیل کا معاملہ ہے تو خود معترض نے بیان کیا ہے کہ امام احمد، ابوحاتم امام نسائی، امام بخاری، امام مسلم اور عبدالرحمٰن بن مہدی اسے ثقہ قرار دیتے ہوئے اس کی روایات قبول کرتے تھے، البتہ یحییٰ بن سعید القطان، یعقوب بن شیبہ، علی المدینی، ابن سعد اور ابن حزم اسے ضعیف قرار دیتے تھے۔

اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس راوی کو ثقہ قرار دیکر اس کی توثیق کی ہے، ان کی رائے کو نظر انداز کیوں کیا گیا؟ خصوصاً بخاری و مسلم کے اعتماد کا حال بیان کرتے ہوئے امام ذہبی[1] اپنی رائے تحریر کرتے ہیں:۔

قلت اعتمدہ البخاری ومسلم فی الاصول وھو فی الثبت کالاسطوانۃ فلا یلتفت الی تضعیف من ضعفہ	میں کہتا ہوں کہ بخاری و مسلم نے اصول میں اس پر اعتماد کیا اور وہ اعتماد کے معاملہ میں ستون کی طرح ہے تو جن لوگوں نے اس کی تضعیف کی ہے ان کی طرف التفات نہیں کیا جائیگا۔
(میزان الاعتدال جلد ا ص ۲۰۸)	

پھر جن لوگوں نے اس راوی کی تضعیف کی ہے وہ تضعیف بھی بہت ہلکے انداز کی ہے اور کسی عیب سے متہم نہیں کیا ہے۔

یہی حال تیسرے راوی منہال بن عمرو کا ہے کہ ان کے بارے میں معترض خو

---

[1] امام ذہبی کی میزان الاعتدال ہی سے معترض نے تمام اقوال نقل کئے ہیں۔

نقل کرتے ہیں کہ مسلم کے علاوہ تمام مصنفین صحاح نے اس سے روایات لی ہیں یحییٰ بن معین اور احمد العجلی نے اسے ثقہ قرار دیا ہے امام احمد بھی اسے ثقہ کہتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ ابوبشر اس سے بھی زیادہ ثقہ ہے، البتہ یحییٰ بن سعید القطان اور ابن حزم نے اس پر نکتہ چینی کی ہے، اور جوزجانی نے کہا ہے کہ یہ بدترین مذہب (شیعہ) رکھتا تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم صحاح کے ایک مقبول راوی کو صرف جوزجانی کے شیعہ کہدینے کی وجہ سے شیعہ باور کرلیں، اور امام احمد، یحییٰ بن معین اور خود امام بخاری کی توثیق کو ناقابل اعتنا گردانیں۔

جہاں تک درمیانی راوی میسرہ بن حبیب کا تعلق ہے تو معترض نے ان کے سلسلہ میں ائمہ جرح و تعدیل کی کوئی رائے نقل نہ کرکے صرف اپنا فیصلہ سنایا ہے کہ "وہ بھی صرف کام چلاؤ ہے" لہذا اس پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے

خلاصہ یہ ہے کہ سند کے اعتبار سے اس روایت میں ایسا کوئی نقص نہیں ہے کہ اسے یکسر رد کرتے ہوئے ناقابل قبول گردانا جائے۔

رہا متن کے بعض اجزا پر عقلی اعتراضات کا معاملہ اور اسے خلاف عقل قرار دینے کی بات، تو اس سلسلہ میں اتنا ہی عرض کردینا کافی ہے کہ عقل کی رسائی پر اتنا اعتماد کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

پھر اگر درایۃً نقد کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو بھی اس کا تعلق حضرات حسنینؓ کے سلسلہ کی بشارت سے نہیں ہے۔

اور اگر معترض کے تمام اعتراضات کو من و عن تسلیم کرتے ہوئے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ روایت قطعاً قابل قبول نہیں ہے تو ترمذی کے اسی باب کی پہلی ہی روایت میں جس کے راوی حضرت ابوسعید خدریؓ ہیں بعینہٖ یہی الفاظ الحسن والحسین سید ا شباب اهل الجنة[1] (حسنؓ و حسینؓ جوانان جنت

[1] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۸

کے سردار ہیں) موجود ہیں۔ اور امام ترمذی نے اپنی دو سندوں سے اس متن کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ھٰذا حدیث صحیح حسن (یہ حدیث صحیح حسن ہے) امام ترمذی ہی کی اس روایت کو نقل نہ کرکے حضرت حذیفہؓ والی روایت کو نقل کرنا، اور پھر اس حدیث پر روایتاً و درایتاً زبردستی نقد کرکے یہ فیصلہ صادر کرنا کہ "یہ روایت قطعاً ناقابل قبول ہے"، ایک ایسی جرأت ہے جسے انکار حدیث کے سوا کسی دوسرے نام سے نہیں یاد کیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات حسنینؓ کو جوانانِ جنت کا سردار قرار دیا ہے، اور یقیناً یہ ان دونوں بزرگواروں کو بڑی فضیلت ہے اب رہا یہ سوال کہ جنّت میں تو سب ہی جوان ہوں گے، وہاں تو کوئی ادھیڑ یا بوڑھا نہ ہوگا، پھر کیا حضرات حسنینؓ ان تمام اہل جنت کے سردار ہوں گے جن میں انبیاءِ کرامؑ، اور خلفائے راشدینؓ بھی ہوں گے؟ تو اس سوال کا ایک عام جواب تو یہ ہیکہ "جوانانِ جنت" سے مراد وہ جنتی لوگ ہیں جو دنیا سے جوانی کے عالم میں رخصت ہوئے، ایسے جوانانِ جنت کے سردار حضرات حسنینؓ ہوں گے، اور چونکہ انبیائے کرامؑ اور خلفائے راشدینؓ میں سے کوئی بھی اس دنیا سے جوانی کی حالت میں رخصت نہیں ہوئے اس لئے ان میں سے کوئی اس حکم میں داخل نہ ہوگا۔

لیکن اس جواب پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خود حضرات حسنینؓ اس دنیا سے جوانی کے عالم میں رخصت نہیں ہوئے، پھر ان کے ایسے جوانوں کے سردار ہونے کا کیا مطلب؟ دوم یہ کہ اس میں ان دونوں کی فضیلت صرف ایسے جنتیوں ہی پر ثابت ہوتی ہے جو دنیا سے جوانی کی عمر میں رخصت ہوئے، حالانکہ وہ تو بہت سے ان جنتیوں سے بھی افضل ہیں جن کی وفات بڑھاپے میں ہوئی یا ہوگی؟ اس لئے مناسب یہ ہے کہ حدیث میں وارد لفظ شباب سے فتوۃ یعنی کرم کے معنیٰ

لئے جاتا ہے جیسے ہمارے اُردو محاورہ میں "جواں مرد" کا لفظ استعمال ہوتا ہے کہ اس سے مراد جوان العمر نہیں بلکہ جواں ہمت اور عالی حوصلہ ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہیکہ حدیث صحیح کی بشارت کے مطابق حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ جنتی لوگوں کے سردار ہونگے لیکن تمام انبیائے کرامؑ اور خلفائے راشدینؓ کے مراتب بہرحال ان سے بلند ہیں، اور یقینی طور پر اس بشارت کے عموم میں یہ حضرات داخل نہیں ہیں۔

حضرت حسنؓ کی صحابیت

حضرت حسنؓ کی مظلومیت کا یہ انداز بھی قابل توجہ ہیکہ اگر ایک طرف ان کے محیر العقول فضائل بیان کرنے والے لوگ ہیں تو دوسری طرف وہ بھی کہ جو ان کے مسلّم فضائل کو بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں، چنانچہ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو تاریخی چیستانوں میں الجھا کر یہ دعوی کرتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کو صحابیت کا شرف حاصل نہ تھا، ملاحظہ کیجئے کہ حضرت حسنؓ کی صحابیت کے انکار کے لئے کیا دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت حسنؓ کی ولادت کے وقت حضرت اسماؓ بنت عمیس نے دایہ گیری کی خدمت انجام دی تھی، اور بخاری کی ایک حدیث سے جس کے راوی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں یہ ثابت ہے کہ حضرت اسماؓ بنت عمیس ۷ھ میں فتح خیبر کے موقع پر حبشہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئی تھیں ان دونوں باتوں کو ملانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت حسنؓ کی ولادت ۷ھ سے پہلے نہ ثابت ہو سکے گی، کیونکہ جب ۷ھ سے پہلے حضرت اسماؓ مدینہ میں موجود ہی نہ تھیں تو وہاں دایا گیری کی خدمت کیسے انجام دیتیں؟۔

۲۔ بخاری شریف جلد ا صفحہ ۵۰۱ میں ایک حدیث ہے، جس میں حضرت

لے لمعات ملخصاً بر حاشیہ ترمذی

ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت کا ذکر ہو رہا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:۔

صلی ابو بکر العصر ثم خرج	ابوبکرؓ نے عصر کی نماز پڑھائی[1]، پھر باہر نکلے
یمشی فرأی الحسن یلعب	تو دیکھا کہ حسنؓ بچوں کے ساتھ کھیل رہے
مع الصبیان فحملہ علیٰ	ہیں ابوبکرؓ نے انھیں اپنے کاندھے پر اٹھا
عاتقہ وقال بابی شبیہ بالنبی	لیا اور فرمایا میرے ماں باپ قربان یہ تو نبی
صلی اللہ علیہ وسلم لاشبیہ	کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہے علی کے
بعلی وعلی یضحک	مشابہ نہیں، اور علیؓ ہنس رہے تھے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں حضرت حسنؓ اتنے کم سن بچہ تھے کہ حضرت ابوبکرؓ جیسے ضعیف العمر اور لاغر انسان نے انھیں کاندھے پر اٹھالیا، اور کاندھوں پر زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کے بچے ہی کو اٹھایا جاتا ہے نہ کہ نو دس سالہ بچہ کو۔ پھر یلعب مع الصبیان کے جملہ سے بھی حضرت حسنؓ کی کم سنی ظاہر ہو رہی ہے، کیونکہ جب بچہ ہر بات کو سمجھنے لگتا ہے تو عربی میں اسے صبی نہیں کہتے بلکہ غلام کہتے ہیں۔

۳۔ اگر بچہ سات، آٹھ سال کا ہو تو اس کے حافظہ میں اپنے قریبی اور چاہنے والوں کا حلیہ پورے طور پر محفوظ رہتا ہے، اور اگر اس سے کم عمر کا ہو تو آہستہ آہستہ وہ حلیہ ذہن سے نکل جاتا ہے، شمائل ترمذی اور انساب الاشراف جلد ۲ صفحہ ۳۸۲ میں مذکور ہے کہ حضرت حسنؓ نے حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ معلوم کیا اور انھوں نے بتایا، اور ظاہر ہے کہ حلیہ دریافت کرنا اسی لئے تھا کہ خود

---

[1] صلی کا ترجمہ پڑھی بھی ہو سکتا ہے "پڑھائی" ترجمہ اسی لئے کیا گیا تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ یہ واقعہ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت کا ہے۔

حضرت حسنؓ کو حضورؐ کا حلیہ یاد نہ تھا، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت حسنؓ سات، آٹھ سال سے بھی کم عمر کے بچے تھے۔

۴۔ بخاری جلد ا صفحہ ۵۳۲ کے حاشیہ میں کرمانی کے حوالہ سے مذکور ہے،

انکحها رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد وقعة احد — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ کا نکاح علیؓ سے جنگ احد کے بعد کیا۔

اور جنگ احد شوال ۳ھ میں ہوئی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت حسنؓ کے والدین کا نکاح ۳ھ کے آخر یا ۴ھ کی ابتدا میں ہوا، پھر عام مؤرخین کا یہ بیان کیسے درست ہو سکتا ہے کہ حضرت حسنؓ کی ولادت ۳ھ میں ہوئی؟ (اس حساب سے بھی ان کی ولادت ۴ھ کے آخر سے پہلے ہو ہی نہیں سکتی)

۵۔ شیعہ مصنف ملا باقر مجلسی کی اپنی کتاب جلاء العیون میں بیان کردہ تفصیلات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت حسنؓ اپنے والدین کی اولاد میں سب سے بڑے نہ تھے، بلکہ ان کی بہن حضرت ام کلثوم (زوجہ حضرت عمرؓ) سب سے بڑی تھیں، پھر ان کے بعد حضرت محسنؓ کی ولادت ہوئی (جن کی وفات کم سنی ہی میں ہو گئی) اور تیسرے نمبر پر حضرت حسنؓ کی ولادت ہوئی۔

ان تمام حقائق سے معلوم ہوا کہ حضرت حسنؓ کی ولادت ۳ھ میں نہیں بلکہ ۸ھ میں ہوئی۔ اور نہ ہی وہ اپنے والدین کی اولاد میں سب سے بڑے تھے نہ ہی ان کو صحابیت کا شرف حاصل تھا۔

حضرت حسنؓ کی تاریخ ولادت کے سلسلہ میں درج بالا دلائل اور پھر ان سے اخذ کردہ اس نتیجہ کہ "حضرت حسنؓ کی ولادت ۸ھ میں ہوئی" پر بحث کرنے سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ صحابی کس کو کہتے ہیں؟ اور صحابیت کے لئے عمر کی کوئی قید

بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کیا؟ کیونکہ حضرت حسنؓ کی ولادت سنہ ھ میں ولادت ثابت کرکے یہی دعویٰ کیا گیا ہے کہ چونکہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بہت کم سن تھے اس لئے ان کو صحابیت کا شرف نہیں حاصل ہوا؟۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی صحابی کی تعریف یوں کرتے ہیں، اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں:۔

والصحابي من لقي النبي صلی الله عليه وسلم مؤمنا به و مات على الاسلام فيدخل فى من لقيه من طالت مجالسه اوقصرت ومن روى عنه اولم يرو ومن غزا معه او لم يغز ومن رآه رؤية ولو لم يجالسه ومن لم يره لعارض كالعمىٰ۔

(مقدمة الاصابة ج ۱ ص ۴)

اور صحابی وہ شخص ہے جس نے ایمان کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو اور اسلام ہی پر اس کی موت ہوئی ہو اس تعریف میں ہر وہ شخص داخل ہے، جس نے آپ سے ملاقات کی، اسے آپ کی طویل ہم نشینی ملی ہو یا کم، اس نے آپ سے روایت کی ہو یا نہ کی ہو، اور آپ کے ساتھ جہاد کیا ہو یا نہ کیا ہو، اور وہ بھی جس نے ایک نظر آپ کو دیکھ لیا، اگرچہ اسے آپ کی ہم نشینی بھی نہ ملی ہو، اور وہ بھی جو کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کو دیکھ نہ سکا ہو جیسے اندھاپن۔

اس تعریف کے لحاظ سے صحابیت کے لئے صرف دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے اول یہ کہ ایمان کی حالت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی ہو۔ دوم یہ کہ ایمان ہی کی حالت میں زندگی کا خاتمہ ہوا ہو، ان دو کے علاوہ صحابی ہونے کے لئے کوئی تیسری شرط نہیں ہے، نہ عمر کی، نہ روایت کی، نہ حضور کے ساتھ جہاد

میں شرکت کی، نہ ہی آپ کی ہم نشینی کی، اور نہ کوئی اور۔

اسی طرح ملازادہ نے صحابی کی تعریف یوں کی ہے:۔

الاصحاب جمع صاحب او جمع صحب مخفف صحب بمعنیٰ صاحب وھو من رأی النبی علیہ السلام مؤمنا بہ سواءٌ کان فی حال البلوغ او قبلہ قال صحبتہ ام لا۔ ؎	اصحاب، صاحب کی جمع ہے یا صحب کی جمع ہے جو کہ صحب بمعنیٰ صاحب کا مخفف ہے، اور وہ ایسا شخص ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہوئے ان کو دیکھا ہو، چاہے زمانۂ بلوغ میں دیکھا ہو یا اس سے پہلے، اس نے یہ کہا ہو کہ میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے یا نہ کہا ہو۔

اس تعریف میں بھی صحابی ہونے کے لئے ایمان کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو کافی قرار دیا گیا ہے، چاہے وہ زیارت کسی بھی عمر میں ہوئی ہو، بالغ یا نابالغ ہونے کی کوئی قید نہیں ہے۔

اب کیا یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضرت حسنؓ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی؟ حضرت حسنؓ کی تو آپ سے نہ صرف ملاقات ہونا، بلکہ ان کی تحنیک ؎ کرنا، ان کا نام رکھنا، ان کو گود میں کھلانا، کاندھے پر سوار کرنا، اور ان کے بارے میں مختلف قسم کی بشارتیں دینا، صحیح احادیث سے ثابت ہے، پھر ان کی صحابیت کا کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے؟ علامہ ابن حجرؒ نے تو عہد رسالت میں صحابہؓ

؎ حاشیہ شرح العقائد للنسفی ص ۱۶۱ ؎ تحنیک یعنی یہ عمل کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھجور چبا کر اس کا لعاب مبارک بچہ کو چٹاتے تھے۔

کرام کے پیدا ہونے والے تمام بچوں کو اس حسن ظن کی بنا پر صحابہؓ میں شمار کیا ہے کہ صحابۂ کرام اپنے نومولود بچوں کو آپ کی خدمت میں لاتے تھے، آپ ان کی تحنیک فرماتے نام رکھتے، اور ان کے حق میں دعائے خیر فرماتے، لہٰذا صحابہؓ کے جو بچے بھی عہد نبوی میں پیدا ہوئے ان کے بارے میں گمان غالب یہی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کو ضرور دیکھا ہوگا، اور بس ان کے صحابی ہونے کے لئے یہی کافی ہے[1]۔

ایسی صورت میں اگر اس دعویٰ کو بھی تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت حسنؓ کی ولادت سنہ ۷ھ میں ہوئی تو بھی بس یہی ثابت ہو سکے گا کہ سنہ ۱۱ھ میں حضور علیہ السلام کی وفات کے وقت حضرت حسنؓ کی عمر ۸ سال نہیں بلکہ ۴ سال کی تھی۔ اور مشہور و مرجح قول کے مطابق جس طرح ۸ سال عمر ہونے میں ان کی صحابیت ثابت ہے اسی طرح ۴ سال عمر تسلیم کر لینے میں بھی ان کی صحابیت پر کچھ اثر نہیں پڑیگا۔

البتہ بعض حضرات نے صحابی ہونے کے لئے ایمان کے ساتھ طویل صحبت ہونے کی بھی قید لگائی ہے، تو اولاً تو یہ قول مشہور و معتبر علمائے حدیث، مثلاً امام احمد، امام بخاری، حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ ابن عبدالبر، ملا علی قاری ملازادہ اور تمام محدثین کے خلاف قول مرجوح ہے، پھر اگر اسی قول مرجوح پر اعتماد کر کے حضرت حسنؓ کی صحابیت کا انکار مقصود ہے تو اس کے لئے سنہ ۷ھ میں ان کی ولادت ثابت کرنے کی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ سنہ ۳ھ کی ولادت کے مشہور قول کے مطابق بھی وفات نبوی کے وقت ان کی عمر ۸ سال ہی ثابت ہوگی، اور ظاہر ہے کہ طویل صحبت کے لئے کوئی میعاد نہیں مقرر کی گئی ہے اس لئے اگر ۴ سال کی شبانہ روز صحبت "طویل صحبت" نہیں کہلا سکتی، اور اس سے صحابیت کا ثبوت نہیں ہو سکتا، تو یہی بات ۸ سال کی صحبت کے لئے بھی

---

[1] الاصابہ ج ۱ ص ۴ ۔

کہی جا سکتی ہے، بعض دوسرے لوگوں نے صحابی ہونے کے لئے یہ قید لگائی ہیکہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہو، اس قید کے لحاظ سے بھی حضرت حسنؓ کی صحابیت ثابت ہے، کیونکہ احادیث کی کتابوں میں ان کی کم ازکم ۲ مرفوع روایتیں تو ایسی ملتی ہیں جن کو انھوں نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے، ان میں سے دو کو السنن الکبریٰ سے ہم اس جگہ نقل کئے دیتے ہیں:۔

۱۔ علمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی وتری اذا رفعت راسی ولم یبق الا السجود اللهم اهدنی الخ[1] (حضرت حسنؓ فرماتے ہیں) مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر میں جب میں نے اپنا سر (رکوع) سے اٹھا لیا اور سجدہ کے سوا کچھ باقی نہ تھا، یہ دعا تعلیم کی اللهم اهدنی الخ۔

۲۔ قلت للحسن بن علی ما تذکر من النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کان یقول دع ما یریبک الی ما لا یریبک الخ (ابو الحوراء کہتے ہیں کہ میں نے حسنؓ بن علیؓ سے پوچھا کہ آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی کوئی بات یاد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ حضورؐ فرماتے تھے کہ دع ما یریبک[2] الخ۔

خلاصہ یہ ہے کہ محدثین اور فقہاء واصولیین نیز اہل لغت سب کی تعریف کے مطابق حضرت حسنؓ کا صحابی ہونا ثابت ہے، اس کے باوجود بھی کوئی شخص ان کی صحابیت کا انکار کرے تو اسے ہم ایک "گستاخانہ جرأت" کے سوا اور کس نام سے یاد کر سکتے ہیں؟

اب آئیے ذرا حضرت حسنؓ کے سنہ ولادت کے سلسلہ میں بحث ہو جائے۔

---

[1] السنن الکبریٰ ج ۳ ص ۳۸-۳۹ للبیہقی [2] السنن الکبریٰ ج ۵ ص ۳۳۵۔

جہانتک حضرت حسنؓ کی تاریخ ولادت کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سلسلہ میں متعدد قول ہیں، لیکن مشہور اور اصح قول یہی ہیکہ آپ کی ولادت ۳ھ میں ہوئی، چنانچہ صاحب مشکوٰۃ المصابیح شیخ ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب تحریر فرماتے ہیں :-

ولد فی النصف من شهر	نصف رمضان ۳ھ میں ولادت ہوئی
رمضان سنة ثلث من الهجرة	اور یہ ان کی ولادت کے اقوال میں سب
وهو اصح ما قيل في ولادته[1]	سے صحیح قول ہے۔

اب رہا ۴ھ میں ولادت کا معاملہ، تو اس سلسلہ میں صرف ایک دلیل ایسی ہے جس کی صحت ثابت ہو جائے تو یہی قول سب سے معتبر قرار پائے گا، اور وہ دلیل وہی ہے جس کو دلائل کی فہرست میں نمبر ۱ پر درج کیا گیا ہے، لیکن اس دلیل میں جن دو مقدمات کو جوڑ کر نتیجہ اخذ کیا گیا ہے ان میں کا پہلا مقدمہ یعنی "مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت حسنؓ کی ولادت کے وقت حضرت اسماءؓ بنت عمیس نے دایہ گیری کی خدمت انجام دی تھی" محتاج ثبوت ہے، کیونکہ الاستیعاب، الاصابة، اسد الغابة جیسی سیر اصحابؓ کی کتابوں اور البداية والنهاية اور الکامل جیسی متداول تاریخی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، پھر کن مورخین کا اس پر اتفاق ہے؟ اور اگر کسی ایک یا چند مؤرخین نے یہ روایت نقل بھی کی ہو تو اس روایت کی چھان پھٹک سے پہلے اس کی صحت کا کیوں کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ اس روایت پر بحث کرنے کے بجائے اس کو ایک "تسلیم شدہ حقیقت" کی حیثیت سے پیش کر کے صحیح بخاری کی حدیث

---

[1] الکمال فی اسماء الرجال تحت ذکر الحسن بن علیؓ ص ۵۹۰۔

کے ذریعہ حضرت اسمأؓ کا سنہ میں مدینہ آنا بیان کرنا، اور پھر دونوں چیزوں کو ملا کر سنہ میں حضرت حسنؓ کی ولادت کا نتیجہ نکالنا، انتہائی مضحکہ خیز ہے، ضروری ہے کہ پہلے اس بات کا ناقابل انکار ثبوت فراہم کیا جائے کہ حضرت حسنؓ کی ولادت کے وقت حضرت اسمأؓ بنت عمیس نے دایہ گیری کی خدمت انجام دی تھی، تب ہی سنہ میں ان کی ولادت کی بات کہی جاسکتی ہے، خصوصًا ایسی صورت میں جبکہ حضرت حسنؓ کی سنہ میں ولادت کی بات اب تک کسی معتبر مؤرخ اور سوانح نگار نے نہیں کہی ہے۔

اس ایک دلیل کے علاوہ جو بھی دلیلیں دی گئی ہیں، ان کو دلیلیں کہنا ہی مناسب نہ ہوگا، کیونکہ ان دلیلوں میں واقعات کی من مانی تشریح کے علاوہ اپنی خواہش اور مفروضہ کے مطابق تحریف سے بھی کام لیا گیا ہے جس کی تفصیل ترتیب وار حسب ذیل ہے۔

دلیل ۲ میں بخاری شریف کی حدیث نقل کرتے ہوئے اپنی طرف سے وہ عبارت بڑھادی گئی جو خط کشیدہ ہے، اور جس سے تأثر دینا مقصود ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے دورِ خلافت کا ہے، جبکہ بخاری نے اس حدیث کو کتاب المناقب کے باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذیل میں درج کیا ہے اور الفاظ حدیث میں بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں ہے کہ یہ واقعہ خلافت صدیق اکبرؓ کے دور کا ہے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں کسی روز حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے ہوں اور حضرت حسنؓ کو بچوں کے ساتھ کھیلتا دیکھ کر ان کو کاندھے پر اٹھالیا ہو؟ پھر لطف یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا بھی آخر دور مراد لیا گیا ہے، کیونکہ اس واقعہ کے وقت حضرت حسنؓ کی عمر نو، دس سال بیان کرتے ہوئے یہ "قاعدہ کلیہ" پیش کیا گیا ہے کہ "کاندھوں

پر چار یا پانچ سال کے بچہ ہی کو اٹھایا جاتا ہے نہ کہ نو، دس سالہ بچہ کو، حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت ۲ سال ۳ ماہ ۱۰ دن ہے اور رمضان ۳ھ میں ولادت کے قول کے لحاظ سے بھی حضرت حسنؓ کی عمر حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے وقت پورے دس سال کی نہ تھی، اس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ واقعہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے آخر زمانہ کا ہے؟ اور اگر ان ساری تفصیلات کو درست ہی مان لیا جائے تو کیا شفقت ومحبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر تو، دس سالہ بچہ کو کاندھوں پر اٹھا لینا محال ہے؟ رہ گیا حضرت ابوبکرؓ کی ضعیف العمری اور لاغری کا حوالہ دینا، تو یہ بھی بس بات میں زور پیدا کرنے کے لئے ہے، ورنہ حضرت ابوبکرؓ وہی ہیں جو شب ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شانوں پر سوار کر کے جبلِ ثور پر چڑھ گئے تھے، پھر کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۸، ۹ سالہ نواسہ کو اپنے کاندھوں پر نہیں اٹھا سکتے تھے؟ اسی طرح یلعب مع الصبیان کے جملہ سے اس بات پر استدلال کرنا کہ چونکہ عربی میں اس بچہ کو صبی نہیں بلکہ غلام کہتے ہیں جو ہر بات کو سمجھنے لگے لہٰذا حضرت حسنؓ کے لئے صبی کے لفظ کا استعمال اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ وہ اس وقت چار ہی سال کے تھے، درست نہیں ہے، کیونکہ اولاً تو اس روایت میں خود حضرت حسنؓ کو صبی نہیں کہا گیا ہے بلکہ یلعب مع الصبیان کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، تو کیا یہ ضروری ہے کہ کم سنی میں کھیلنے والے سارے بچے ہم عمر بھی ہوں، ان میں باہم ۲-۴ سال کی عمر کا فرق نہیں ہو سکتا؟ پھر صبی اور غلام کا عربی میں جو استعمال بتایا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، عربی کے مشہور ومتداول لغت مصباح اللغات میں ان دونوں لفظوں کے یہ معنی بیان کئے گئے ہیں۔

الصبی:- بچہ جو جوان سے کم عمر ہو۔ الغلام:- سبز خط۔ نوجوان۔

یعنی جوان سے کم عمر کے ہر بچہ کو صبی کہا جا سکتا ہے، چنانچہ جدید اصطلاح میں دفاتر میں اوپری کاموں کے کرنے والے لڑکے (آفس بوائے) کو صبی المکتب کہتے ہیں[۱]۔ اسی طرح الصبوۃ کے معنی بچپن اور جوانی کی نادانی، بیان کئے گئے ہیں[۲]۔

اس تفصیل کی روشنی میں یلعب مع الصبیان کے جملہ سے حضرت حسنؓ کی ۸ کے بجائے ۴ سال عمر ہونے پر استدلال کرنا کسی طرح درست نہیں کہا جا سکتا۔

اسی طرح دلیل ۳ کا معاملہ تو بالکل ہی "ہوائی" ہے، حضرت حسنؓ کے اپنے ماموں حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ سے حضور علیہ السلام کا حلیہ دریافت کرنے سے اس بات پر استدلال کرنا کہ چونکہ وہ سات، آٹھ سال سے بھی کم عمر کے تھے اس لئے ان کو حضورؐ کا حلیہ یاد نہیں رہا تھا، "مار و گھٹنا پھوٹے آنکھ" والا استدلال ہے، کیونکہ اس کا دارومدار اس "قاعدہ کلیہ" پر ہے کہ سات، آٹھ سال کے بچہ کو تو اپنے قریبی اور چاہنے والوں کا حلیہ یاد رہتا ہے، اور اس سے کم عمر والوں کو آہستہ آہستہ بھول جاتا ہے، معلوم نہیں یہ کس "علم نفسیات" کا فارمولا ہے، جس پر یہ عمارت کھڑی کر دی گئی کہ وفات رسولؐ کے وقت حضرت حسنؓ سات، آٹھ سال سے یقیناً کم تھے؟۔

دلیل ۴ کے سلسلہ میں یہ بات تو صحیح ہے کہ بخاری کے حاشیہ میں کرمانی کے حوالہ سے یہ مذکور ہے کہ "حضرت فاطمہؓ کا نکاح جنگ اُحد کے بعد ہوا"، لیکن یہ ایک قول ہے جس کے مقابلہ میں یہ بھی قول ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا نکاح ۲ھ کے رمضان میں جنگ بدر کے بعد ہوا، چنانچہ صاحب مشکوۃ المصابیح تحریر فرماتے ہیں۔

۱؎ القاموس الاصطلاحی ۲؎ مصباح اللغات

تزوجها علی بن ابی طالب فی السنة الثانية من الهجرة فی شهر رمضان وبنی علیها فی ذی الحجة [1]	حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کا حضرت علیؓ بن ابی طالب سے نکاح ۲ھ کے رمضان میں کیا اور ان کی رخصتی ذی الحجہ میں ہوئی،

علامہ نووی اور علامہ زرقانی نے بھی ۲ھ میں حضرت فاطمہؓ کے نکاح کی بات لکھی ہے [2]، ان دونوں قسم کے اقوال کی موجودگی سے یہی پتہ چلتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے نکاح کی تاریخ کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ یہ جنگ بدر کے بعد ۲ھ میں ہوا یا جنگ احد کے بعد ۳ھ میں، لیکن اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ ۲ھ میں ہوا۔ اور دیگر قرائن کے پیش نظر یہی قول راجح بھی ہے، ایسی صورت میں صرف کرمانی کے قول کو نقل کر کے یہ تاثر دینا کہ گویا ۳ھ میں جنگ احد کے بعد حضرت فاطمہؓ کا نکاح ہونا متفق علیہ ہے، اور پھر اُسے بنیاد بنا کر حضرت حسنؓ کے سنہ ولادت کی تعیین کرنا، خدا جانے "دیانت" کی کون سی قسم کہلائے گی؟۔

رہی دلیل ۵، تو نہ وہ اس جگہ ہمارے لئے قابل اعتناء ہے، نہ ہی اس سے استدلال کو ہم درست قرار دیتے ہیں۔ لیکن بخاری اور ترمذی کے ساتھ "جلاء العیون" کا پیوند لگانے سے یہ بات ضرور واضح ہو گئی کہ حضرت حسنؓ کی صحابیت کا انکار کرنیوالے بس کسی بھی طرح اپنے طے کردہ "موقف" کو ثابت کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، چاہے ان کو "معتبر" کے ساتھ "غیر معتبر" حوالوں کا جوڑ لگانا پڑے، چاہے کچھ باتیں اپنی طرف سے ٹانکنا پڑیں، اور چاہے "گمنام مؤرخین" کے حوالوں سے کام نکالنا پڑے، بہرحال ان کو کسی بھی طرح یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت حسنؓ صحابی نہ تھے،

---

[1] اکمال ص ٦١٣ تحت ذکر فاطمة الکبریٰ۔

[2] تهذيب الاسماء واللغات للنواوی۔ شرح مواهب لدنيه للزرقانی ج ٢ ص ٢٠٣۔

لیکن افسوس تو یہ ہیکہ اتنی محنت کرنے کے بعد بھی حضرت حسنؓ کی صحابیت پر تو کوئی آنچ نہ آئی، مگر دلوں کا وہ مرض ظاہر ہو کر رہا جسے کوئی اچھی علامت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

یوں اصولی حیثیت سے حضرت حسنؓ کی ولادت، یا ان کی صحابیت کو زیر بحث لانا کوئی جرم نہیں قرار دیا جا سکتا، اور حضرت حسنؓ کی تاریخ ولادت، یا صحابی کی تعریف کے اختلافی اقوال کو پیش کر کے روایت و درایت کے ذریعہ کسی قول کو ترجیح دینا بھی معیوب نہیں گردانا جا سکتا، لیکن مذکورہ بالا دلائل کے ذریعہ جس طرح "منصوبہ بند" طریقہ پر حضرت حسنؓ کی صحابیت کا انکار کر کے ان کی "تخفیف" کی سعی کی گئی ہے اسے ہرگز "سعی محمود" نہیں کہا جا سکتا۔

تبصرہ

حضرت حسنؓ کی سب سے بڑی مظلومیت یہی ہیکہ ایک گروہ نے ان کو "امام معصوم و مفترض الطاعۃ" کہنے کے باوجود ان کا استحصال کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، ان کی اطاعت کرنے کے بجائے ان پر اپنی اطاعت مسلط کرنے کی کوشش کی، اور جب اس کوشش میں ناکام ہوا تو انھیں مذلل المومنین اور عار المومنین کے خطاب دیئے، ان کا مال و اسباب لوٹا، اور ان کے قتل تک کے درپے ہوا، اور پھر ان کے بعد ان کی اولاد سے "امامت" سلب کر کے اپنے خیال کے مطابق ان کو "ان کے کئے کی سزا" دیدی۔

اس گروہ کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو حضرت حسنؓ کی ذات میں کوئی خوبی ماننے کو تیار ہی نہیں، ان کو مقتدیٰ و پیشوا کیا معنیٰ، ایک عام اخلاقی خوبیوں کے مالک انسان کا مقام دینے پر بھی آمادہ نہیں، محبوب رسولؐ وہ نہیں، صحابی رسول وہ نہیں، جوانان جنت کے سردار وہ نہیں، غرضیکہ ان کے تمام فضائل

افتخار خوبیوں کو یہ گروہ ان سے سلب کر لینا چاہتا ہے، حالانکہ ایمان واطاعت کے بعد حضرت حسنؓ کا یہ ایک بہت بڑا شرف ہے کہ وہ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے نواسے بلکہ آپ کی امیدوں کا مرکز تھے، اور تاریخ کی یہ وہ اٹل سچائی ہے جس کا انکار کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرسکتا، پھر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والوں کے لئے کسی بھی طرح یہ مناسب ہوگا کہ وہ حضرت حسنؓ کے سلسلہ میں تاریخ کے ان بے سروپا افسانوں پر اعتبار کرلیں جن سے ان کی حرمت پر آنچ آئے؟۔

نعوذ باللہ من شر الوسواس الخناس الذی
یوسوس فی صدور الناس



حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما

حضرت معاویہؓ کاتب وحی تھے، حضرت معاویہؓ اسلامی تاریخ کے پہلے امیر البحر تھے، جن کی قیادت میں سب سے پہلی دریائی جنگ لڑی گئی، اور حضرت معاویہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی سالے یعنی ام المومنین حضرت اُم حبیبہؓ کے بھائی تھے، ان تمام خوبیوں کے باوصف ان کی شخصیت کو مجروح کرنے اور ان کے "ناکردہ گناہوں" کی فہرست تیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم المرتبت اور "ہدایت یافتہ صحابی" کی طرف سے مسلمانوں کو بدظن کرنے کی جس طرح منظم انداز میں سازش کی گئی ہے، تاریخ شاید اس سے گھناونی اور بدنما مثال نہیں پیش کر سکتی۔

اگر حضرت معاویہؓ پر جادۂ حق سے انحراف کرنے، خانوادۂ رسالت کی بیحرمتی کرنے، خلافت اسلامیہ کی جگہ ملوکیت و بادشاہی نظام قائم کرنے اور موروثی حکومت کی داغ بیل ڈالنے جیسے الزامات ان دشمنانِ صحابہؓ ہی کی طرف سے عائد کئے جاتے جو سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا حضرت عمر فاروقؓ جیسے اکابر صحابہؓ پر بھی اپنی ملامت کے تیر برساتے نہیں ڈرتے تو چنداں حیرت و افسوس کی بات نہ ہوتی، لیکن حسرت تو ان "دوستوں" پر ہوتی ہے جو ایک طرف "صحابیت" کے بلند مقام کا اعتراف کرتے ہوئے اہل سنت وجماعت کے متفق علیہ عقیدے الصحابۃ کلھم

عــدول[1] (تمام اصحاب رسول عادل ہیں) کا دم بھرتے ہیں، اور دوسری طرف "مشاجرات

---

[1] چودہویں صدی کے ایک نامور اور خوش فکر محقق "نے عدالتِ صحابہؓ کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے یا ان کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں عادل تھے، یعنی روایت کے سلسلہ میں انھوں نے عدالت و راستبازی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا، رہ گیا ان کی عملی زندگی کا معاملہ تو اس میں ان سے لغزشوں اور گناہوں کا صدور بھی ہوا ہے اور پھر اس سلسلہ میں حضرت ماعزؓ اور غامدیہ وغیرہ کے واقعات پیش کر کے محقق موصوف نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ عدالت کا ان کا بیان کردہ مفہوم مراد لینے کے بعد صحابہؓ تنقید سے بالاتر نہیں رہتے اور ان کے "مشاجرات" کے درمیان "حکم" بن کر فیصلہ دینا کوئی معیوب بات نہیں قرار پاتی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ صرف روایت ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی عادل تھے، اور حق تعالیٰ نے ان کو گناہوں سے "محفوظ" کر دیا تھا۔ اور اگر کسی صحابی سے اتفاقاً کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو ان کو بلا تاخیر توبہ کی توفیق ملی، جیسا کہ محقق موصوف کے بیان فرمودہ ماعز و غامدیہ کے واقعات سے ظاہر ہے اور اس طرح وہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ کے زمرہ میں داخل ہو گئے، کسی صحابی کے لئے گناہوں پر اصرار کرنا اور ظلم و طغیان کو اپنی مستقل پالیسی بنا لینا ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو ایسے کسی فرد کو ہرگز ہرگز عادل نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ گناہوں کو مستقل پالیسی بنا لینے والا شخص تو کھلا ہوا فاسق ہی کہا جائیگا، جہاں تک نقل و روایت کی حد تک عدالت کا معاملہ ہے تو ہمارے آج کے دور میں بھی ایسے لوگ مل جائیں گے جو باوجود دوسرے گناہوں کے مرتکب ہونے کے راستباز ہوتے ہیں اور نقل و روایت کے معاملہ میں کسی قسم کی خرد برد نہیں کرتے پھر کیا ان کے دیگر گناہوں سے صرف نظر کر کے ان کو عادل قرار دیا جائیگا؟ اور ایسی صورت میں اہلسنت کے اجماعی عقیدے الصحابۃ کلھم عدول کی کیا اہمیت باقی رہ جائے گی اور اس سے صحابہؓ کی کون سی (باقی ص۱۳۰ پر)

صحابہؓ، کی نازک بحث چھیڑ کر حضرت معاویہؓ بلکہ ان کے پورے خاندان بنو اُمیہ پر طبری واقدی، یعقوبی اور مسعودی کی پامال اور مکذوبہ روایات کا سہارا لیکر ایسی ایسی تہمتیں باندھتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ!

حضرت معاویہؓ پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کو سمیٹ کر ہم ان دو بنیادی اعتراضوں کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں، اوّل یہ کہ انھوں نے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کی متفقہ خلافت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کر کے ان کے خلاف جنگ کے میدان میں آگئے اور صلح صفائی ہو جانے کے باوجود حضرت علیؓ ان کے خاندان اور ان کے ہمدردوں کی عداوت ان کے دل سے ختم نہ ہو سکی جس کا موقع بہ موقع اظہار ہوتا رہا۔ دوم یہ کہ انھوں نے اسلاف کی سنت اور رائے عامہ کے خلاف اپنے بعد اپنی جانشینی کے لئے اپنے بیٹے یزید کو نامزد کر کے نہ صرف ملوکیت کی بنیاد رکھی بلکہ ایک ایسا فتنہ پیدا کر دیا جس نے اسلام کے حسین پیکر کو مسخ کر دیا۔

ان دو بنیادی اعتراضوں کو تقویت پہونچانے کے لئے کچھ فروعی قسم کی "حکایات" بھی پیش کی جاتی ہیں، پہلے ہم ان دونوں بنیادی اعتراضوں کی حقیقت بیان کریں گے اس کے بعد ان فروعات کی حیثیت واضح کریں گے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ

حضرت معاویہؓ کے ورع و تقویٰ کو دیسی گزوں سے ناپنے والے چودھویں صدی کے "محققین"، کی تحقیقات و تنقیدات کو زیر بحث لانے سے پہلے ایک ضروری وضاحت کر دینا مناسب ہے کہ بعض حلقوں نے "حبِ علیؓ" کے لئے "بغض معاویہؓ"، کو ضروری قرار

(باقی صفحۂ گزشتہ) فضیلت ثابت ہو جائے گی، اور اس کا فائدہ کیا ہو گا؟۔

نے لیا ہے، امام اہلسنت حضرت مولانا محمد عبد الشکور صاحب فاروقی اس کی تشریح
کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت امیر معاویہؓ رضی اللہ عنہ کے حق میں سوء ظن رکھنے والے تین گروہ ہیں
اوّل روافض، خیر ان کا سوء ظن چنداں جائے تعجب نہیں کیونکہ وہ ایسے مقدس
حضرات سے سوء ظن رکھتے ہیں جن کا مثل تمام امت مرحومہ میں ایک بھی نہیں
دوسرا گروہ ان جاہل صوفیوں کا ہے جو حضرت علیؓ کی محبت کا تکملہ حضرت معاویہؓ
کی بدگوئی کو سمجھتے ہیں، یہ لوگ اپنے کو سنی کہتے ہیں، مگر در حقیقت نہ صرف اس امر
میں بلکہ بہت سے امور اصول و فروع میں اہل سنت کے مخالف ہیں، اور
فرقہ ہائے شیعہ میں داخل ہیں، تیسرا گروہ اس زمانہ کے بعض اہل ظاہر کا ہے
بعض روایات میں حضرت معاویہؓ کے مطاعن ان کی نظر سے گزرے، اب بوجہ
ظاہریت کے ان کی تاویل تک ان کے ذہن کی رسائی نہ ہوئی، ان میں سب سے
زیادہ مضرت رساں دوسرا گروہ ہے پھر تیسرا۔"[1]

اس تشریح سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ دوسرا اور تیسرا گروہ اگرچہ علی الاعلان
"مقام صحابیت" کا منکر نہیں ہے لیکن بوجہ اپنی جہالت اور بے علمی یا بوجہ ہٹ دھرمی و ظاہر
بینی حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی شان میں اپنی زبان طعن دراز کرتا ہے، اسی
لئے امام اہل سنتؒ نے پہلے گروہ کے مقابلہ میں دوسرے دونوں گروہوں کو زیادہ مضرت
رساں قرار دیا ہے، خصوصاً دوسرا گروہ جو بوجہ اپنی جہالت کے حبّ علیؓ کے لئے بغض
معاویہؓ کو ضروری سمجھتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی تنہا ایک فضیلت یعنی
ان کا مہاجر ہونا ہی اتنی وزنی ہے جو حضرت معاویہؓ کی تمام فضیلتوں پر بھاری ہے، علاوہ

---

[1] کشف الغطاء ترجمہ ازالۃ الخفاء ص ۳۱۶

ازیں بحیثیت مجموعی نہ تو حضرت علیؓ کا فضیلت میں حضرت معاویہؓ سے کوئی مقابلہ ہے نہ ہی ان کی فضیلت کے اظہار کے لئے حضرت معاویہؓ کی تنقیص کی کوئی حاجت ہے یہ تو دلوں کا مرض ہے جو فضیلت علیؓ کے عنوان سے زبان وقلم پر آجاتا ہے۔

جہاں تک خود ان دونوں بزرگوں کا معاملہ ہے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ایمان واخلاص اور ذاتی فضائل کے معترف تھے، حتیٰ کہ جنگ صفین کے بعد بھی حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے ایمان واخلاص کے سلسلہ میں کسی قسم کے شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس جنگ کا سبب حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں (اہل شام) کی "خطاء اجتہادی" کو قرار دیا، ثبوت کے لئے ملاحظہ ہو مستند شیعی کتاب نہج البلاغۃ میں شامل حضرت علیؓ سے منسوب گشتی خط ۵۸ کے یہ ابتدائی جملے۔

والظاهران ربنا واحد ونبينا واحد ودعوتنا في الاسلام واحدة ولا نستزيدهم في الايمان بالله والتصديق برسوله ولا يستزيدوننا والامر واحد الا ما اختلفنا فيه من دم عثمان ونحن منه براء۔	اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارا (یعنی حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کا) پروردگار ایک ہے، اور ہمارا نبی ایک ہے، اور ہماری اسلامی دعوت ایک ہے، اور اللہ پر ایمان لانے اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے میں نہ ہم ان سے زیادہ ہیں اور نہ وہ ہم سے زیادہ ہیں اور ہمارا معاملہ بالکل ایک ہے مگر جس چیز میں ہمارے درمیان اختلاف پیدا ہوا وہ خون عثمانؓ ہے، حالانکہ ہم لوگ عثمانؓ کے خون سے بری ہیں (یعنی قتل عثمانؓ میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہے)
(نهج البلاغۃ مع ترجمہ وشرح (فارسی) (ص ۱۰۴۱، مطبوعہ ایران)	

یہ الفاظ اس بات پر صریح ہیں کہ حضرت علیؓ نہ صرف حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں

کومومن مخلص سمجھتے تھے بلکہ ایمان باللہ والرسول اور تبلیغ و دعوت اسلامی کے سلسلہ میں ان کو اپنے سے کسی بھی حیثیت سے کمتر نہ سمجھتے تھے، البتہ جنگ صفین کی صورت میں پیش آنے والے "تاریخی المیہ" کے لئے وہ "خون عثمان غنیؓ" کو بنیاد قرار دیتے ہوئے یہ باور کرا رہے ہیں کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں نے اس کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی، حالانکہ میں اس سے ہر طرح بری ہوں[۱]

غرضیکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں حضور اکرم صلے اللہ ... وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں اور فرق مراتب کے باوجود دونوں کی صحابیت ہی اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کو ہر قسم کی تنقید سے بالاتر مانا جائے، یہی اہل سنت وجماعت کا متفق علیہ عقیدہ ہے، اب اگر کوئی فرد یا گروہ حضرت علیؓ کی محبت کی آڑ میں حضرت معاویہؓ کے سلسلہ میں اپنے بغض کا اظہار کرتا ہے تو نہ اسے "محب علیؓ" باور کیا جا سکتا ہے نہ ہی زمرۂ اہل سنت میں اس کا شمار ہو سکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ سے اختلاف

حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کی فضیلت کا انکار نہ تھا نہ ہی وہ حضرت علیؓ کو خلیفۃ المسلمین بنائے جانے کے مخالف تھے اور نہ ہی انھوں نے حضرت علیؓ کی "متفقہ خلافت"

---

[۱] واقعہ یہ ہے کہ نہ تو حضرت عثمان غنی کی شہادت سے حضرت علیؓ کا کچھ تعلق تھا نہ ہی حضرت معاویہؓ ایسا سمجھتے تھے البتہ ان کا حضرت علیؓ سے یہ مطالبہ ضرور تھا کہ قاتلان عثمان غنیؓ کو قصاصاً قتل کیا جائے جو شورش برپا کرنے کے بعد حضرت علیؓ پر غیر ضروری دباؤ ڈال کر آزادانہ گھوم رہے تھے، جبکہ حضرت علی فتنہ فرو کرنے کی غرض سے قصاص کو معرض التواء میں ڈالنا مناسب خیال فرما رہے تھے۔

کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حالات کی مجبوریوں نے جن لوگوں کو حضرت علیؓ کا سب سے نزدیکی گروہ بنادیا تھا، اور خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے قتل یا اس کی سازش میں شمولیت کے باوجود جو لوگ حضرت علیؓ اور ان کی خلافت کے سب سے بڑے حامی بن رہے تھے، حضرت معاویہؓ ان لوگوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانا ضروری سمجھتے تھے، جبکہ حضرت علیؓ اس وقت کے پریشان کن حالات میں ایسا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کر رہے تھے، بس یہی ہے ان دونوں بزرگوں کے درمیان اختلاف کا بنیادی سبب ، جس کے نتیجہ میں ان دونوں کے درمیان جنگ تک کی نوبت آگئی اور دشمنان اسلام خصوصاً سبائیوں کو اپنی یاوہ گوئیوں کے ذریعہ اسلام اور اس کی روشن تاریخ کو مسخ کرنے کا موقع مل گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قاتلان عثمانؓ نے خلیفہ مظلوم سیدنا عثمان غنیؓ کو قتل کرنے کے بعد حضرت علیؓ پر بیعت خلافت لینے کے لئے ہجوم کیا، اوّلاً تو حضرت علیؓ ایسے پرفتن حالات میں اور ان لوگوں کی تحریک بلکہ دباؤ میں جن کے ہاتھ حضرت عثمانؓ کے خون ناحق میں رنگے ہوئے تھے خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کرتے رہے، لیکن بالآخر امت کی فلاح کی خاطر فتنوں پر قابو پا لینے کے عزم کے ساتھ انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی [1] حضرت علیؓ کی فضیلت اور اس وقت ان کے خلافت کے لئے موزوں ترین شخصیت ہونے سے کسی کو انکار نہ تھا، مگر قاتلان عثمانؓ کے حضرت علیؓ کی جناب میں باریاب ہونے اور پھر ان ہی کے دباؤ میں حضرت علیؓ کے خلافت کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی وجہ سے صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے توقف کیا کیونکہ ان لوگوں کو یہ قوی اندیشہ تھا کہ جب حضرت عثمانؓ کو قتل کرنے

---

[1] اس سلسلہ کی ضروری تفصیلات حضرت علیؓ کے تذکرہ میں گذر چکیں ۱۲

یا اس میں تعاون دینے اور اس پر راضی ہونے والے ہی خلیفۃ المسلمین پر حاوی ہو کر جبراً ان کے مشیر بن جائیں گے تو خون عثمانؓ کا قصاص لینا ممکن نہ ہو گا، اور بعد کے حالات نے اس اندیشہ کو صحیح کر دکھایا۔ چنانچہ عباس محمود العقاد لکھتے ہیں۔

"امام (حضرت علیؓ) سے جو بھی حد قائم کرنے کا مطالبہ کرتا اس سے وہ کہتے جو تم جانتے ہو، اس سے میں ناواقف نہیں ہوں، لیکن میں کس طرح ان لوگوں سے نمٹوں جو ہم پر قابو رکھتے ہیں۔ اور ہم ان پر قابو نہیں رکھتے یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ تمہارے غلام بھی ہو گئے ہیں اور جن سے آکر تمہارے اعراب (بدو) بھی مل گئے ہیں، اور وہ سب تمہارے سامنے ہیں جو چاہتے ہیں کر رہے ہیں، کیا تم لوگ اس بات کی گنجائش دیکھتے ہو کہ اس پر قابو پا لیا جائے اور تم لوگ جو چاہتے ہو وہ کیا جا سکے"۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف بغاوت کر کے ان کے خون ناحق میں اپنے ہاتھ رنگنے والے حضرت علیؓ کے بھی مخلص نہ تھے، وہ تو حضرت علیؓ کی آڑ میں اسلامی خلافت کی بنیادیں ہلانے اور کبھی ختم نہ ہونے والے فتنے کو جگانے کے درپے تھے، خود حضرت علیؓ کی نظر میں بھی ابتدا ہی سے ان کی وفاداری مشکوک تھی، اور بہت جلد ان کو ان لوگوں کی بے وفائیوں، غداریوں بلکہ اسلام دشمنی کا تجربہ بھی ہو گیا مگر حالات کے بے رحم ہاتھوں سے مجبور ہو کر وہ ان کے مشوروں کو یکسر مسترد کرنے یا ان سے اپنا پیچھا چھڑا لینے پر قادر نہ تھے، اور اسی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یہ دشمنان اسلام ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان جنگ جمل اور حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگ صفین برپا کرانے میں کامیاب ہو گئے،

---

[1] المرتضیٰ ص ۲۴۳-۲۴۲ بحوالہ العبقریات الاسلامیہ ص ۹۲۴

جہاں تک جنگ جمل کا معاملہ ہے تو اس جنگ کے لئے فریقین یعنی ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ دونوں میں سے کسی کے راضی نہ ہونے اور حضرت قعقاع بن عمرو تمیمیؓ کی کوششوں سے فریقین کے درمیان صلح ہو جانے کی صراحت موجود ہے چنانچہ علامہ ابن کثیرؒ نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ام المومنینؓ اور ان کے ساتھ حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ جیسے اکابر صحابہؓ کے اس مطالبہ کو حضرت علیؓ نے تسلیم کر لیا تھا کہ قاتلان عثمانؓ سے قصاص لیا جائے اور رات میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ صبح وہ اقرارنامہ مرتب ہوگا جس کی رو سے فریقین مل کر قاتلان عثمانؓ سے قصاص لیں گے، ابن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں۔

عولوا جميعاً على الصلح	سب کے سب صلح پر تیار ہو گئے اور اس
وباتوا بخير ليلة لم يبيتوا	رات ایسی چین کی نیند سوئے کہ اس سے
بمثلها للعافية و	پہلے ویسی عافیت کی نیند نہیں سوئے
بات الذين اثاروا امر	تھے اور وہ لوگ جنہوں نے حضرت عثمانؓ
عثمان بشر ليلة باتوها قط	کے خلاف شورش برپا کی تھی انھوں نے وہ
(البداية والنهاية)	رات ایسی بدتر گذاری کہ اس سے پہلے
(جلد ۷ صـ ۲۳۹)	ایسی بدتر رات انھوں نے نہیں گذاری تھی

ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت عثمان غنیؓ کے قتل یا اس کی سازش میں شریک تھے قصاص کا نام آتے ہی ان کی نیندیں اڑ جانا فطری بات تھی، چنانچہ ان ہی لوگوں نے صلح کی اس کوشش کو ناکام بنانے اور اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی خاطر رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اپنے آدمی دونوں طرف کے لشکر میں بھیجدیئے، جنھوں نے تیر اندازی شروع کر دی، اور فریقین یہی سمجھ کر کہ حملہ فریق مخالف کی طرف سے ہوا ہے نہ چاہتے ہوئے بھی جنگ پر مجبور ہو گئے۔ اسی جنگ میں مسلمانوں کو اپنے دو عظیم ساتھیوں اور

اسلامی تاریخ کے روشن نگینوں یعنی حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی جدائی کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ جن کی شہادت کی خبر پاکر حضرت علیؓ کو [illegible] ہوا، اور بے ساختہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ لہ سچ ہے کہ ؎

دشمنوں کی فتنہ پردازی ہوئی　　باعث خوں ریزیِ جنگِ جمل

ورنہ شیرِ حق سے طلحہؓ اور زبیرؓ　　چاہتے ہرگز نہ تھے جنگ و جدل

اب رہا جنگ صفین کا معاملہ، تو حقیقتاً اس کی بنیاد بھی وہی خون عثمانؓ کے قصاص کا معاملہ تھا مگر مسعودی جیسے رافضی مورخین نے یہ تأثر دینا چاہا ہے کہ اس جنگ کی بنیاد یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ خود مدعی خلافت تھے اور انھوں نے حضرت علیؓ کی بیعت نہ کرکے ان کو چیلنج دیا تھا، اس لئے حضرت علیؓ کو ان کے خلاف لشکر کشی کرنا پڑی، اور نتیجہ میں جنگ صفین کا خونیں حادثہ پیش آیا، حالانکہ مسعودی یا اس کی ہم نوائی میں جنگ صفین کے لئے حضرت معاویہؓ کی خلافت طلبی کو بنیاد قرار دینے والے لوگ کسی گری پڑی روایت سے بھی اس کا ثبوت نہیں فراہم کرسکتے کہ حضرت معاویہؓ نے صراحتاً یا اشارۃً کسی بھی طرح حضرت علیؓ کے مقابلہ میں خلافت کا دعویٰ پیش کیا ہو، یا مطلقاً حضرت علیؓ کو بحیثیت

لہ حضرت زبیرؓ کا قاتل بہت خوش خوش جب حضرت علیؓ کو انعام کی امید پر یہ "خوشخبری" سنانے گیا تو حضرت علیؓ نے یہ جانکاہ خبر سنتے ہی فرمایا کہ جا میں تجھے جہنم کی "خوش خبری" سناتا ہوں، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یا علی بشر قاتل ابن صفیۃ بالنار (اے علی! ام صفیہؓ کے بیٹے (زبیرؓ) کے قاتل کو نار جہنم کی "خوش خبری" سنا دینا) اسی طرح حضرت علیؓ کا گذر جب حضرت طلحہؓ کی لاش پر سے ہوا تو بے ساختہ فرمایا لیتنی مت قبل هذا بعشرین سنۃ (اے کاش کہ میں اس منظر کو دیکھنے سے بیس سال پہلے ہی مرگیا ہوتا)

خلیفۃ المسلمین تسلیم کرنے سے انکار کیا ہو، البتہ حضرت معاویہؓ نے اپنی اور تمام اہل شام کی حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کے لئے یہ شرط ضرور رکھی تھی کہ پہلے خلیفۂ مظلوم سیدنا عثمان غنیؓ کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ اگر حضرت علیؓ قاتلان عثمانؓ سے قصاص نہ لے سکتے ہوں، تو ہم کو اجازت دیں ہم قصاص لے لیں گے۔ اس کے جواب میں حضرت علیؓ کی طرف سے بلاشرط بیعت قبول کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے حالات کی ابتری اور قاتلان عثمانؓ کے نامعلوم ہونے کا عذر پیش کرکے یہ بات کہی گئی تھی کہ حالات پر قابو پانے اور موزوں وقت آنے پر قاتلان عثمانؓ سے قصاص لیا جائے گا ـــــ یہی تھا ان دونوں بزرگوں کے درمیان نقطۂ اختلاف جس میں ہوا و ہوس کا کوئی دخل نہ تھا، اور ہر فریق اپنے اجتہاد کے ذریعہ اپنے موقف کو صحیح اور اسلام و ملت اسلامیہ کے لئے سودمند سمجھ رہا تھا۔ [1]

ادھر قاتلان عثمانؓ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جب تک حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے دیگر عمّال اپنے اپنے منصب پر فائز رہیں گے اس وقت تک ان کے سروں پر تلواریں لٹکتی رہیں گی اور وہ کسی بھی وقت گرفت میں آسکتے ہیں، اس لئے انھوں نے حضرت علیؓ پر زور ڈالا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے تمام عاملوں کو تبدیل کرکے ان کی جگہ اپنے عامل مقرر کریں، اگرچہ حضرت علیؓ کے فرزند اکبر حضرت حسنؓ، انکے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ان کے دیگر بہی خواہوں نے اس کی شدید مخالفت کی، اور حضرت ابن عباسؓ نے عمّال عثمانی کو معزول نہ کرنے پر اصرار کرتے ہوئے اپنے اس اندیشہ کا بھی اظہار کیا کہ :۔

---

[1] الاصابہ ص ۵۰۸ ملخصاً ۱۲

"اگر اس وقت ان عمّال کو معزول کیا گیا تو ممکن ہے کہ وہ آپ کی خلافت ہی کو چیلنج کر دیں اور یہ کہدیں کہ یہ خلافت ہی بغیر شوریٰ کے منعقد ہوئی ہے؟[1]

لیکن حضرت علیؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے تمام عاملوں کو معزول کر کے اُن کی جگہ نئے عامل مقرر کر دیئے، حضرت علیؓ کی طرف سے معزول کئے جانے والے عاملوں میں حضرت معاویہؓ بھی تھے، جنکو خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے عامل مقرر کیا تھا اور پھر حضرت عثمانؓ نے بھی ان کو ان کے منصب پر باقی رکھا تھا، اور اس طرح وہ شام کے ایک با اثر محبوب اور مدبر عامل تھے جن کی اس طرح معزولی کو اور وہ بھی قاتلان عثمانؓ کے ایماء پر اہل شام کسی طرح گوارہ نہیں کر سکتے تھے، حضرت معاویہؓ کی معزولی کا پروانہ جاری کرنے میں قاتلان عثمانؓ کے ایماء اور ان کے مشورہ کی صراحت کرتے ہوئے حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے

ولما ولی علی بن ابی طالب الخلافة اشار علیہ من اُمرائہ ممن باشر قتل عثمان ان یعزل معاویة عن الشام و یولی علیھا سھل بن حنیف فعزلہ[2]	اور جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے امراء میں سے ان لوگوں نے جو قتل عثمانؓ کے ذمہ دار تھے ان کو اشارہ کیا کہ وہ شام سے معاویہؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ سہلؓ بن حُنیف کو والی بنائیں تو حضرت علیؓ نے معاویہؓ کو معزول کر دیا۔

حضرت سہل بن حنیف خود تو شام تک پہونچ بھی نہیں سکے، مقام تبوک ہی پر ان کی ملاقات شام کے کچھ سواروں سے ہوئی اور ان سے حضرت سہلؓ نے یہ بات بتائی کہ میں علیؓ کی طرف سے حاکم شام مقرر ہوا ہوں تو ان لوگوں نے پوری صورت

---

[1] طبری ج ۴ ص ۴۳۹ ۔ [2] البدایة والنہایة ج ۸ ص ۲۱ ۔

حال بتاکران کو مشورہ دیا کہ شام کے لوگ معاویہؓ کے علاوہ کسی کی اطاعت قبول نہیں کریں گے، کیونکہ وہاں ہر شخص کی زبان پر عثمانؓ کے خونِ ناحق کے قصاص کی بات ہے بہتر یہ ہے کہ تم واپس چلے جاؤ، یہ سنکر حضرت سہل واپس آگئے، اور حضرت علیؓ کے سامنے تمام حالات بیان کر دیئے۔ تمام حالات جاننے اور حضرت معاویہؓ اور اہل شام کی "بلاشرط بعیت" کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا، دوسری طرف حضرت معاویہؓ کو جب حضرت علیؓ کی جانب سے فوجی کارروائی کا علم ہوا تو انھوں نے بھی اپنی فوجوں کو کوچ کا حکم دیا، بالآخر مقام صفین میں یہ خونچکاں اور افسوسناک جنگ ہوئی، جس میں فریقین کی طرف سے متعدد صحابۂ کرام نے بھی شرکت کی، اگرچہ صحابۂ کرام کی غالب اکثریت خصوصاً اکابر صحابہؓ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت سہل بن حنیفؓ وغیرہم نے کسی فریق کی طرف سے شرکت کے بجائے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کی۔

جہاں تک اہل سنت وجماعت کے عقیدہ کا معاملہ ہے تو ان کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ جنگ صفین کے دونوں فریق قابل احترام ہیں اور حضرت علیؓ و حضرت معاویہ رضؓ دونوں مجتہد تھے اور دونوں نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق صواب کی جو راہ سمجھی اسے اختیار کیا اور اگرچہ اس سلسلہ میں حضرت معاویہؓ "مجتہد مخطی" تھے لیکن ان کو یا اُن کے ساتھیوں کو کسی طرح بھی نشانۂ ملامت بنانا اور زبان طعن دراز کرنا سبائی مشن کی آبیاری کرنے اور دشمنانِ اسلام کو کمک پہونچانے کے مرادف ہے، اسی لئے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی اپنے مکتوب ۲۵۱ میں بہت ہی واضح انداز میں تحریر فرماتے ہیں۔

اے برادر معاویہؓ تنہا دریں معاملہ نیست بلکہ نصفے از اصحاب کرام کم وبیش	اے برادر! معاویہؓ اس معاملہ میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ کم وبیش نصف صحابۂ کرامؓ اس معاملہ

ورنہ معاملہ باوے شریک اند، پس محاربان امیر اگر کفرہ یا فسقہ باشند اعتماد از شطر دین می خیزد کہ از راہ تبلیغ ایشاں بمارسیدہ است وتجویز نکند ایں معنیٰ را مگر زندیقے کہ مقصودش ابطال دین است۔ ؎۱

میں ان کے ساتھ شریک ہیں اگر حضرت علیؓ کے ساتھ لڑنیوالے حضرات کافر یا فاسق سمجھے جائیں تو گویا نصف دین سے اعتماد اٹھ جائیگا جو ان کی تبلیغی کوششوں سے ہم تک پہونچا ہے اس قسم کی بات تو وہی بے دین کہہ سکتا ہے جس کا مقصود ہی ابطال دین ہو۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف کی صحیح حیثیت معلوم ہو جاتی ہے اس کے باوجود بھی سبائی خرافات پر اعتماد کرکے جو لوگ اس خالص دینی اور اجتہادی اختلاف کو نفسانی خواہشوں کی اتباع سے تعبیر کرنے کے درپے ہوں، اور فریقین میں سے کسی ایک کے طرفدار بنکر دوسرے کی تحقیر و تذلیل کریں، ان کے لئے بس ہدایت کی دعا ہی کی جاسکتی ہے

حضرت علیؓ کی دشمنی کا افسانہ

حضرت معاویہؓ پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کو حضرت علیؓ سے عداوت تھی، اور پھر اس الزام کے ثبوت میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ اپنے دورِ امارت میں خود بھی اور اپنے گورنروں سے بھی حضرت علیؓ پر سب وشتم (گالی گلوچ) کراتے تھے اس الزام کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے ہم اپنے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انصاف سے کام لے کر خود ہی فیصلہ کریں کہ اگر واقعی کوئی شخص اپنے مسلمان

؎۱ مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم ص ۵۹، منقول از خلافت وملوکیت از صلاح الدین یوسف ص ۳۲۷

بھائی پر سب و شتم کے لئے اس قدر اہتمام کرے کہ اس کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد خود بھی اس کو گالی گلوچ سے یاد کرے اور اپنے ماتحت افسروں سے بھی حکم دیکر یہ کام کرائے تو ایسے شخص کو کس کردار کا حامل گردانا جائیگا؟ اس کے ہمعصروں کی نظر میں اس کا کیا مقام ہوگا؟ تعلیمات شریعت اور مقام صحابیت سے صرف نظر کرکے عام انسانی اخلاق و مروت کے لحاظ سے مرنے کے بعد کسی شخص کو گالی گلوچ کرنا کیسا سمجھا جاتا ہے؟ اور پھر سوچئے کہ کیا ہم ایک صحابی رسول سے اسی دنی کردار کی توقع کرسکتے ہیں کہ وہ دوسرے صحابی رسول کو مجمع عام میں اس کی وفات کے بعد نہ صرف خود سب و شتم کریگا بلکہ دوسروں سے بھی اس پر سب و شتم کرائے گا، اور یہ سب کچھ اس عہد میں کریگا جس کو زبان رسالت نے خیر القرون کے نام سے یاد فرمایا، اور ان لوگوں کے سامنے کریگا جن کو خدائے ذوالجلال نے اپنی رضا کے پروانے سے نوازا ہو؟ کیا یہی ہو سکتی ہے خیر القرون کی تصویر؟ اور کیا ان ہی لوگوں کو انسانی تاریخ کا سب سے مقدس اور پاکیزہ گروہ گردانا جاسکتا ہے؟ یا سچائی یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہؓ کی مظلومیت کی ایک مثال ہے کہ ان کی عظمت کا اعتراف کرنے اور ان کی صحابیت کا اقرار کرنے کے باوجود ان کی کردار کشی اور ان پر تہمتیں باندھنے کا جن لوگوں کو چسکا لگ گیا ہے وہ انجام سے بے خوف ہو کر سبائی اسرائیلیات کے سہارے کسی طرح اس مظلوم صحابیٔ رسول کو بندۂ ہوا و ہوس ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ چاہے اس کوشش میں دین کا سرا ہی ہاتھ سے چھوٹ جائے ــ اور بس اسی جذبہ کا نام ہے "بغض معاویہؓ"

یوں تو اس "بغض معاویہؓ" کی محرک اوّل ابن سبا کی وہ فتنہ انگیز مہم ہے جس نے حب علیؓ و حب اہل بیتؓ کے پردے میں پورے اسلامی نظام اور پوری جماعت صحابہؓ کے پیکر کو مسخ کرنے کے لئے بے شمار حدیثیں گھڑھیں، اور اخلاف کو اسلاف سے برگشتہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا لیکن عام اردو قارئین کو حضرت معاویہؓ اور

دوسرے کئی صحابیوں کی طرف سے بدگمان کرکے فکری کجروی پر ڈالنے کا سہرا ماضی قریب کے ایک ایسے صاحب قلم کے سر ہے جن کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش "مردکار" ایک "مخصوص سیاسی نظام" کے زیر اثر سبائی فتنہ گروں کا آلۂ کار نہ بنا ہوتا۔

اس سلسلہ میں آں موصوف کا کارنامہ یہ ہے کہ "بغض اصحابؓ" پر مشتمل منتشر سبائی روایات کو ضخیم عربی کتابوں سے چھانٹ چھانٹ کر ایک "خاص مقصد" کے تحت اپنی طرف سے چبھتے ہوئے عنوانات قائم کرکے بڑے سلیقہ کے ساتھ اُردو میں جمع کرکے اس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد کیا کہ نعوذ باللہ اصحابؓ رسولؐ خائن، بدعتی دہشت پسند، ظالم، گالی گلوچ کرنے والے، شخصیت پرستی کے مریض اور ہر قسم کی بدعنوانیوں میں مبتلا ہو کر روئے زمین کے سب سے "مقدس گروہ" کے بجائے سب سے "بدتر گروہ" تھے، لہذا ان کی کمزوریوں کو اجاگر کرنا، ان کے عیوب کو بیان کرنا، اور ان کے کردار پر تنقید کرنا ہی دین کی خدمت ہے۔ فَیَا حَسْرَتًا عَلَی الْعِبَادِ

حضرت معاویہؓ پر حضرت علیؓ کی ذاتی دشمنی کا الزام عائد کرتے ہوئے انکے اور ان کے گورنروں کی طرف سے حضرت علیؓ پر گالی گلوچ کرنے کا افسانہ بھی آں موصوف ہی کا عام کردہ ہے، چنانچہ اس کی تفصیل "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" عنوان کے ذیل میں اپنے تبصرہ کے ساتھ یوں رقم فرماتے ہیں۔

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود، اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے، حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبویؐ کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دیجاتی تھیں، اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے

یہ گالیاں سنتے تھے، کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو در کنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف ہے اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ لے (خلافت و ملوکیت ص ۱۷۴)

کسی مسلمان کے سامنے یہ پوری عبارت اس کے مصنف کا نام بتائے بغیر رکھدی جائے تو یقیناً اس کا یہی فیصلہ ہوگا کہ "یہ کسی سبائی کا گڑھا ہوا افسانہ ہے،" کیونکہ مسلمان خدا اور اس کے سچے رسولؐ کے واضح فرامین پر ایمان رکھتے ہوئے ایک صحابئ رسول کی طرف سے اتنے گرے ہوئے کردار کے مظاہرہ کا یقین کر ہی نہیں سکتا لیکن مصنف بھی خیر سے "ایک بانی تحریک اور علامہ" تھے اس لئے انھوں نے درج بالا عبارت میں "گالیاں سنتے تھے" پر لے حاشیہ کی علامت لگاکر حاشیہ میں درج ذیل کتابوں کے نام بطور حوالہ اس طرح درج کر دیئے ہیں۔

"لے الطبری جلد ۴ ص ۱۸۸۔ ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۳۴ ج ۴ ص ۱۵۴۔ البدایہ ج ۸ ص ۲۵۹۔ ج ۹ ص ۸۰"

اس طرح مصنف اپنے قارئین کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ یہاں تک کی بات مذکورہ

لے قارئین ذرا ٹھہر ٹھہر کر اس عبارت کو ایک مرتبہ پھر سے پڑھ لیں جو کسی "رافضی" کے قلم سے نہیں بلکہ اہل سنت کے ایک "روشن خیال مقتدیٰ اور علامہ" کے قلم سے نکلی ہوئی ہے، اور جس میں کاتب وحی، صحابئ رسولؐ حضرت معاویہؓ پر بدعتی ہونے، گالیاں بکنے، عام انسانی اخلاق سے عاری ہونے، خطبہ جمعہ کو گندگیوں سے آلودہ کرنے، مسجد نبوی اور منبر رسول کی توہین کرنے اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ داروں کو ایذا پہونچانے کے الزامات عائد کئے گئے ہیں ۔ کیا رسول اللہ صلعم کی تربیت اور انکی صحابیت کا یہی فیض حضرت معاویہؓ کو پہونچا تھا؟ ان ھذا البھتان عظیم۔

بالا تمام کتابوں میں موجود ہے، اس کے بعد . . . . کسی کے مرنے کے بعد الخ
مصنف کا اپنا تبصرہ ہے۔

اس سلسلہ میں مصنف کی "فنکاری" یہ ہے کہ حوالے تو ایک، دو نہیں بلکہ پورے پانچ دیدیئے مگر کسی بھی کتاب کی اصل عبارت یا اس کا اردو ترجمہ نقل نہیں کیا[1]، اور وہ ایسا کرتے بھی کیسے ؟ جبکہ ان حوالوں میں سے کسی میں بھی حضرت معاویہؓ کے حضرت علیؓ پر سب وشتم کرنے، اور مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دینے، اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ داروں کے ان گالیوں کو سننے کا کہیں ذکر تک نہیں ہے، یہی نہیں بلکہ ان حوالوں کے علاوہ کسی دوسرے حوالہ، حتیٰ کہ تاریخ کی کسی سبائی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت معاویہؓ نے خود کبھی حضرت علیؓ کو گالیاں دی ہوں، چہ جائیکہ "مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضۂ نبوی کے سامنے"، اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ داروں، کو سنا کر۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ "تاریخ نویسی" کے نام پر "بہتان طرازی" اور ایک مظلوم صحابی رسول کی ردائے تقدس کو تار تار کرنے کی اس کوشش کو ہم کس نام سے

---

[1] پوری کتاب میں مصنف نے اپنی یہی "فن کاری" دکھائی ہے کہ جہاں جہاں ان کو اپنی بات دوسروں کے منہ میں ڈالنا ہوتی ہے، وہاں وہاں صرف کتابوں کے حوالے دیکر گذر جاتے ہیں اصل عبارت یا اس کا ترجمہ نہیں نقل کرتے تاکہ عربی سے ناواقف عام اردو داں قارئین مصنف کے اعتماد پر یہ باور کرلیں کہ لکھی ہوئی تمام باتیں حوالہ کی اصل کتابوں میں موجود ہوں گی، مصنف نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے۔

یاد کریں ؂

خوب پردہ ہو کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں　　صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

جہاں تک حضرت معاویہؓ کے حکم سے ان کے تمام گورنروں کے حضرت علیؓ پر سب وشتم کرنے کا الزام ہے تو "تمام گورنروں" کی حد تک تو یہ الزام بھی بغض معاویہؓ کے ایک کرشمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ نہ مصنف کے اپنے دیئے ہوئے حوالوں میں اس کا ذکر ہے نہ ہی کسی گری پڑی روایت تک سے اس کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے تمام گورنر حضرت علیؓ پر سب وشتم کرتے تھے یا اس کا ان کو حکم دیا گیا تھا، البتہ ان حوالوں میں حضرت معاویہؓ کے دو گورنروں کی طرف سے حضرت علیؓ پر سب[1] کرنے کا ذکر ضرور موجود ہے، اور یہ دو گورنر ہیں، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور مروان بن الحکم۔

اب رہا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ پر سب وشتم

---

[1] عربی زبان کے لفظ سب اور اردو کے "سب وشتم" میں یہ بنیادی فرق ہے کہ اردو میں "سب وشتم" گالی گلوچ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ معترض کی عبارت میں "سب وشتم کی بوچھاڑ"، اور پھر آگے اسی کی تشریح لفظ "گالیاں" سے ظاہر ہے جبکہ عربی میں لفظ "سب" کا مفہوم عام ہے اور اس سے مطلق مذمت مراد ہوتی ہے، جیسا کہ مسلم شریف ج ۲ ص ۲۴۶ کی اس روایت میں مذکور ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ تبوک کے سفر میں دو صحابیوں نے حضورؐ کے پہونچنے سے پہلے چشمہ پر پہونچ کر پانی پی لیا تھا، راوی کا بیان ہے کہ جب حضور کو اس کی اطلاع ہوئی فسبھما النبی صلی اللہ علیہ وسلم (تو ان دونوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "سب" کیا) کیا کسی صاحب ایمان کو یہ جرأت ہے کہ وہ روایت میں وارد اس لفظ "سب" کا ترجمہ "گالی" کرکے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے یوں کہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کرنے کے حکم دیئے جانے کا معاملہ، تو اس سلسلہ کے حوالوں میں مذکور طویل روایت کے بقدر ضرورت الفاظ یہ ہیں۔

.... ولست تارکا ایصاءك بخصلة لا تتحم عن شتم علی و ذمه والترحم علی عثمان والاستغفار له والعیب علی اصحاب علی والاقصاء لهم و ترك الاستماع منهم .... [1]	(حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو جب کوفہ کا گورنر مقرر کیا تو دوسری باتوں کے بعد کہا) اور میں تم کو یہ ہدایت دینا نہیں بھول سکتا کہ تم علیؓ کو گالی دینے اور ان کی مذمت کرنے اور عثمانؓ پر رحمت بھیجنے اور ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے، اور علیؓ کے ساتھیوں پر عیب لگانے اور انھیں دور رکھنے، اور ان کی بات پر دھیان نہ دینے سے گریز نہ کرنا۔

روایت کے ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنر حضرت مغیرہؓ کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ حضرت علیؓ کو گالی دینے اور ان کی مذمت کرنے سے اور ان کے ساتھیوں پر عیب لگانے سے گریز نہ کریں، اور ان کو اپنے سے دور رکھیں اور ان کی کسی بات پر کان نہ دھریں ——— لیکن اس "گالی اور مذمت" کی نوعیت کیا تھی؟ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت معاویہؓ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے حضرت علیؓ پر کس طرح "سب و شتم" کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں پر کس طرح عیب لگاتے تھے؟ اس کی تفصیل بھی اسی روایت میں مذکور ہے اور وہ اس طرح:۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں صحابیوں کو گالی دی، نعوذ باللہ منہ (تلخیص از حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق)

[1] الطبری ج ۴ ص ۱۸۸ - ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۴ (اصل روایت طبری نے اپنی سند سے بیان کی ہے اسی کو ابن الاثیر نے الکامل میں نقل کیا ہے ———

تام المغیرۃ فقال فی علی	حضرت مغیرہ کھڑے ہوئے، پھر حضرت علیؓ
وعثمان کما کان یقول لے	اور حضرت عثمانؓ کے سلسلہ میں وہی کہا جو
وکانت مقالتہ اللھم	وہ کہا کرتے تھے، ان کے الفاظ یہ تھے، اے
ارحم عثمان بن عفان	اللہ تو عثمان بن عفانؓ پر رحم فرما۔ اور ان سے
وتجاوز عنہ واجزہ باحسن	درگذر فرما، اور ان کے اچھے عمل کی انھیں جزا
عملہ فانہ عمل بکتابک	دے، کیونکہ انھوں نے تیری کتاب پر عمل
واتبع سنۃ نبیک صلی اللہ علیہ	کیا، اور تیرے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے
وسلم وجمع کلمتنا و	طریقہ پر چلے، اور ہمارے کلمہ کو ایک کر دیا
حقن دماءنا وقتل مظلومًا	اور ہمارے خون کو محفوظ کر دیا اور خود مظلوم
اللھم فارحم انصارہ و	قتل کئے گئے، اے اللہ تو رحم فرما ان کے
اولیاءہ و محبیہ والطالبین	مددگاروں اور دوستوں اور ان سے محبت
بدمہ وید عوا علی	کرنے والوں اور ان کے قصاص کا مطالبہ
قتلتہ	کرنے والوں پر۔ اور وہ بد دعا کرتے ان
	(عثمانؓ) کے قاتلوں کے لئے۔

اسی روایت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے ان کے تمام گورنر، حضرت علیؓ پر، سب وشتم کی بوچھاڑ، کیا کرتے تھے، اب قارئین اس روایت کے سلسلہ میں درج ذیل امور پر غور فرمائیں۔

۱۔ روایت میں، تمام گورنروں، کو نہیں، صرف ایک گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو "شتم وذم" کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ روایت میں حضرت مغیرہؓ کے حضرت علیؓ پر، سب وشتم کی بوچھاڑ، کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ آخری خط کشیدہ جملہ میں اس بات کی صراحت ہے کہ حضرت مغیرہؓ

قاتلان عثمانؓ کے حق میں بد دعا کیا کرتے تھے۔

۳۔ روایت میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے سلسلہ میں جو کچھ اس موقع پر کہا، وہی وہ دوسرے موقعوں پر بھی کہا کرتے تھے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

۴۔ روایت میں حضرت مغیرہؓ کی دعا اور بد دعا کے الفاظ موجود ہیں اور یہ روایت بالمعنی نہیں ہے۔

ان امور سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حضرت مغیرہؓ، حضرت عثمانؓ کے حق میں دعا اور ان کے قاتلوں کے حق میں بد دعا کیا کرتے تھے، اور چونکہ حضرت علیؓ نہ حضرت عثمانؓ کے قاتل تھے نہ ہی اس جرم میں وہ کسی بھی طرح معاون تھے، اس لئے بد دعا یا "سب وشتم" سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، اور راوی نے قاتلان عثمانؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کا نام اپنی طرف سے جوڑ دیا ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ اس روایت کی سند میں ہشام بن الکلبی، ابو مخنف، مجالد بن سعید، اور نفیل بن خدیج چاروں راوی رسوائے زمانہ ہیں، اور ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی روایات پر اعتماد کرنے سے منع فرمایا ہے[1]، جس روایت کی سند میں ایک دو نہیں چار چار متروک و ناقابل اعتماد راوی موجود ہوں اس کی متن میں ہر قسم کی تحریف ہونے کے قوی امکانات موجود ہیں۔

---

[1] خاص طور سے ہشام بن الکلبی اور ابو مخنف لوط بن یحییٰ، یہ دونوں تو مشہور رافضی اور ناقابل استناد لوگ ہیں، اور کسی سند میں ان کا آجانا ہی اس روایت کو ناقابل اعتماد بنا دینے کے لئے کافی ہے، حافظ بن حجرؒ، حافظ ذہبی، یحییٰ بن سعید اور دوسرے تمام ائمہ جرح و تعدیل نے اس کی صراحت کی ہے۔

اب رہا حضرت معاویہؓ کے حضرت مغیرہؓ کو حکم دینے کا معاملہ، تو اگر تمام باتوں سے قطع نظر کر کے روایت کو بالکل صحیح ہی مان لیا جائے تو وہ حکم وہی تھا جس کی تعمیل حضرت مغیرہؓ کیا کرتے تھے ـــــ یعنی قاتلان عثمانؓ سے برأت اور ان کے حق میں بد دعا، اور حضرت علیؓ پر "سب" کا حکم اس لئے دیا کہ حضرت معاویہؓ کو ان سے اسی بات پر اختلاف تھا کہ وہ قاتلان عثمانؓ سے قصاص نہ لے کر ان کو ڈھیل دے رہے ہیں، اور وہ لوگ ان کے "مشیر خصوصی" بنکر بالواسطہ خلیفۂ وقت کے مظلومانہ قتل کی حضرت علیؓ سے تائید کرا رہے ہیں۔

اسی طرح حضرت معاویہؓ کے دوسرے گورنر مروان بن الحکم کے حضرت علیؓ پر سب کرنے کا معاملہ ہے جس کا ذکر چوتھے نمبر کے حوالہ یعنی البدایہ ج ۸ ص ۲۵۹ پر ان الفاظ میں ہے۔

ولما كان (مروان) متوليا على	اور جب مروان حضرت معاویہؓ کی طرف سے
المدينة لمعاوية كان يسب	مدینہ کا گورنر تھا تو ہر جمعہ کو منبر پر حضرت علیؓ
عليا كل جمعة على المنبر	پر سب کیا کرتا تھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حوالہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہے کہ مروان حضرت معاویہؓ کے حکم سے حضرت علیؓ پر سب کیا کرتا تھا، پھر یہ کہنا کہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے ان کے تمام گورنر حضرت علیؓ پر "سب و شتم" کی بوچھاڑ کرتے، اور اس کے ثبوت میں مروان کے اس ذاتی فعل کو پیش کرنا دیانت کی کون سی قسم ہے؟ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو زیادہ سے زیادہ حضرت علیؓ پر سب کرنا مروان کا ایک ذاتی فعل قرار پاتا ہے، جس کا حضرت معاویہؓ سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور حضرت معاویہؓ کے مروان کو سب و شتم کرنے کا حکم نہ دینے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے مروان کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت سعید بن العاصؓ کو مدینہ کا گورنر مقرر

کر کے بھیجا تو انھوں نے کبھی بھی حضرت علیؓ پر سب نہیں کیا[1]۔ اگر حضرت معاویہؓ کی طرف سے اپنے "تمام گورنروں" کو حضرت علیؓ پر سب و شتم کرنے کا حکم ہوتا، تو یقیناً سعید بن العاصؓ بھی ایسا ہی کرتے، مگر ان کا ایسا نہ کرنا، اور پھر حضرت معاویہؓ کا ان سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ مروان حضرت علیؓ پر "سب کرتا تھا"۔

پھر قابل غور بات یہ ہے کہ وہ جس چیز کو "سب و شتم کی بوچھاڑ" اور "گالی" کے نام سے مروان اور ان کے واسطہ سے حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے وہ آخر تھی کیا؟ اس کی صراحت اس روایت میں تو نہیں ہے لیکن بخاری شریف کی ایک روایت سے اس کا سراغ ملتا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

ان رجلا جاء الی سھل بن سعد	بیشک ایک شخص حضرت سہل بن سعدؓ کے
فقال ھٰذا فلان لامیر المدینۃ	پاس آیا، اور اس نے کہا کہ یہ شخص یعنی امیر
یدعوا علیا عند المنبر۔	مدینہ حضرت علیؓ کو منبر کے پاس برا بھلا کہتا
قال فیقول ماذا قال یقول	ہے حضرت سہلؓ نے پوچھا کہ وہ کیا کہتا ہے؟
لہ ابو تراب فضحک	اس نے کہا کہ وہ ان کو ابو تراب کہتا ہے۔
وقال واللہ ما سماہ الا	اس پر حضرت سہلؓ ہنس دیئے، پھر کہا خدا
النبی صلی اللہ علیہ وسلم	کی قسم ان کا یہ نام تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا
وما کان لہ اسم احب الیہ	تھا اور ان کو اپنے اس نام سے زیادہ کوئی نام
منہ۔[2]	محبوب نہ تھا۔

لیجئے بات واضح ہو گئی کہ مروان کا جرم یہ تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو "ابو تراب" کہا کرتا

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۸۴۔ [2] بخاری ج ۱ ص ۵۲۵ باب مناقب علیؓ۔

تھا۔ یوں "ابوتراب" کا لفظی ترجمہ مٹی کا باپ ہے، لیکن ایک خاص موقع پر جس کا ذکر اسی حدیث میں آگے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو غبار آلودہ دیکھ کر ابو تراب کے پیار بھرے نام سے پکارا تھا، پھر حضرت علیؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا فرمودہ یہ نام اتنا پیارا لگا کہ وہ اسے فخریہ اپنے نام کے ساتھ جوڑا کرتے، اب اگر مروان نے بھی ان کو اسی نام سے یاد کر لیا تو کون سا ظلم ہو گیا؟ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مروان "ابوتراب" کو اس کے حقیقی معنی میں لے کر حضرت علیؓ کی تنقیص ہی کرتا تھا تو بھی اسے "سب وشتم کی بوچھاڑ"، اور "گالی" سے تو کسی بھی طرح تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت معاویہؓ کے ان دو گورنروں کے سلسلہ میں مذکورہ بالا دو روایتوں کے سوا اور کوئی روایت کسی گورنر یا خود حضرت معاویہؓ کے سلسلہ میں ایسی نہیں پیش کی گئی ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ حضرت معاویہؓ یا ان کے تمام گورنر" برسر منبر حضرت علیؓ کو گالیاں دیا کرتے تھے، اور جو دو روایتیں حوالہ میں پیش کی گئیں ان کی حقیقت بھی سامنے آگئی۔

پھر یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ جب معاویہؓ اپنے دور خلافت میں خود بھی اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر بھی مسجدوں کے منبروں پر کھڑے ہو کر مجمع عام میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیکر "ایک نہایت مکروہ بدعت" کا ارتکاب کر رہے تھے، تو اس کو بیان کرنیوالے اور اس پر ناگواری یا خوشی کا اظہار کرنیوالے تو بہت سے لوگ ہونا چاہیئے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف کو اپنے اس من گھڑت دعویٰ کے ثبوت کے لئے ایسی ہی روایات مل سکیں جن کے راوی ضعیف، مجہول، متروک اور جانے بوجھے کذاب ہیں، اور پھر ان مکذوبہ روایتوں میں بھی خود حضرت معاویہؓ کے حضرت علیؓ پر سب وشتم کرنے کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

علاوہ ازیں جس "جرم" کی بنیاد پر مصنف حضرت معاویہؓ سے اپنی کراہت و بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں اس "جرم کی اطلاع یا تو حضرت علیؓ کے فرزند ارجمند حضرت حسنؓ کو ہو ہی نہ سکی، یا اطلاع کے باوجود نعوذ باللہ وہ اتنے بے حس اور غیرت و حمیت سے عاری تھے کہ ان ہی معاویہؓ سے صلح کر کے زمام خلافت انکو سونپ دی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کا خلیفہ برحق ہونا تسلیم کر لیا، حقیقت یہ ہے کہ ؎

وہ بات سارے فسانے میں جسکا ذکر نہیں وہ بات "ان کو" بہت ناگوار گذری ہے

یزید کی ولیعہدی

حضرت معاویہؓ کے "جرائم" کی فہرست میں ان کا یہ "جرم" بھی بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے بعد امارت کے لئے اپنے بیٹے یزید کو نامزد کر کے "جبراً" اس کی بیعت کرا دی، اور اس طرح انھوں نے خلفائے راشدینؓ کی سنت کیخلاف شخصی و موروثی حکومت کی بنیاد رکھدی، جبکہ حکومت کا یہ تصور اسلامی تعلیمات اور اسلام کے اعلیٰ نصب العین کے قطعاً مخالف تھا، پھر یزید کی شراب نوشی زناکاری اور دیگر فسق و فجور کے افسانے جوڑ کر جرم کی سنگینی میں اس طرح اضافہ کیا جاتا ہے کہ کسی امیر کا اپنے لائق و صالح فرزند کو اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کرنا ہی اس کو متہم کرنے کے لئے کافی ہے چہ جائیکہ حضرت معاویہؓ کا اپنے "رسوائے زمانہ فرزند" یزید کو اصحابؓ رسولؐ اور بہت سے تابعین عظام جیسے اخیار امت کی موجودگی میں اپنا ولی عہد مقرر کر کے اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کرنا ایک ایسا مکروہ و شنیع فعل ہے جس کی نظیر اسلام کی پچھلی تاریخ سے نہیں پیش کی جا سکتی، چنانچہ اس "ہوا و ہوس" پر مبنی فیصلے نے اسلامی تاریخ پر بدترین اثرات ڈالے۔ اور پھر

جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری سے حضرت معاویہؓ بری نہیں ہوسکتے ۔

اس الزام یا "جرم" کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ہم درج ذیل سوالات قائم کر رہے ہیں جن کے جوابات سے صورت حال کی واقعی اور حقیقی تصویر سامنے آئے گی ۔

۱۔ کیا حضرت معاویہؓ نے قانون و اخلاق کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر محض اس لئے کہ یزید ان کا بیٹا تھا اس کو اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کر کے جبراً بیعت کرادی تھی ؟ ۔

۲۔ ایک امیر کے بعد دوسرے امیر کے تقرر کا "اسلامی طریقہ" کیا ہے اور اس سلسلہ میں خلفائے راشدین کی وہ سنت کیا ہے جس کی خلاف ورزی کر کے حضرت معاویہؓ "مجرم" بنے ؟ ۔

۳۔ کیا باپ کے بعد بیٹے کا امیر بننا، یا باپ کا اپنے بیٹے کی امارت پر رضامند ہونا، یا خود اسے اپنے بعد امارت کے لئے مقرر کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے جرم ہے؟

۴۔ کیا امیر کے لئے اپنے تمام اصحاب زمانہ سے افضل و برتر ہونا ضروری ہے ؟۔

۵۔ کیا یزید کو اس کے ہمعصر لوگ بھی شراب نوش، زناکار اور فاسق و فاجر ہی کی حیثیت سے جانتے تھے اور حضرت معاویہؓ بھی اس کے ان معائب پر مطلع تھے؟

۶۔ یزید کے ہاتھ پر ولیعہدی اور پھر امارت کی بیعت کرنے والے کون لوگ تھے اور ان کی بیعت سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ؟ ۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان سوالات کے جوابات تاریخی افسانوں اور سبائی روایات کے بجائے ان صحیح اور معتبر ذرائع سے دیں جن کے انکار کی کوئی جرأت نہ کرسکے، ساتھ ہی بقدر ضرورت ان "سبائی کارروائیوں" کی نشان دہی بھی کردیں جن کے ذریعہ منظم طور پر ایک صحابی رسول کی سیرت و کردار کو داغدار کر کے اسے ظلم کا نشانہ بنایا

گیا ہے۔

پہلے سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ یہ ایک بہتان ہے جو خوف خدا سے بے نیاز ہو کر ایک ایسی شخصیت پر باندھا گیا ہے جس کی عدالت وثقاہت کو چیلنج کرنا امت کے اجماعی عقیدے پر ضرب لگانے کے مترادف ہے، کیونکہ یزید کی ولیعہدی کی تحریک نہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہوئی نہ خود یزید کی طرف سے، بلکہ اس کی تحریک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی جو ایک جلیل القدر صحابی رسول تھے، پھر یہ تحریک بھی اس لئے نہیں ہوئی کہ یزید کو حضرت معاویہؓ کی فرزندی کا شرف حاصل تھا بلکہ امت کو فتنہ وفساد سے بچانے اور اتحاد برقرار رکھنے کے لئے ہوئی، چنانچہ "الکامل" کی وہ سبائی روایت جس کا سہارا لے کر حضرت معاویہؓ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے اس میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے یزید کی ولیعہدی کی تحریک کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ سے کہا کہ "امیرالمومنین آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمانؓ کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے، اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے، تو اختلاف برپا نہ ہو"[1]، ظاہر ہے کہ یزید کا صرف فرزند معاویہؓ ہونا اختلافات اور خون خرابے سے بچانے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے حضرت مغیرہؓ کا یزید کی ولی عہدی کی تحریک کرتے ہوئے یہ دلیل دینا کہ یزید کے ولی عہد مقرر ہو جانے سے اختلاف برپا نہ ہوگا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے خیال میں یزید کے اندر اس بات کی صلاحیت موجود تھی کہ وہ اُمت کو اختلافات اور خون خرابے سے بچا سکے، اور یہ چیز جہاں ایک طرف یزید کے کردار پر ایک صحابی رسول کی شہادت ہے وہیں

---

[1] الکامل ج ۳ ص ۲۴۹۔

حضرت مغیرہؓ کے اس جذبہ خیر کو بھی ظاہر کرنے والی ہے کہ ان کے اس مشورہ کی غرض نہ حضرت معاویہؓ کی خوشنودی تھی نہ یزید کی۔ بلکہ ان کے پیش نظر امت کا اتحاد تھا جس کو بنائے رکھنے کے لئے انھوں نے یہ مخلصانہ تجویز حضرت معاویہؓ کے سامنے رکھی تھی۔

اس وضاحت کے بعد اس الزام کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو جبراً ولی عہد مقرر کر کے اس کی بیعت کرادی۔

دوسرے سوال کے جواب میں علامہ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں۔

"خلافت کا انعقاد کئی صورتوں سے صحیح ہو سکتا ہے، اس میں سب سے اول، افضل اور صحیح ترین صورت یہ ہے کہ مرنے والا خلیفہ اپنی پسند سے کسی کو ولی عہد نامزد کر دے، چاہے یہ نامزدگی حالت صحت میں ہو، بیماری کی حالت میں ہو یا عین مرنے کے وقت ہو، اس کے عدم جواز پر نہ کوئی نص ہے نہ اجماع، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کو، اور ابوبکرؓ نے عمرؓ کو اور جس طرح سلیمان بن عبدالملک نے عمر بن عبدالعزیز کو نامزد کیا، یہ صورت ہمارے نزدیک مختار و پسندیدہ اور اس کے علاوہ دوسری صورتیں ناپسندیدہ ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں امت کا اتحاد اور امور اسلام کا انتظام قائم رہتا ہے، نیز اختلاف اور شور شرابے کا خوف نہیں رہتا۔ اس کے برعکس دوسری صورتوں میں یہ توقع ہے کہ ایک خلیفہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد امت میں انارکی اور امور شریعت میں انتشار پیدا ہو جائے اور حصول خلافت کی کوشش لوگوں کے اندر طمع کے جذبات پیدا کر دے۔"[1]

---

[1] الفصل فی الملل والاھواء والنحل ج ۴ ص ۱۶۹ منقول از خلافت و ملوکیت از صلاح الدین یوسف ص ۷۲،۴۷۔

علامہ ابن حزم کی اس تشریح سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنا ولی عہد مقرر کر کے "اسلامی قانون" کی خلاف ورزی نہیں کی۔ بلکہ انتخاب امیر کے سلسلہ میں سب سے افضل اور صحیح ترین طریقہ اپنایا۔ کیونکہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارتاً اور خلفائے راشدین میں سے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کی صراحتاً سنت ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی بھی یہی سنت ہے، کیونکہ انھوں نے بھی اپنے بعد امارت وخلافت کے لئے چھ آدمیوں کو نامزد کر دیا تھا کہ بس ان ہی میں سے کوئی ایک خلیفہ ہوگا۔ البتہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اس طریقہ کو نہیں اپنایا، یا نہ اپنا سکے۔ تو اس کا نتیجہ حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کی خلافت کے بارے میں اختلاف وانتشار کی صورت میں ظاہر ہو کر رہا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ تینوں میں سے کوئی صورت اسلامی قانون کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ باپ کے بعد بیٹے کی امارت قائم ہونے یا باپ کے اپنے بیٹے کو امارت کے لئے نامزد کرنے کی کہیں کوئی ممانعت نہیں ہے، اور کسی گری پڑی روایت سے بھی اس ممانعت کا ثبوت نہیں فراہم کیا جا سکتا ہے، پھر حضرت معاویہؓ اور یزید سے پہلے حضرت علیؓ اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت حسنؓ کی خلافت قائم ہونا اور اس پر کسی بھی حلقہ کی طرف سے یہ اعتراض نہ ہونا کہ "باپ کے بعد بیٹے کی امارت اسلامی قانون کے لحاظ سے غلط ہے" امت کے اس اجماع کو ثابت کرتا ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کا امیر ہونا کوئی جرم نہیں ہے، علاوہ ازیں جب حضرت علیؓ سے ان کے آخر وقت میں یہ دریافت کیا گیا کہ کیا ہم آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کریں؟ تو اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا "میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو"[1] حضرت

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۳۲۷۔

عہدی یا خلافت پر افضل ومفضول کی بحث چھیڑنا، "بغض معاویہؓ" کے ایک حسین عنوان سے زیادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

پانچویں سوال کے جواب کے سلسلہ میں سب سے قوی شہادت تو حضرت محمد بن علیؓ (محمد بن الحنفیہ) کی ہے جس کو حافظ ابن کثیر نے یوں نقل کیا ہے۔

"حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے داعی حضرت عبداللہ بن المطیعؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت محمد بن علیؓ بن ابی طالب کے پاس گئے اور درخواست کی کہ آپ (یزید کی) بیعت توڑ دیں، لیکن انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ ابن المطیع نے کہا کہ یزید شراب پیتا ہے، نماز نہیں پڑھتا ہے اور کتاب اللہ کے احکام کی اسے پرواہ نہیں ہے۔ محمد نے فرمایا کہ، میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی، میں یزید سے ملا ہوں، ان کے ساتھ رہا ہوں میں نے ان کو نماز کا پابند، خیر کا متلاشی، فقہ کا سائل اور سنت کا متبع پایا،.........الخ [1]

حضرت علیؓ کے فرزند حضرت محمد نے یزید سے اپنی ذاتی واقفیت کی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن المطیع کے اس بیان کی تردید کی کہ یزید شراب پیتا ہے، نماز نہیں پڑھتا ہے اور کتاب اللہ کے احکام کی پرواہ نہیں کرتا، پھر ان کی اس تاویل پر کہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۲۳۳۔ یہ روایت کافی طویل ہے جس میں آگے ذکر ہے کہ ابن المطیع نے ہر چند کوشش کی کہ محمد بن الحنفیہ کسی طرح یزید کی بیعت توڑ کر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حمایت پر آمادہ ہو جائیں حتیٰ کہ یہ پیش کش بھی کی کہ اگر آپ خود یزید کے بجائے خلافت کی بیعت لینا چاہیں تو ہم آپ کی خلافت تسلیم کرنے کو تیار ہیں، مگر حضرت محمد بن الحنفیہ یزید کی بیعت توڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

علیؓ کے اس جواب سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ بھی باپ کے بعد بیٹے کی امارت و خلافت میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے ورنہ وہ یہ جواب نہ دیکر یہ کہتے کہ "یہ طریقہ اسلامی قانون کے لحاظ سے غلط ہے، اس لئے تم لوگ ایسا نہ کرنا" یا کم سے کم یہ کہتے کہ میرے لئے اپنے بیٹے کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے جرم ہے اس لئے میں یہ کام نہیں کر سکتا، پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت علیؓ سے یہ دریافت کرنے والے ایک صحابی رسول حضرت جندبؓ بن عبداللہ تھے، اگر باپ کا اپنے بیٹے کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کرنا اسلامی قانون کے خلاف ہوتا تو حضرت جندبؓ خود ہی اس سلسلہ میں حضرت علیؓ سے استفسار نہ کرتے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات بھی محض حضرت معاویہؓ پر اعتراض جڑنے کے لئے اٹھائی گئی ہے ورنہ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے لئے امارت و خلافت کی اہلیت تو شرط ہے لیکن اس کا اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے افضل ہونا ضروری نہیں ہے نہ ہی عملاً اس کا اہتمام ہو سکتا ہے، کیونکہ فضیلت کا کوئی ایک مقرر پیمانہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی شخص کو من کل الوجوہ افضل قرار دیا جا سکے۔

یہ صحیح ہے کہ یزید کی ولیعہدی اور پھر امارت کے وقت اکابر صحابہؓ اور بہت سے ایسے تابعینؒ موجود تھے جن کو ہر طرح یزید پر فضیلت حاصل تھی، لیکن کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود حضرت معاویہؓ اپنے دور کے تمام اصحابؓ سے افضل تھے؟ اور پھر ان سے پہلے حضرت حسنؓ کی خلافت کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے بہت سے اکابر صحابہؓ موجود تھے جن کو علم و فضل میں حضرت حسنؓ پر برتری حاصل تھی، اس کے باوجود حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ ہی خلیفہ مقرر ہوئے، ایسی صورت میں یزید کی ولی

"یزید نے نماز کی پابندی وغیرہ جیسے نیک عمل آپ کو دکھانے کے لئے کئے ہونگے" جواباً عبداللہ بن المطیع سے جب یہ استفسار کیا کہ کیا تم نے خود یزید کو شراب پیتے دیکھا ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ "اگرچہ میں نے خود نہیں دیکھا مگر میرے نزدیک یہ بات سچی ہے" ۔ اس تفصیل سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ یزید کے ہمعصروں میں بھی اس کے فسق وفجور کا چرچا تھا جس کی بنیاد پر حضرت ابن المطیع جیسے بزرگوں کو یزید کے فسق کا یقین ہوگیا تھا لیکن حضرت محمد بن الحنفیہ جیسے بزرگوں کا اپنے ذاتی علم و واقفیت کی بنیاد پر یزید کو اس الزام سے بری قرار دیتے ہوئے اس کی نمازوں کی پابندی، خیر کی تلاش، اور سنت کی اتباع کی گواہی دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یزید دشمنوں کی طرف سے اس کی شراب نوشی و دیگر منکرات میں ملوث ہونے کا پروپیگنڈہ اور بات ہے لیکن اس کے لئے کوئی معتبر عینی گواہ نہ تھا۔

اسی طرح بخاری شریف کی ایک روایت سے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واضح طور پر یہ موقف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی قیادت میں اہل مدینہ کی یزید کے خلاف چھیڑی جانے والی مہم کو بغاوت تصور کرتے تھے اور انھوں نے اپنے خاندان والوں کو سختی کے ساتھ اس سے منع کیا تھا۔ الفاظ روایت یہ ہیں۔

عن نافع قال لما خلع اهل	حضرت نافع سے روایت ہے کہ جب اہل
المدینة یزید بن معاویة	مدینہ نے یزید کی بیعت توڑ دی تو حضرت
جمع ابن عمر حشمه وولده	عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے مخصوصین واولاد
فقال انی سمعت النبی صلی	کو جمع کیا اور کہا کہ میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم
الله علیه وسلم یقول ینصب	کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن

لكل غادر لواء يوم القيامة	بر بغاوت کرنے والے کے لئے ایک جھنڈا
وانا قد بايعنا هذا الرجل	گاڑا جائیگا، اور ہم نے اس شخص (یزید)
على بيع الله ورسوله وانى	سے اللہ اور اس کے رسول کے نام پر بیعت
لا اعلم غدرا اعظم من	کی ہے اور میں اس سے بڑی کوئی غداری
ان يبايع رجل على بيع	نہیں جانتا کہ کسی شخص سے اللہ اور اس
الله ورسوله ثم ينصب له	کے رسول کے نام کی بیعت کی جائے، پھر
القتال وانى لا اعلم احدا	اسی کے مقابلہ میں قتال کے لئے کھڑا ہوا
منكم خلعه ولا تابع فى	جائے، اور مجھے یہ علم نہ ہو کہ تم میں سے کسی
هذا الامر الا كانت الفيصل	نے یزید کی بیعت توڑ دی اور اس معاملہ
بينى وبينه۔	میں کوئی حصہ لیا، ورنہ میرے اور ایسا کرنے
(بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۳)	والے کے درمیان کوئی تعلق نہ رہے گا۔

حضرت ابن عمرؓ کا یزید کی بیعت پر قائم رہنے کے لئے یہ اصرار، اپنے متعلقین واولاد کو اہتمام کے ساتھ جمع کرکے بیعت کے پابند رہنے اور خلاف ورزی کی صورت میں ان سے ترک تعلق کر لینے کی دھمکی دینا، اور یزید کے خلاف قتال کو غدر سے تعبیر کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یا تو ان کو فسق یزید، کے پروپیگنڈے کا علم نہ تھا، یا وہ اس پروپیگنڈے پر اعتماد نہ کرکے اس کو امارت وخلافت کے منصب کے لئے موزوں قرار دیتے تھے، اور یزید کے ہاتھ پر کی ہوئی بیعت کو وہ اللہ اور اس کے رسول کی بیعت گردانتے تھے، اور اس سلسلہ میں اہل مدینہ کی مخالفانہ کارروائیوں کو خلاف حق اور غداری سمجھتے تھے۔

اسی طرح بلاذری کی انساب الاشراف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے افقہ واعلم صحابی کی یزید کے بارے میں یہ شہادت موجود ہے۔

ان ابنه یزید لمن صالحی اهله فالزموا مجالسکم واعطوا طاعتکم وبیعتکم۔	بیشک معاویہؓ کا بیٹا یزید ان کے گھرانے کے نیک لوگوں میں سے ہے، تو تم لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہو اور اس کی فرمانبرداری اور بیعت پر قائم رہو۔

یزید کے ہمعصروں میں سے یہ وہ چند نام ہیں جن کی عظمت وجلالت پر ہر مسلمان کو کامل اعتماد ہے اور جنھوں نے اپنے اقوال واعمال کے ذریعہ یزید کی شراب نوشی اور دوسری فسق وفجور کی داستانوں کی تغلیط کی ہے، اب اگر ان کے مقابلہ میں کچھ ہم عصر ایسے ہوں بھی جو یزید کو شراب نوش، زناکار اور فاسق وفاجر گردانتے ہوں تو اولاً تو ان کی بات ان اکابر صحابہؓ کے مقابلہ میں اہمیت نہیں رکھتی، پھر اگر وہ بہت ہی قابل لحاظ واحترام شخصیات ہوں تو بھی یہی سمجھا جائیگا کہ وہ لوگ یزید مخالف پروپیگنڈے سے اسی طرح متأثر ہوگئے جس طرح حضرت عبداللہ بن المطیع متأثر ہوگئے، کیونکہ کسی بھی معتبر معاصر نے یہ گواہی نہیں دی ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے یزید کو فسق وفجور میں مبتلا دیکھا ہے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ یزید کے معائب اور فسق وفجور پر کیونکر مطلع ہوں گے؟

چھٹے سوال کا جواب یہ ہے کہ بیعت کرنے والوں میں اکابر صحابہؓ بھی تھے، اور تابعین عظام بھی، پھر اصحاب کرام میں اصحاب بدر بھی تھے، اصحاب بیعت الرضوان بھی، اور اصحاب بیعت عقبۂ اولیٰ بھی، چنانچہ بیعت کرنے والے ممتاز اصحاب رسولؐ میں سے چند یہ تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت کعب بن عمروؓ، حضرت صہیب بن سنانؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت عمرو بن ابی سلمہؓ، حضرت عبداللہ

بن جعفرؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت عوف بن مالکؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ، حضرت ضحاک بن قیسؓ، حضرت مالک بن حویرثؓ، حضرت عمرو بن امیہؓ، حضرت عقبہ بن نافعؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت مقدام بن معدیکربؓ، حضرت ثابت بن ضحاکؓ وغیرہم۔

یہ اور ان سے زائد دیگر اصحاب رسول، تابعین عظام اور صلحائے امت کے یزید کی امارت کو تسلیم کر کے اس کی بیعت کر لینے سے درج ذیل نتائج بدیہی طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حضرت معاویہؓ نے یزید کی بیعت جبراً نہیں لی تھی، ورنہ اتنی بڑی تعداد میں خیر القرون کے افراد اس بیعت پر اتفاق نہ کرتے، اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت معاویہؓ اتنے بڑے زور دست تھے کہ ان کے سامنے کسی کا بس نہ چل سکا تو ان کی وفات کے بعد ان سب ہی کو یا کم از کم ان کی بڑی تعداد کو یزید کی بیعت توڑ دینا چاہیئے تھی۔

۲۔ حضرت معاویہؓ کا یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا کوئی غیر شرعی یا غیر اخلاقی کام نہ تھا، بلکہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے امت کے مفاد کا یہی بہترین تقاضا تھا، اور اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو صحابہ کرامؓ جیسی پاکباز جماعت کی ایک بڑی تعداد کو حق سے منحرف اور مداہنت کار تسلیم کرنا پڑے گا۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

۳۔ یزید بن معاویہؓ اونچے درجہ کا متقی و پرہیزگار شخص نہ سہی، لیکن سبائی پروپیگنڈے اور من گھڑت روایتوں کے ذریعہ یزید کے فسق و فجور اور حدود اللہ سے تجاوز کی جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں، اور جس طرح اسلام کی "قانونی خلافت و امارت" کے لئے اسے نا اہل گردانا جاتا ہے، یزید کے ہم عصر صحابہؓ اور تابعین کی غالب اکثریت اسے غلط اور بے اصل سمجھتی تھی، ورنہ یہ ماننا ہوگا کہ یہ "اخیار امت" حمیت دینی

اور شعور ملی سے محروم تھے، اس لئے انھوں نے "ایک فاسق و نااہل" فرد کے ہاتھ پر بیعت قبول کرلی تھی۔

۴۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنی "خواہش نفس" کی تکمیل کے لئے ولی عہد نہیں مقرر کیا تھا، نہ ہی ان کے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا، اور نہ ہی اس سلسلہ میں انھوں نے کسی زور زبردستی سے کام لیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی تحریک اور بصرہ، مدینہ، اور کوفہ وغیرہ کے اکثر اہل الرائے اصحاب کے مشورے اور پرجوش حمایت پر انھوں نے یزید کو ولیعہد مقرر کیا۔ اور چند اصحابؓ کے سوا باقی تمام لوگوں نے برضا و رغبت پہلے یزید کی ولی عہدی کی اور پھر امارت کی بیعت کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کر کے نہ کسی اسلامی قانون کی خلاف ورزی کی، نہ ہی خلفائے راشدین کی کسی "متفق علیہ" سنت سے بغاوت کی، اور نہ ہی ان کا یہ فیصلہ "ہوا وہوس" پر مبنی تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے منتشر افراد ملت کو متحد کرنے کا جو عظیم الشان اور بے مثال کارنامہ انجام دیا تھا اور اس کے لئے جیسی جیسی صعوبتیں برداشت کی تھیں اس کا فطری تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے بعد بھی اس اتحاد کے برقرار رہنے کے خواہش مند تھے، اور جب پوری مملکت اسلامیہ کے اہل الرائے افراد کی غالب اکثریت نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ کے بعد یزید کا امیر ہونا اور آپ کی طرف سے اس کا ولیعہد مقرر کر دینا ہی بہتر اور مناسب طریقہ ہوگا، تو انھوں نے یزید کو ولی عہد مقرر کر کے اس کی بیعت عام لے لی۔

اب رہے وہ حوادث جو یزید کے دور امارت میں پیش آئے تو ظاہر ہے کہ نہ حضرت معاویہؓ عالم الغیب تھے جو اپنی وفات کے بعد پیش آنے والے حوادث سے مطلع ہوتے

نہ ہی وہ تضادات رد کو ٹلنے پر قدرت رکھتے تھے، البتہ انھوں نے اپنی دور اندیشی تدبر اور سیاسی بصیرت کے ذریعہ یہ اندازہ ضرور کرلیا تھا کہ یزید کو اپنے دور امارت میں کچھ مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑیگا، اور انھوں نے حضرت حسینؓ بن علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ وغیرہما کے سلسلہ میں واضح طور پر یزید کو کچھ وصیتیں بھی کی تھیں، اور ہم یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اگر یزید نے حضرت معاویہؓ کی ان وصیتوں پر پوری طرح عمل کیا ہوتا تو ہماری تاریخ ان صدموں سے دوچار نہ ہوتی جن کی وجہ سے یزید کا دور امارت بدنام ہوا، اور جن کے ذریعہ "سبائیوں" کو اسلامی تاریخ کو مسخ کرنیکا موقع مل گیا، اس جگہ چونکہ یزید اور اس کا دور امارت ہمارا موضوع بحث نہیں ہے اس لئے ہم اس کی تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے آخری طور پر یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ یزید کے کسی اچھے یا برُے فعل کی ذمہ داری حضرت معاویہؓ پر ڈالنا بدترین ظلم ہے، اور یزید کے دور امارت میں پیش آنے والے حوادث کے لئے حضرت معاویہؓ کے "انتخاب" پر طعن کرنے والے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دل خدا کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے خیال سے عاری ہوں،

کچھ اور کرم فرمائیاں

حضرت معاویہؓ پر بنیادی حیثیت کے ان دو اعتراضات کی وضاحت اور اسی ذیل میں سبائی کارروائیوں کی نشاندہی کے بعد اس سلسلہ کے دیگر فروعی الزامات کو بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں رہ گئی کیونکہ قارئین پر یہ بات بخوبی واضح ہو چکی کہ حضرت معاویہؓ کو مطعون کرنے اور تاریخ کی بے قیمت و مکذوبہ روایات کے ذریعہ ان پر تہمتیں باندھنے والے یا تو وہ معاندین ہیں جن کے عناد اور اصحاب دشمنی کے جذبات نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا، یا وہ جاہل لوگ

ہیں، جن کا سرمایہ معلومات وہ " بکائی شہادت نامے " اور " علم سینہ " ہیں جن پر اعتماد کو " اپنے ایمان کی حفاظت " کے لئے وہ ضروری سمجھتے ہیں، تاہم " کچھ اور کرم فرمائیوں " کی طرف ہم اس لئے اشارے کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ اس مظلوم صحابی رسول کے خلاف کیسے کیسے اوچھے ہتھیار استعمال کئے گئے ہیں۔

حضرت معاویہؓ اور ملوکیت

حضرت معاویہؓ پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا، اور پھر " ملوکیت " کی تشریح اس انداز میں کی جاتی ہے کہ ان کے دور میں فسق و فجور، ظلم و جور، دھاندلی و زور دستی، بد چلنی اور اقربا پروری جیسے رذائل کا عام چلن ہو گیا۔

اگر " ملوکیت " کا عام اور سیدھا سا مفہوم " بادشاہت " ہی سمجھ لیا جائے تو بھی قابل غور بات یہ ہے کہ تاریخ کے صفحات میں ایسے بہت سے بادشاہوں کے حالات محفوظ ہیں جن کے عدل و انصاف، سخاوت و شجاعت، رحم دلی اور رعایا پروری پر مورخین اتفاق کرتے ہوئے ان کی " بادشاہت " کے دور کی عمدہ اور مثالی تصویر کشی کرتے ہیں، مثلاً حاتم طائی، نجاشی یا ہمارے ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر وغیرہ، پھر کیا یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ حضرت معاویہؓ خلیفہ نہیں " ملک " (بادشاہ) " تھے، یہ تسلیم کرنا کہ وہ عام دنیاوی بادشاہوں میں بھی " اپنے کارناموں " کی وجہ سے بہت پست مقام کے حامل تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی توہین، آپ کی دعا کی نامقبولیت[1]، اور ان تمام اصحاب رسول کی تذلیل و تحقیر نہ

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کے حق میں یہ دعا فرمائی۔ (باقی صـ پر)

ہوگی جنھوں نے نہ صرف یہ کہ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، بلکہ ان کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرتے رہے؟ اور ایسی صورت میں حضرت حسنؓ بن علیؓ کا کردار کتنا مسخ ہوگا۔ جنھوں نے حضرت معاویہ سے صلح کرکے اقتدار کی زمام ان کو سونپ دی تھی؟۔

حضرت معاویہؓ کے سلسلہ میں اپنے دلی بغض کا اظہار کرتے ہوئے ان کو اپنی جراحت پاشیوں کا نشانہ بنانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت معاویہ کا تعلق اس پاکیزہ جماعت سے ہے جس کی مثال تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر رہی ہے اور اس پاکیزہ معاشرہ کے کسی ایک فرد کو اپنی "جرأت مندیوں" کا نشانہ بنانا ایک ایسے باندھ کو توڑنے کے مرادف ہے جس کے بعد طوفان کو روکنا کسی کے بس میں نہیں رہتا اور اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت ربیع بن نافع نے فرمایا تھا کہ

معاویۃ ستر لاصحاب محمد	معاویہؓ اصحابؓ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک
صلی اللہ علیہ وسلم فاذا	پردہ ہیں، جب کوئی شخص اس پردہ کو کھول
کشف الرجل الستر اجترء علی	دیگا تو اس کے پیچھے کے لوگوں پر اس کی
ما وراءہ۔ ؎	جرائتیں بڑھ جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں خلفائے راشدینؓ کے دور کی بہت سی خوبیاں تو نہ تھیں، کیونکہ خلفائے راشدینؓ مباح چیزوں میں بھی صرف عزیمت پر عمل کرتے تھے اور رخصت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے، جبکہ حضرت معاویہؓ نے متعدد موقعوں پر رخصت پر عمل کیا، مثلاً رہائش اور لباس کے سلسلہ میں، اپنے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اللھم اجعلہ ھادیا مھدیا واھد بہ (اے اللہ ان کو ہدایت دینے والا، ہدایت یافتہ بنادے اور ان کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت عطا فرما۔)

؎ الخطیب: تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۰۹ منقول از حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق ص ۱۴۱۔

بیٹے کو ولیعہد بنانے کے سلسلہ میں، لیکن اگران کے دور خلافت کا موازنہ ان کے بعد کے لوگوں سے کیا جائے تو یہی نسبت ان کے، اور بعد والوں کے درمیان ہوگی، چنانچہ اس سلسلہ میں خود حضرت معاویہؓ نے فرمایا۔

لست فیکم مثل ابی بکر و عمر	میں تم میں ابوبکرؓ و عمرؓ جیسا حکمران تو نہیں
ولکن ستروت امراء من	ہوں لیکن میرے بعد بھی عنقریب تم لوگ امیر
بعدی۔ ؎	دیکھو گے۔

اور یہ حضرت معاویہؓ کی "ملوکیت" کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ مرورِ ایام کا وہ فطری نتیجہ ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:۔

خیر القرون قرنی ثم الذین	ادوار میں بہترین دور میرا ہے، پھر ان لوگوں
یلونہم ثم الذین	کا جو اس کے بعد ہیں، پھر ان لوگوں کا جو
یلونہم۔	اس کے بعد ہیں۔

اس ارشاد کا یہ مطلب کوئی نہیں لیتا کہ دورِ رسالت کے بعد خیر ختم ہونے کی بات فرمائی گئی، بلکہ منشا یہی ہے کہ خیر تو تینوں دور میں رہے گا، لیکن بتدریج اس میں کمی ہوتی جائے گی۔

اور یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں بھی شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں جو امن و عافیت اور یکجہتی تھی وہ ختنین یعنی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں باقی نہیں رہی، اسی لئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے خلافت راشدہ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے دو خلفاء کی

؎ منصب امامت، ترجمہ حکیم محمد حسین علوی منقول از حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق ص ۱۳۹۔

خلافت کو خلافت خاصہ سے تعبیر فرمایا ہے[1]۔

رہا حضرت معاویہؓ کے "دورِ ملوکیت" کو فسق وفجور کی داستانوں سے بگاڑنے کا معاملہ، تو اس کی کچھ حقیقت ہم بیان کر چکے اور اسی سے سبائی کارروائیوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے گورنروں کے مظالم

ایک الزام یہ بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو من مانی کرنے کی چھوٹ دیدی تھی، اور وہ طرح طرح کے مظالم کرتے، پھر ان کی شکایت حضرت معاویہؓ سے کی جاتی تو بجائے گورنروں سے باز پرس کرنے اور ان کو سزا دینے کے ان کی طرف سے دفاع کرتے، اور اپنے ظالم گورنروں کی پشت پناہی کر کے ان کو اور بھی ڈھیٹھ بناتے۔ چنانچہ ان کے گورنروں میں سے عبداللہ بن غیلان نے صرف اس جرم میں کہ ایک شخص نے اس کو منبر پر خطبہ دیتے وقت ایک کنکر مار دیا تھا، اس شخص کے ہاتھ کٹوا دیئے، اور جب یہ شکایت حضرت معاویہؓ کے پاس پہونچائی گئی تو انھوں نے صاف جواب دیدیا کہ "میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کردونگا مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں"۔

اسی طرح ایک دوسرے گورنر زیاد نے بہت سے لوگوں کے ہاتھ اسی جرم میں کٹوا دیئے کہ ان لوگوں نے خطبہ دیتے ہوئے زیاد پر پتھر پھینکے تھے، مگر اس گورنر کے خلاف بھی حضرت معاویہؓ نے کوئی کارروائی نہیں کی، اس کے علاوہ اور بھی ایسے واقعات ہیں جن سے حضرت معاویہؓ کے گورنروں کے مظالم، اور ان مظالم کی حضرت معاویہؓ کی طرف سے پشت پناہی کے ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔

افسوس یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ پر یہ اور اس جیسے دوسرے الزام اگر ان لوگوں کی طرف سے عائد کئے جاتے جو حضرت معاویہؓ کی صحابیت ہی کے منکر ہیں تو ہمارے لئے تعجب کی کوئی بات نہ ہوتی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ ان کو صحابی رسول بھی مانتے ہیں وہ کس دل سے بیہودہ، لچر اور تاریخ کی مردود و غیر معتبر روایات کا سہارا لیکر ایسی باتیں زبان و قلم پر لے آتے ہیں جن کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد حضرت معاویہؓ کی ایک جلیل القدر صحابی رسول کی حیثیت تو کجا، پندرہویں صدی ہجری کے ایک عام شریف انسان کی حیثیت بھی باقی نہیں رہتی؟ "بغض معاویہؓ" کے یہ مریض اتنا بھی نہیں سوچ پاتے کہ ان کی سجائی ہوئی داستانوں کی روشنی میں "جماعت صحابہؓ" کے ایک ممتاز فرد کی ایسی گھناونی تصویر سامنے آنے کے بعد کیا پوری جماعت مشکوک نہ ہو جائے گی ؟

سچائی یہ ہے کہ الزام کو الزام اور جرم بنانے کی خاطر اس سلسلہ میں پہلی کارروائی تو یہ کی گئی کہ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تاکہ گورنروں کا ظالم ہونا معلوم ہو سکے، پھر اپنی طرف سے یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ گورنروں کے ان "مفروضہ مظالم" کی اطلاعات حضرت معاویہؓ کو بھی ہوتی رہیں، اور پھر اطلاعات ملنے پر حضرت معاویہؓ نے جو کارروائیاں کیں انھیں ظلم کی حوصلہ افزائی سے تعبیر کیا گیا، اس طرح بالواسطہ طور پر حضرت معاویہؓ کو ایک ظالم اور ظلم پسند حکمراں کی حیثیت سے پیش کرنے کے بعد اپنی "حق بیانی" اور "صاف گوئی" کی داد لینے کی کوشش کی گئی ۔

حقیقت کیا ہے؟ اس کا حال ان ہی دو واقعات سے معلوم ہو سکتا ہے جن کو بطور مثال اوپر نقل کیا گیا، چنانچہ عبداللہ بن غیلان گورنر بصرہ کے اس واقعہ کی جو تفصیل حافظ ابن کثیرؒ نے بیان کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن غیلان نے کنکر مارنے پر ایک شخص کے ہاتھ تو کٹوا دیئے لیکن جب اس شخص کی قوم کے لوگ

ان کی شکایت حضرت معاویہؓ کے پاس لے کر گئے تو ان کے سامنے اپنا مقدمہ یوں پیش کیا۔

"آپ کے گورنر نے ہمارے ایک آدمی کا ہاتھ شبہ کی وجہ سے کاٹ دیا ہے، لہذا اس سے ہمیں قصاص دلوایئے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میرے گورنروں سے قصاص کی تو کوئی سبیل نہیں ہے، لیکن دیت لے لو چنانچہ ان لوگوں کو حضرت معاویہؓ نے دیت دلوائی، اور ابن عیلان کو معزول کر دیا۔"[1]

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب مقدمہ پیش کرنیوالوں نے خود ہی اس بات کا اعتراف کرلیا کہ گورنر نے ہاتھ "شبہ کی وجہ سے" کاٹا ہے تو اب اسلامی قانون کے لحاظ سے قصاص کا مطالبہ ہی غلط ہے، ایسی صورت میں اسلامی قانون وہی ہے جس پر حضرت معاویہؓ نے عمل کیا یعنی "دیت" جو کہ حضرت معاویہؓ نے دلوادی۔ پھر اس پس منظر میں حضرت معاویہؓ کا یہ فرمانا کہ "میرے گورنروں سے قصاص کی تو کوئی سبیل نہیں ہے لیکن دیت لے لو" کس طرح ظلم یا ظلم کی حوصلہ افزائی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ مزید برآں یہ کہ حضرت معاویہؓ نے صرف دیت دلوانے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس گورنر کو جس نے یہ غلطی کی تھی اگرچہ اسلامی قانون کے مطابق شبہ کا فائدہ دیکر قصاص سے بچالیا لیکن اسے اس عہدے کے لئے نااہل قرار دیتے ہوئے معزول کر دیا۔

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملہ میں حضرت معاویہؓ کا جرم کیا ہے؟ یہ کہ انھوں نے اسلامی قانون پر عمل کرتے ہوئے ملزم کو شبہ کا فائدہ دیکر دیت کے بجائے قصاص کیوں نہ دلوایا؟ یا یہ کہ انھوں نے گورنر کی غلطی و نااہلی ثابت ہوجانے کے بعد اس کو معزول کیوں کیا؟۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵

اسی طرح دوسرے گورنر زیاد کا معاملہ ہے کہ اولاً تو وہ روایت ہی ناقابل اعتماد ہے جس کے ذریعہ زیاد کا بہت سے لوگوں کا ہاتھ کٹوانا اور مسلمان عورتوں کو باندیاں بنانا بیان کیا جاتا ہے، پھر اگر وہ روایت بالکل صحیح سند سے بھی ثابت کر دی جائے تو اس سے حضرت معاویہؓ کے ایک گورنر زیاد کا ظالم اور فاسق ہونا ہی ثابت کیا جا سکے گا، اس کے ذریعہ حضرت معاویہؓ کو "مجرم" کیوں کر بنایا جا سکتا ہے؟ کیا اس کا بھی کہیں سے ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے کہ اس واقعہ کی حضرت معاویہؓ کو اطلاع ہوئی اور انھوں نے زیاد کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر کے ظلم پر اس کی حوصلہ افزائی کی؟ اگر نہیں ـــــ اور یقیناً نہیں، تو پھر حضرت معاویہؓ کے "نکتہ چینوں" کو یہ حق کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ ایسی واہی اور بے اصل تاریخی روایات کے ذریعہ ایک صحابیِ رسول کے اجلے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کریں؟۔

حضرت معاویہؓ کے کردار اور ان کی شخصیت کو مجروح کرنے والی تاریخ کی ان "سبائی روایات" کی حقیقت واضح ہونے کے بعد قارئین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ "تاریخ" کے نام سے پیش کیا جانے والا مواد کس قدر معتبر ہے؟ اور چھان پھٹک کے بغیر محض طبری، مروج الذہب اور الکامل کے حوالوں سے اسلامی تاریخ لکھنے والے کس قسم کی اسلامی خدمت انجام دے رہے ہیں؟۔

حضرت حسنؓ کو زہر خورانی اور حضرت معاویہؓ

حضرت معاویہؓ کی حضرت علیؓ اور ان کے گھرانے سے عداوت ظاہر کرنے کے لئے سبائیوں نے ایسی ایسی داستانیں تراشیں کہ بس خدا کی پناہ! اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ کیونکہ سبائیوں کا تو مشن ہی یہ تھا کہ اسلام کے اولین کرداروں اور رسالت محمدی کے عینی گواہوں کی ایک ایسی بھیانک تصویر پیش کی جائے جسے دیکھ

کر خود بخود اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت پیدا ہو جائے۔ لیکن تعجب تو ان مسلمان مؤرخین و محققین پر ہوتا ہے جنھوں نے، سبائی افسانوں، کو اپنی کتابوں میں نقل کر کے ملت اسلامیہ کو ایک مسلسل روحانی اذیت میں مبتلا کر دیا، اور ان روایتوں کو درایت و روایت کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت کا احساس نہ کر کے "نقل راچہ عقل"، کا سامان فراہم کر دیا۔

چنانچہ حضرت معاویہؓ پر باندھی جانیوالی تہمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چونکہ ان کے اور حضرت حسنؓ کے درمیان ہونے والی صلح کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ مقرر ہوں گے، اور حضرت معاویہؓ کو بعد میں، یہ خواہش پیدا ہو گئی، کہ ان کے بعد ان کا بیٹا یزید خلیفہ بنے، اس لئے انھوں نے اپنے بیٹے یزید کے ذریعہ حضرت حسنؓ کی بیوی جعدہ بنت اشعث کو ملا کر حضرت حسنؓ کو زہر دلوا دیا۔ تاکہ "نہ ہے بانس نہ بجے بانسری"، چنانچہ اس زہر کے اثر سے حضرت حسنؓ کی شہادت ہو گئی، اور پھر یزید کے ولی عہد بننے کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

اللہ! اللہ! یہ قتل عمد کا الزام کس پر لگایا جا رہا ہے؟ قتل کی سازش کرنیوالا کون ہے اور اس کا شکار ہونے والا کون؟ کیا دین و ایمان کی ادنیٰ رمق رکھنے والا گرا پڑا مسلمان بھی اپنے نبی کے کسی چہیتے کے ساتھ ایسا سلوک کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا ہے؟ چہ جائیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قریبی رشتہ دار اور آپ کے معتمد صحابی حضرت معاویہؓ پر یہ الزام کہ انھوں نے جگر گوشۂ رسول حضرت حسنؓ بن علیؓ کے قتل کی کامیاب سازش رچی؟۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو حضرت حسنؓ کو زہر دیا گیا، اور نہ ہی ان کو زہر کھلانے میں حضرت معاویہؓ، یزید اور جعدہ کسی کی شرکت کی ضرورت پیش آئی، بلکہ حضرت حسنؓ

کی وفات توسل کے مرض میں ہوئی، اور یہ بات قرین قیاس بھی ہے کیونکہ ان کے متعلق یہ بات تحقیق کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ خوشبو کا استعمال اس کثرت سے کرتے تھے کہ جس راستہ سے گذر جاتے گلیاں مہک اٹھتیں۔ قیاس یہی ہے کہ اس کثرت کے ساتھ خوشبو استعمال کرنے کی وجہ سے ان کو نزلہ ہوا، جو بگڑ کر سل کی شکل اختیار کرگیا، اور اسی مرض میں آپ کی وفات ہوئی۔

جہاں تک ان کو زہر کھلانے کی داستان کا تعلق ہے تو یہ سبائیوں کی "ایک تیر سے دو شکار" والی اسکیم ہے کہ اس کے ذریعہ ایک طرف حضرت معاویہؓ اور انکے فرزند یزید کی اور دوسری طرف ان جعدہ بنت اشعث کی جو حضرت حسنؓ کی اہلیہ ہوتے کے ساتھ ساتھ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نواسی بھی تھیں، اولاد رسول کے ساتھ عداوت و دشمنی ظاہر کی جاسکے۔ اور اس "داستان" کو عام کرکے "سبائی" تو اس پر خوش ہوگئے کہ ہم نے نہ صرف اولاد رسول کے ساتھ حضرت معاویہؓ اور ان کی اولاد کی، بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد کی دشمنی بھی ثابت کردی۔ مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ زہر خورانی کی اس داستان کو امام سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء[1] میں بھی بلا تحقیق نقل کردیا۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے علم وفضل سے کسی کو مجال انکار نہیں، نہ ہی ان کی نیت پر کسی قسم کا شبہ کیا جاسکتا ہے لیکن اہل علم وتحقیق نے ان کی یہ ایک عام کمزوری بیان کی ہے کہ وہ نقل روایات کے سلسلہ میں وہ احتیاط نہیں برتتے تھے، جس کی توقع ان جیسے محدث مفسر اور مؤرخ سے کی جاسکتی تھی، چنانچہ ان کی معروف تفسیر "جلالین" میں بھی ان کی یہ کمزوری ابھر کر سامنے آئی ہے، اور ان کی تالیف "تاریخ الخلفاء" تو بس ایک مسلسل بیان ہے صحت وسقم کا لحاظ کئے بغیر وہ ہر قسم کی "روایت" کو اس میں جمع کردیتے ہیں (بقیہ صـ پر)

توفي الحسن رضي الله عنه بالمدينة	حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات مدینہ
مسموماً سمته زوجته جعدة	میں زہر کے اثر سے ہوئی، ان کو ان کی اہلیہ
بنت الاشعث بن قيس ودس	جعدہ بنت اشعث بن قیس نے زہر دیا
اليها يزيد بن معاوية	تھا یزید بن معاویہؓ نے انھیں ورغلایا کہ
ان تسمه فيتزوجها	وہ ان کو زہر دیدیں تو وہ خود ان سے شادی
ففعلت فلما مات الحسن	کرے گا، چنانچہ انھوں نے یہ کرلیا، پھر
بعثت الى يزيد تسأله	جب حسنؓ کی وفات ہوگئی تو جعدہ نے یزید
الوفاء بما وعدها فقال	کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اپنا وعدہ پورا
لم نرضك للحسن افنرضاك	کرے، تو یزید نے کہا کہ "ہم نے تو تمہیں
لانفسنا۔	حسنؓ کے لئے پسند نہیں کیا، تو کیا اپنے لئے
(تاریخ الخلفاء ص۱۹۲)	پسند کریں گے"۔ [1]

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اسی لئے محققین نے تاریخ الخلفاء کو سند اور حوالہ کی کتاب کا درجہ نہیں دیا ہے، کیونکہ اس کتاب میں ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع روایات تک کثرت سے جمع کردی گئی ہیں۔

[1] اس کہانی کے موضوع ہونے پر یزید کی زبان سے کہلوایا ہوا یہ جملہ کہ "ہم نے تو تمہیں حسنؓ کے لئے پسند نہیں کیا تو کیا اپنے لئے پسند کریں گے؟" کافی ثبوت ہے، کیونکہ اس جملہ سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یزید کو اصل نفرت جعدہ سے تھی، حسنؓ سے نہیں، پھر حضرت حسنؓ کو زہر دلواکر ان کی زندگی کا خاتمہ کرانے کا کیا مطلب؟ اور اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ وہ حضرت حسنؓ کو اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھ کر ان کو قتل ہی کرانا چاہتا تھا تو پھر جعدہ سے اس کی نفرت کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ جعدہ نے تو "اسی کی خواہش پر" اس کی ایک بڑی مشکل حل (بقیہ ص پر)

یہ بات سب کو معلوم اور تسلیم شدہ ہے کہ حضرت حسنؓ کافی دن بیمار رہے، ان کو دست آتے رہے اور خون بھی آتا رہا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ اسی زہر کا اثر تھا جو ان کو کھلایا گیا تھا، کیونکہ زہر تیز اثر والا نہ تھا، بلکہ دھیرے دھیرے گھلا کر ختم کرنیوالا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ زہر کی یہ قسم اس وقت پائی بھی جاتی تھی یا نہیں، اور اس کا استعمال حضرت حسنؓ کے علاوہ اور کن کن لوگوں پر کیا گیا؟ پھر سوال یہ ہے کہ زہر خورانی اور زہر کی قسم کی یہ ساری تفصیلات کس نے بتائیں؟ کیا کسی ضعیف سے ضعیف یا موضوع روایت سے بھی اس کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت حسنؓ نے خود بیان دیا ہو کہ ان کو معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کی معرفت جعدہ کے ہاتھوں زہر دلوایا ہے؟ کیا حضرت حسنؓ کے گھر والوں میں سے کسی نے ایسا کوئی بیان دیا ہے؟ کیا حضرت حسنؓ کے حقیقی چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ کو اس واقعہ کا علم تھا؟ اور کیا ان کی طرف سے عوام کے سامنے یا اسلامی عدالت کے سامنے اس طرح کا کوئی دعویٰ پیش کیا گیا کہ میرے بھائی حسنؓ کی موت فطری نہیں ہوئی بلکہ ان کو زہر دیکر ہلاک کرایا گیا ہے؟

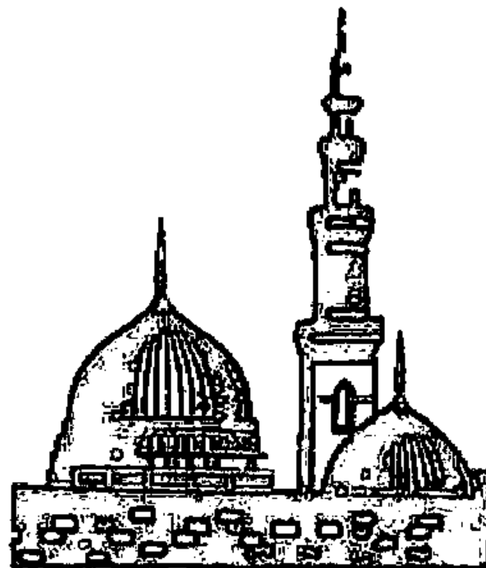
اور اگر یہ سب کچھ نہیں ——— اور یقیناً نہیں، تو پھر بعد والوں کو یہ تفصیلات کس نے بتائیں، اور حضرت حسنؓ کی فطری وفات کو زہر خورانی کے ذریعہ "شہادت" بنانے کا کارنامہ کیوں انجام دیا گیا؟

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کر دی تھی۔ اور اگر قتل حسنؓ کی وجہ سے اس کی نظر میں جعدہ کی وفاداری مشکوک ہو گئی تھی، اور ایسی عورت کو اپنی بیوی بنا کر وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا تو اس جواب کے بجائے اس کا سیدھا جواب یہ ہونا چاہیئے تھا کہ "جب تم نے حسنؓ کیساتھ وفا نہ کی تو میرے ساتھ کیا کرو گی"؟ غرضیکہ یزید کی زبان سے کہلوائے گئے اس جملہ سے ہی اس بیان کا جعلی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

اور ان تمام سوالوں کے بعد ایک آخری سوال یہ کہ جعدہ اور یزید تک تو امام سیوطیؒ بھی ساتھ دیدیں گے، یہ حضرت معاویہؓ کا نام کس جذبہ سے ٹانکا گیا ہے، اور اس کے لئے کس ،،موضوع روایت،، کا سہارا لیا جاتا ہے ؟ ۔

کاش ان تفصیلات کے سامنے آنے کے بعد ہی ہمارے ،،بسیار نویسی،، کے شوقین مؤرخین و محققین کو ہوش آجائے اور وہ یہ احساس کرلیں کہ ،،حقیقتوں،، کو ،،افسانوں،، کے ذریعہ بیان کرنے کا انجام اچھا نہیں ہوا کرتا ۔

یوں تو حضرت معاویہؓ کے ساتھ ،،کرم فرمائیوں،، کی فہرست بہت طویل ہے لیکن درج بالا وضاحتوں ہی سے قارئین کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوگا کہ حضرت معاویہؓ کی شخصیت تاریخ کی ایک مظلوم شخصیت ہے، اور ،،غیروں،، کے ساتھ ہی ساتھ ،،اپنوں،، کی بھی ان پر کچھ کم ،،نوازشیں،، نہیں رہی ہیں ۔



حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما

حضرت حسینؓ کی مظلومیت اتنی آشکار، اتنی واضح، اور اتنی تسلیم شدہ ہیکہ ان کے سلسلہ میں اس وضاحت کی چنداں حاجت نہیں ہیکہ تاریخ کی مظلوم شخصیتوں میں ان کا بھی ایک اہم مقام ہے، بلکہ سچ تو یہ ہیکہ اگر اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی مظلوم شخصیت کے بارے میں استفسار کیا جائے تو مسلمانوں کی واضح اکثریت کی زبانوں پر حضرت حسینؓ ہی کا نام آجائیگا، اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ قرن اول سے آج تک کے شہدائے اسلام میں جتنا کچھ حضرت حسینؓ اور ان کی شہادت کے بارے میں لکھا اور کہا گیا کسی دوسرے اسلامی شہید کے بارے میں نہیں لکھا اور کہا گیا، مگر یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ حضرت حسینؓ کے بارے میں اتنا لکھا اور کہا جانا، ان کی بیدردانہ شہادت سے بھی زیادہ ان کی مظلومیت کا باعث بن گیا، اور حقیقت یہ ہیکہ ان کے شہید کربلا بننے سے کہیں بڑی مظلومیت یہ ہے کہ بعد کی نسلوں کے سامنے ان کی شہادت کی تفصیلات کو جس متضاد انداز میں پیش کیا گیا اس نے ان کی شخصیت اور مقصد شہادت دونوں پر دبیز پردے ڈال دئیے، اور نتیجہ کے طور پر یہ صورت حال پیدا ہوگئی کہ خود شہادت حسینؓ ہی نزاعی بن کر رہ گئی، ہماری تاریخ کا یہ المیہ مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ کس قدر فکر

انگیز اور عبرتناک ہے کہ حسینؓ کو شہید مظلوم بلکہ "سید الشہداء" و "شہید اعظم"
قرار دینے والوں کو جن تاریخی مجموعوں سے روایات مل جاتی ہیں ان ہی مجموعوں
سے ان کو "مجتہد مخطی" بلکہ "باغی" اور بلکے الفاظ میں "خروج کرنے والا" قرار
دینے کے لئے بھی روایات مل جاتی ہیں، حضرت حسینؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے نواسے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بیٹے تھے، اس ایک فضیلت کے
سوا ان کی کتاب فضائل میں کا کون سا عنوان ہے جسے نزاعی نہ بنا دیا گیا ہو؟
وہ صحابی رسول تھے یا نہیں؟ ان کو زبان رسالت سے جوانان جنت کا سردار
قرار دیا گیا یا نہیں؟ وہ محبوب رسول اللہ تھے یا نہیں؟ یزید سے ان کا انکار
بیعت صحیح تھا یا نہیں؟ کوفیوں کی دعوت پر ان کا سفر کرنا درست تھا یا نہیں؟ وہ
محافظ اسلام تھے یا حریص خلافت؟ انھیں شہید مظلوم قرار دیا جائے یا باغی مقتول؟
یہ متضاد سوالات ہی نہیں بلکہ ایسی دو متوازی فکریں ہیں جن پر امت مسلمہ کی بہترین
صلاحیتیں صدیوں سے صرف ہو رہی ہیں۔ اور ہم پورے یقین کے ساتھ یہ بات
کہہ سکتے ہیں کہ سبائیوں کی یہ وہ سب سے بڑی کامیابی ہے جسکو عام کرنے کا
سہرا ابو مخنف لوط بن یحییٰ، ہشام کلبی، محمد بن ہشام، واقدی، مسعودی اور محمد بن
جریر طبری کے سر بندھتا ہے، کیسی عجیب ہے یہ بات کہ ہمارے مؤرخین و محققین
آج تک حتمی طور پر بھی فیصلہ نہ کر سکے کہ نواسۂ رسول سیدنا حسینؓ کا قتل کن ہاتھوں
سے ہوا، اور ان کے اصل قاتل کون لوگ تھے، اور اسلامی قانون کے لحاظ سے ان
کا مقام کیا ہے؟ کسی کو رافضی یا کسی کو خارجی قرار دیکر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ لینا
اور بات ہے، لیکن سچائی یہ ہے کہ حضرت حسینؓ کی اصل مظلومیت یہی ہے کہ ان
کو شہید جور و ستم قرار دینے والے بھی مسلمان قرار دیئے جاتے ہیں، اور انھیں
باغی و جارح کی حیثیت سے یاد کرنے والے بھی علانیہ طور پر مسلمان ہی گردانے جاتے

ہیں، جبکہ شہید و باغی دونوں کے علٰحدہ علٰحدہ دنیاوی احکام اور اخروی انجام سب ہی کو معلوم ہیں۔

حضرت حسینؓ کی صحابیت

حضرت حسینؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ولادت ہونے، حضورؐ کے ان کا نام رکھنے، ان کی تحنیک کرنے، ان کا عقیقہ کرنے، اور ان کے حق میں دعائے خیر کرنے کے سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اختلاف ہوا تو صرف اس بات میں کہ اصطلاحی طور پر ان کو صحابیت کا شرف حاصل ہوا یا نہیں؟ اور اس اختلاف کی بنیاد وہی ہے جس کا ذکر ہم حضرت حسنؓ کی صحابیت کے سلسلہ میں مفصل طور پر کر آئے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت حسنؓ ہی بہت کمسن تھے، چہ جائیکہ ان کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ جو کم از کم ۱۱ ماہ تو ان سے چھوٹے تھے ہی[1]، اس لئے حضرت حسنؓ کی طرح

---

[1] حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں کی تاریخ ولادت کے سلسلہ میں بھی متعدد اقوال ہیں اور اس سلسلہ میں بھی کہ ان دونوں بھائیوں کے درمیان عمروں کا کتنا تفاوت تھا؟ حافظ ابن کثیرؒ، علامہ ابن عبد البرؒ اور علامہ ابن الاثیر جزری اور اکثر دوسرے مؤرخین کے بیان کے مطابق حضرت حسنؓ کی ولادت رمضان ۳ھ میں اور حضرت حسینؓ کی ولادت شعبان ۴ھ میں ہوئی، اور اس طرح ان دونوں کے درمیان ۱۱ ماہ کا فرق تھا، اس کے علاوہ دوسرے اقوال بھی ہیں، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے تو حضرت حسنؓ کی ولادت ۸ھ اور حضرت حسینؓ کی ولادت ۹ھ میں بتائی ہے اور ان دونوں کے درمیان عمروں کا تفاوت ڈیڑھ سال بتایا ہے، مگر مشہور قول وہی ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا۔

حضرت حسینؓ بھی صحابی نہ تھے، ہم حضرت حسنؓ کی صحابیت کی بحث میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ عام طور پر محدثین واہل علم صحابی اس خوش نصیب شخص کو قرار دیتے ہیں جس نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو، اور پھر ایمان ہی کی حالت میں اس کی موت بھی واقع ہوئی ہو، اس کے علاوہ صحابیت کے لئے اور کوئی شرط نہیں لگاتے، اور اس تعریف کے اعتبار سے حضرت حسنؓ ہی کی طرح حضرت حسینؓ کے صحابی ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہو لیکن کچھ لوگوں نے صحابی ہونے کے لئے حضورؐ کے ساتھ صحبت[1] طویلہ کی بھی قید لگائی ہے، یا اسی طرح بعض لوگوں نے روایت کی قید لگائی ہے، ان قیود کی رعایت کر کے بھی حضرت حسینؓ کی صحابیت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ جن لوگوں نے صحابی ہونے کے لئے بالغ ہونے کی قید لگائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس وقت ملاقات ہو اس وقت بالغ ہو تب ہی صحابی ہو سکتا ہے ورنہ نہیں، تو اوّلاً تو اس قول کو حافظ ابن حجرؒ اور دوسرے محدثین نے رد کر دیا ہے[2]، اور اگر اس قول کا اعتبار بھی کیا جائے تو یہ بات روایت کے لئے ہے کہ ایسا شخص جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کم عمری و نابالغی میں ملاقات کی ہو بلوغ کی حالت میں نہیں، بعض لوگ اس کو صحابی تو مانتے ہیں لیکن اس کی روایت کو تابعی کی روایت کی حیثیت دیتے ہیں یعنی اگر اس نے براہ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا عمل بیان کیا تو اسے مُرسَل کا حکم دیا جائیگا مرفوع کا نہیں[3]۔

---

[1] صحبت طویلہ:۔ حضرت سعید بن مسیبؒ کے قول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سال کے قیام سے پوری ہو جاتی ہے (فتح الباری ج ۷، ص ۲) [2] فتح الباری ج ۷، ص ۲)

حاشیہ ۳ اگلے صفحہ پر

یعنی نابالغی کی بنیاد پر جن لوگوں نے صحابیت کا انکار کیا بھی ہے وہ انکار صرف روایت حدیث کی حد تک ہے عام نہیں، اور عام طور پر وہ لوگ بھی ایسے شخص کو صحابی ہی قرار دیتے ہیں۔

ان تفصیلات کے سامنے آنے کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ تحقیق کا پورا زور صرف کر کے عہد نبوی میں حضرت حسینؓ کو بالکل "دودھ پیتا بچہ" ثابت کرتے ہیں، اور پھر اس کے بعد پورے زور و شور کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ حسینؓ اتنے کم عمر بچہ تھے کہ وہ صحابی ہو ہی نہیں سکتے، وہ کیا تأثر دینا چاہتے ہیں؟ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ روئے زمین پر انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد سب سے مقدس اور سب سے زیادہ لائق اعتماد انسانی گروہ صحابۂ کرام ہی کا ہے، کیونکہ یہی وہ جماعت ہے جس کے بارے میں امت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ الصحابة کلهم عدول (تمام صحابہ راستباز ہیں) پھر جب حضرت حسینؓ کے سلسلہ میں مطلقاً یہ کہا جائے کہ وہ صحابی نہیں ہیں، تو یہ ان کی حیثیت عرفی کو مجروح کر کے ان کے مقام عظمت کو گھٹانے کے سوا اور کس نام سے یاد کیا جا سکتا ہے؟ اور بس یہی وہ ناپسندیدہ کام ہے جسکو انجام دینے سے پہلے ایک مسلمان کو یہ ضرور سوچنا چاہیئے کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے "پسند" کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں؟۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ محدثین کی خالص علمی اصطلاحی بحث ہے جو انھوں نے روایت حدیث کے سلسلہ میں اٹھائی ہے اور عام مسلمان من حیث الرؤیة صحابی ہونے اور من حیث الروایة صحابی نہ ہونے کے فرق کو جانتا بھی نہیں ہے، اسی لئے مطلقاً اس کے سامنے کسی شخص کے بارے میں فیصلہ آنا کہ وہ صحابی ہے یا صحابی نہیں ہے اس کے مذہبی جذبات کے رخ کی تعیین کا ذریعہ بنتا ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے جسکا تعلق عقیدہ سے ہے کہ ایک صحابی اور ایک غیر صحابی کے مقام میں نمایاں فرق ہے۔

حضرت حسینؓ کی شہادت

اسلامی تاریخ کے تاریک دنوں میں سے ایک دن ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کا بھی ہے، جس دن نواسۂ رسولؐ حضرت حسینؓ کی بے دردانہ شہادت ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو اپنے آپ کو شہید مظلوم کا ہم مذہب ظاہر کرتے تھے اور جو اپنے کو اسی رسول کی غلامی سے وابستہ بتاتے تھے جس کے نواسے حضرت حسینؓ تھے، اس سے قطع نظر کہ قاتلان حسینؓ کون لوگ تھے، اور اس حادثۂ الم کے پس پشت کس قسم کی سازش کام کر رہی تھی؟ کوئی بھی کلمہ گو نہ قتل حسینؓ پر راضی ہو سکتا ہے، نہ اس المیہ کے ذمہ داروں سے اپنی وابستگی پر فخر کر سکتا ہے، ہم اسے حضرت حسینؓ کے خون ناحق اور ان کی مظلومیت کی ایک شہادت ہی قرار دیں گے کہ ان کے قاتل آج اس طرح بے ننگ و نام ہو گئے کہ ان سے اپنی جسمانی یا روحانی وابستگی قائم کرنیوالا دنیا کے پردہ میں کوئی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود خود حضرت حسینؓ کے لئے شہید ہونا، ان کے تاج سعادت کا وہ انمول نگینہ ہے جس کی قدر و قیمت سے وہ خود آگاہ ہوں گے، یا پھر وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر یقین کرتے ہوئے شہید کے مقام و مرتبہ سے واقف ہیں، تاریخ کی بے سر و پا روایات کے ذریعہ حسینی شہادت کو رونے رلانے کا سامان کرنے والے یا اسے حضرت حسینؓ کا ایک عاجلانہ و عاقبت نااندیشانہ اقدام قرار دیکر استہزا کرنیوالے تو صدیوں سے حضرت حسینؓ کی مظلومیت میں اضافہ ہی کر رہے ہیں۔

جہاں تک حضرت حسینؓ کی شہادت کی تفصیلات کا معاملہ ہے تو ان کے مکہ سے کوفہ کے لئے روانگی تک یا زیادہ سے زیادہ کربلا پہونچنے تک کے واقعات ہم تک ان ذرائع سے پہونچے ہیں جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے لیکن حادثہ کربلا کی تمام تر تفصیلات

سب سے پہلے طبری نے اپنی تاریخ میں ابو مخنف لوط بن یحییٰ کی روایت سے بیان کی ہیں، اس کے بعد پھر تاریخ طبری ہی سے دوسری کتابوں میں نقل در نقل ہوتی رہی ہم ان واقعات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے سے پہلے چند ایسے امور کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں جن سے قارئین خود آسانی کے ساتھ اندازہ کر لیں گے کہ حادثۂ کربلا کی تفصیلات اور حرب و جنگ کے مناظر کا بیان کس درجہ قابل اعتماد ہو سکتا ہے ؟ ۔

۱۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا حادثۂ عظمیٰ ۱۰ محرم الحرام سنہ ۶۱ھ کو پیش آیا ۔

۲۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت حسینؓ کے افراد خاندان میں سے ان کے صاحبزادۂ گرامی حضرت علی زین العابدینؒ اور ان کے دو بھتیجے حضرت زیدؒ بن حسنؓ اور حضرت حسن مثنیٰؒ بن حسنؓ میدان کربلا سے زندہ واپس آئے تھے، اور یہ تینوں ہی بزرگوار کربلا میں پیش آنے والے المناک حادثہ اور اپنے افراد خاندان کی شہادتوں کے چشم دید گواہ تھے، لیکن اس حادثہ کی تفصیلات بیان کرنے والی کسی بھی روایت کا راوی ان تینوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے ،

۳۔ حادثۂ کربلا کی تمام جزئی تفصیلات، مثلاً جنگ کس طرح شروع ہوئی ؟ مبارز طلبی پر حسینی قافلہ سے پہلے کون لوگ آگے بڑھے ؟ پیاسوں پر کیا بیتی ؟ علی اصغرؒ و سکینہ کیوں کر شہید ہوئے ؟ عباس علمدار نے کیا کارنامے انجام دیئے ؟ وغیرہ وغیرہ سب سے پہلے ابو مخنف لوط بن یحییٰ نے اپنی کتاب "مقتل حسین" میں بیان کیں، اور پھر اسی راوی سے روایت کرتے ہوئے ان تفصیلات کو محمد بن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں جگہ دی ۔

۴۔ ابو مخنف کا تعارف کراتے ہوئے علامہ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر کرتے ہیں ۔

لوط بن یحییٰ ابومخنف اخباری تالف لا یوثق بہ ترکہ ابوحاتم وغیرہ	لوط بن یحییٰ ابومخنف ایک مؤرخ ہے جس نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں، قابل بھروسہ نہیں ہے ابوحاتم وغیرہ نے اسے متروک قرار دیا ہے۔
وقال الدارقطنی ضعیف وقال یحییٰ بن معین لیس بثقۃ وقال مرۃ لیس بشیٔ	اور دارقطنی نے کہا کہ یہ ضعیف ہے اور یحییٰ بن معین نے کہا کہ یہ معتبر نہیں ہے، اور ایک مرتبہ یہ کہا کہ یہ تو کچھ ہے ہی نہیں۔
وقال ابن عدی شیعی محترق صاحب اخبارھم قلت روی عن الصعق بن زھیر وجابر الجعفی ومجالد روی عنہ المدائنی وعبدالرحمٰن بن مغراء۔	اور ابن عدی نے کہا کہ یہ جلا بھنا (یا آگ لگانیوالا) شیعہ ہے اور ان ہی کی خبریں بیان کرتا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ صعق بن زہیر اور جابر جعفی[1] اور مجالد[2] سے روایت کرتا ہے اور اس سے مدائنی وعبدالرحمٰن بن مغراء نے روایت کیا ہے۔
ومات قبل السبعین ومائۃ	۱۷۰ھ سے پہلے فوت ہوا، انتہیٰ۔ اور ابو عبید

---

[1] جابر بن یزید بن الحارث جعفی۔ علمائے شیعہ میں سے ہے، امام شعبی، امام ابوحنیفہ، لیث بن سلیم نے اسے کذاب قرار دیا ہے، نسائی وغیرہ نے اسے متروک قرار دیا، ابوداؤد اسے قوی نہیں سمجھتے، جریر بن عبدالحمید نے اس سے روایت کو حلال نہیں جانا، یحییٰ نے کہا کہ نہ اس کی کوئی حدیث لکھی جائے نہ کرامۃ (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۷)

[2] مجالد بن ابی راشد، امام احمد نے اسے لاشی قرار دیا ہے کیونکہ یہ موقوف روایات کو مرفوع بنایا کرتا تھا (لسان المیزان ج ۵ ص ۱۶)

انتھیٰ وقال ابوعبید الآجری	آجری نے کہا کہ میں نے ابوحاتم سے اس
سألت اباحاتم عنه فنفض	کے (ابومخنف کے) سلسلہ میں پوچھا تو انھوں
یدہ وقال احد یسأل عن هذا	نے اپنا ہاتھ جھٹک کر کہا ایسے شخص کے
وذکرہ العقیلی فی الضعفاء	بارے میں بھی کچھ پوچھا جاتا ہے؟ اور عقیلی
(لسان المیزان ج ۴ ص ۴۹۲-۴۹۳)	نے اس کا ذکر الضعفاء میں کیا ہے۔

۵: محمد بن جریر طبری کی ولادت ۲۲۴ھ کے آخر یا ۲۲۵ھ کے شروع میں ہوئی اور وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی [1]

مندرجہ بالا امور کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ بات خود بخود نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ شہادت حسینؓ کی تمام تفصیلات اور کربلائی داستان کی حیثیت ابومخنف کے دجل و فریب اور اطمینان سے بیٹھ کر تیار کئے گئے جھوٹ کے پوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور اسے پروان چڑھانے اور نشر کرنے میں طبری نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا ابومخنف کربلا کے واقعات کی تفصیلات اتنی ڈھٹائی کے ساتھ بیان کرتا ہے جیسے یہ خود ان واقعات کا چشم دید گواہ ہو، جبکہ حادثہ کربلا کے وقت یہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا، اسی طرح طبری، ابومخنف سے روایت کرتے ہوئے ان واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنی تاریخ میں بیان کرتے ہیں جبکہ نہ ابومخنف کے بیانات لائق اعتبار تھے نہ ہی طبری نے ابومخنف کو دیکھا تھا کیونکہ طبری کی ولادت سے کم از کم ۵۵ برس پہلے ابومخنف فوت ہو چکا تھا، اس کے باوجود طبری اس کے منقولات کو اس طرح روایت کرتے ہیں جیسے وہ ان کا استاذ ہو، اور طبری نے براہ راست اس سے سماعت کی ہو۔

ابومخنف کے کذب و افتراء کا شاہکار "مقتل حسین" نامی کتاب کا تو اب کہیں

---

[1] لسان المیزان ج ۵ ص ۱۰۲۔

وجود نہیں ہے لیکن اس کے مکائد کو طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کر کے حضرت حسینؓ کی ذات گرامی اور ان کی شہادت کو قیامت تک کے لئے موضوع بحث بنا دیا، کیونکہ بعد کی تاریخوں میں طبری کی روایات ہی کو نقل کیا گیا، اور پھر نقل در نقل، اور ان روایات پر نقد و جرح کا جو سلسلہ چلا تو شہادت حسینؓ کو ایک ایسا افسانہ بنا دیا گیا جیسے تاریخ اسلام کی یہ پہلی شہادت تھی اور اس کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں بھونچال آگیا تھا۔

جبکہ واقعات ثابتہ کی ترتیب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت بھی اسی "سبائی فتنہ" کی ایک کڑی تھی جس کی وجہ سے خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان غنی کی شہادت ہوئی۔ پھر اسی شہادت کے نتیجہ میں حضرت علیؓ مرتضیٰ کے دور خلافت میں جنگ جمل اور جنگ صفین برپا ہوئیں[1]۔ پھر اسی فتنہ کے زیر اثر حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی، ان کے فرزند اکبر حضرت حسنؓ کو طرح طرح سے تنگ کیا گیا، اور ان کو رسوا و ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا گیا، پھر حضرت معاویہؓ کی وفات ہوتے ہی اس "زیر زمین فتنہ" کو ایک مرتبہ نئی قوت اور نئے حوصلوں کے ساتھ سر اٹھانے کا موقع ملا، جس کے نتیجہ میں حضرت حسینؓ کی شہادت کا حادثہ جانکاہ پیش آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یزید کا کردار کیا تھا؟ یزید کی امارت حق بجانب تھی یا نہیں؟ اور یزید کی امارت

---

[1] حضرت علیؓ کے دور خلافت کی تیسری جنگ نہروان بھی سبائی سازش ہی کے نتیجہ میں برپا ہوئی تھی، جو اگرچہ کھلی ہوئی حق و باطل کی جنگ تھی کیونکہ حضرت علیؓ کے مخالفین اور ان کے مقابلہ پر آنیوالے خارجی حضرت علیؓ کو نعوذ باللہ مرتد قرار دے رہے تھے لیکن اسلام اور اعیان اسلام کو مٹانے کی سبائی سازش ہی کی اس میں بھی کارفرمائی تھی۔ اس جنگ کی کچھ تفصیلات زبانی اگلے صفحہ پر

سے اس وقت کے اہل الرائے متفق تھے یا نہیں؟ ان متنازعہ بحثوں میں پڑے بغیر ہم ایک متفق علیہ بات جانتے ہیں کہ یزید کی امارت سے حضرت حسینؓ کو اتفاق نہ تھا، اور انھوں نے یزید کی خلافت کی بیعت سے انکار کر دیا تھا، کوفہ کے سبائیوں نے حضرت حسینؓ کے نام خطوط لکھ کر اور ان کی خدمت میں اپنے وفود بھیجکر حضرت حسینؓ کو یہ کھلا ہوا فریب دیا کہ عراق کے تمام باشندے آپ کے موقف سے پوری طرح متفق ہیں، وہ یزید کی بیعت کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار کر بس آپ کے منتظر ہیں کہ آپ تشریف لائیں، اور یہ تمام لوگ آپ کے دست حق پرست پر بیعت کریں یہ وہی سبائی تھے جنھوں نے حضرت حسینؓ کے والد بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اسی طرح فریب دیکر اپنی وفاداری کا اس درجہ یقین دلایا تھا کہ انھوں نے اپنا دارالخلافۃ مدینہ طیبہ سے کوفہ منتقل کر لیا تھا، لیکن پھر ان کوفیوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ کس طرح دغا کی، اور کس طرح ان کو خون کے آنسو رلائے، اور کس طرح ان کو بے یار و مددگار کیا۔ اور بالآخر حضرت علی مرتضیٰؓ کی شہادت کا واقعۂ ہائلہ پیش آیا۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے کا نہ یہ موقع ہے نہ ہی ان تسلیم شدہ حقائق کی تفصیلات بیان کرنے کی چنداں ضرورت ہے، حضرت علیؓ کے فرزند اکبر حضرت حسنؓ کچھ تو اپنی طبعی صلح پسندی کی وجہ سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے والد گرامی کے ان "وفاداروں" کی "وفاداریاں" اپنی آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی تھیں ان سبائیوں کے نرغے میں نہیں آئے، اور ان کوفی سبائیوں کے مشوروں کے علی الرغم انھوں نے حضرت معاویہؓ سے مصالحت کا تاریخ ساز فیصلہ کر کے خلافت سے دست برداری حاصل کر لی[1]، اگرچہ اس مصالحت کے نتیجہ میں حضرت

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت علی مرتضیٰؓ کے تذکرہ میں بیان ہو چکیں [1] اس صلح کی تفصیلات اور سبائیوں کی حضرت حسنؓ کے ہاتھوں شکست کی روداد حضرت حسنؓ کے تذکرہ میں بیان کر دی گئی ہیں

حسنؓ کو ان سبائیوں کے ہاتھوں بڑے روح فرسا مظالم برداشت کرنا پڑے، لیکن بہرحال یہ ایک حقیقت ہیکہ حضرت حسنؓ سبائیوں کے دام تزویر سے صاف بچ کر نکل گئے، اب خانوادۂ رسالت کے تیسرے فرد حضرت حسینؓ تھے جنکو سبائیوں نے اپنا نشانہ بنایا، اور یہ ایک کربناک سچائی ہیکہ حضرت حسینؓ ان کوفی سبائیوں کی منظم سازش کے شکار ہوگئے، اور اپنے قریب ترین ولائق اعتماد اعزہ مثلاً حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ اور حضرت محمدؓ بن علیؓ وغیرہما کی فہمائشوں اور دوررس مشوروں کو رد کر کے کوفہ کے لئے عازم سفر ہوگئے، مکہ میں حضرت حسینؓ کو بتایا گیا تھا کہ صوبۂ عراق کے تمام مسلمانوں نے آپ کے ہاتھوں پر خلافت کی بیعت کرنے کا ارادہ کرلیا ہے، اور آپ کے نمائندہ حضرت مسلم بن عقیلؓ کے ہاتھوں پر اٹھارہ ہزار افراد نے بیعت کرلی ہے، ایک لاکھ سے زائد افراد آپ کے لئے چشم براہ ہیں، اور انھوں نے ہر طرح آپ کا ساتھ دینے کے لئے طلاق وعتاق کی قسمیں کھا رکھی ہیں ـــــ اور یہ ساری یقین دہانیاں ان ساٹھ سبائیوں نے کرائی تھیں جو کوفہ سے خاص اسی مقصد کو لیکر حضرت حسینؓ کے پاس آئے تھے کہ کسی بھی طرح ان کو کوفہ کے سفر کیلئے رضامند کریں، سبائیوں کی اس مکروفریب سے بھری شاطرانہ سازش کو مزید قوت اس خط سے بھی ملی جو حضرت مسلمؓ بن عقیلؓ کے نام سے حضرت حسینؓ کے پاس آیا تھا اور جس میں یہ درج تھا کہ آپ کی خلافت کے لئے میرے ہاتھوں پر بارہ ہزار افراد اب تک بیعت کر چکے ہیں[1]، ان تمام واقعات سے حضرت حسینؓ اس نتیجہ پر پہونچے

---

[1] اس خط کی روانگی کے بعد حضرت مسلم کی شہادت، اور کوفہ پہونچنے پر کوفہ کے لوگوں کا حضرت حسینؓ کے نام کوئی خط بھیجنے سے انکار کرنا، اور ان ساٹھ سبائیوں تک کا حضرت حسینؓ کی مدد سے منہ پھیرنا جو مکہ سے ان کے ساتھ آئے تھے، یہ وہ قرائن ہیں جن سے یقین کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کہ یزید کے خلاف ایک "عوامی انقلاب" کی ضرورت ہے، اور اس انقلاب کی قیادت کے لئے متفقہ طور پر لوگوں کی نگاہیں میری طرف اُٹھ رہی ہیں، چنانچہ وہ ایک عوامی مطالبہ" کی تکمیل کی نیت سے مکہ سے کوفہ کے لئے روانہ ہوگئے، کوفہ پہونچنے سے پہلے ہی حضرت حسینؓ کو جستہ جستہ اصل حقیقت کا علم ہوتا گیا، پھر ان کو یہ بھی اطلاع مل گئی کہ ان کے نمائندہ حضرت مسلمؓ بن عقیلؓ کو شہید کردیا گیا، حتیٰ کہ جب وہ مقام حاجر پہونچے تو یہ اعلان عام کردیا کہ ہمارے گروہ کے لوگوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے، مزید جو لوگ جانا چاہیں واپس جاسکتے ہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اس اعلان کے بعد کافی لوگ حضرت حسینؓ کو چھوڑ کر واپس چلے گئے، پھر جب کوفہ کے گورنر عبیداللہ بن زیاد کے نمائندہ عمر بن سعد نے حضرت حسینؓ سے ملاقات کی اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ تو حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ "اے عمر! تین میں سے میری ایک بات مان لو، یا تو مجھے چھوڑ دو کہ میں جیسے آیا ہوں ویسے ہی واپس چلا جاؤں، اگر یہ نہیں تو پھر مجھے یزید کے پاس لے چلو تاکہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں، پھر وہ جو چاہے فیصلہ کرے، اور اگر یہ بھی نہیں چاہتے تو مجھے ترکوں کی طرف جانے دو تاکہ ان سے جہاد میں میں اپنی جان دیدوں[1]" پھر کیا ہوا؟ پھر یقیناً یہی ہوا کہ حضرت حسینؓ کی جنگ ٹالنے کی یہ مخلصانہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی، اور دشمنانِ حسینؓ نے "ہاتھ آئے ہوئے شکار کو نکلتا دیکھکر" جنگ چھیڑ دی، اور اس

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی طرف سے لکھا جانیوالا یہ خط بھی حضرت مسلمؓ کا نہ تھا بلکہ یہ بھی ان سبائیوں ہی کا لکھا ہوا تھا۔

[1] کوفہ کے لوگوں کے خطوط بھیجنے سے لیکر یہاں تک کے واقعات کی تفصیلات البدایۃ النہایۃ ج ۸ ص ۱۵۲ تا ۱۹۲، اور الاصابۃ ج ۱ ص ۳۳۱ تا ۳۳۴ سے ماخوذ ہیں۔

طرح تاریخ اسلام کا یہ بدنما واقعہ پیش آکر رہا کہ نواسۂ رسولؐ، شہید مظلوم حضرت حسینؓ بن علیؓ نے اپنے خاندان کے کچھ قریبی اعزہ اور بہی خواہوں کے ساتھ کربلا کے میدان میں جام شہادت نوش کرلیا۔

سبائی سازش کامیاب ہوگئی، حسینؓ شہید ہوگئے، مگر نہیں۔ سبائی نامراد ہوئے کیونکہ قاتلان حسینؓ سے اپنا رشتہ جوڑنے والا کوئی نہیں ہے، اور حسینؓ سُرخرو ہوئے کیونکہ ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن　　　　نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

چند ضروری وضاحتیں

حضرت حسینؓ کی شہادت یقیناً تاریخ اسلام کا ایک سیاہ صفحہ ہے، لیکن ابو مخنف سے پہلے اس حادثہ سے دلچسپی لینے والا، اور اس کی تفصیلات کو چٹخارے لے لیکر بیان کرنے والا ہم کو کوئی نہیں ملتا، نہ آہ و فغاں ہے، نہ ماتم و شیون ہے، اور نہ ہی یزید پر طعن اور اس کا دفاع ہے، آخر ایسا کیوں ہے؟ حضرت حسینؓ کے جوان العمر فرزند اور ان کے حقیقی وارث حضرت علی زین العابدینؒ حادثہ کربلا کے چشم دید گواہ تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی طرف سے قصاص کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا؟ حادثہ کربلا کے دو سال بعد جب "حادثۂ حرہ" پیش آیا، تو حضرت زین العابدینؒ اور حضرت حسینؓ کے دوسرے افراد خاندان کیلئے بہت اچھا موقع تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا ساتھ دیکر یزید سے اپنے والد حضرت حسینؓ کے خون ناحق کا انتقام لے لیتے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر حضرت حسینؓ کے افراد خاندان میں سے کسی نے حضرت ابن زبیرؓ کا ساتھ نہیں دیا، آخر ان حضرات کا یہ موقف کیوں تھا؟ پھر اس کے بعد جب سبائیوں نے "التوابون" بنکر اپنی "پچھلی حرکتوں" پر ندامت

کا اظہار کر کے، "خون حسینؓ" کا بدلہ لینے کے لئے اپنی جارحانہ تحریک شروع کی، تو حضرت زین العابدینؒ یا دیگر بنی ہاشم نے ان کا ساتھ کیوں نہیں دیا، اور ان تحریکوں سے اپنے کو الگ کیوں رکھا؟ کیا کوئی "جراٴت مند" ہے جو یہ کہہ سکے کہ حضرت زین العابدینؒ اور حضرت حسینؓ کے دیگر افراد خاندان کو حضرت حسینؓ کی بے دردانہ و مظلومانہ شہادت سے رنج نہیں ہوا تھا؟ یا یہ کہنے کی کسی میں ہمت ہے کہ ان لوگوں کو رنج تو ہوا تھا مگر یہ نعوذ باللہ اتنے پست ہمت، اور بے حمیت تھے کہ نہ انھوں نے قصاص کا مطالبہ کیا، نہ ہی انتقام لینے کی بات کبھی سوچی؟ ہمارا خیال یہ ہے کہ بات ایسی نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہیکہ چونکہ یہ حضرات، ابو مخنف کی روایات کے ذریعہ نہیں، بلکہ پوری صورت حال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کی وجہ سے اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ اس افسوسناک اور قابل نفرین حادثہ کے لئے حکومت وقت، یا اس کا سربراہ یزید نہیں، بلکہ کوفہ کے وہ سبائی ذمہ دار ہیں جنھوں نے واقعات کی غلط تصویر پیش کر کے اور "عوامی انقلاب" کی ضرورت کا چکمہ دیکر حضرت حسینؓ کو کوفہ بلوایا تھا، اور پھر کربلا کے میدان میں ان کو بے یار و مددگار کر کے اپنی گردن کٹوانے پر مجبور کر دیا تھا، اسی لئے نہ ان حضرات نے "التوابون" کی توبہ تسلیم کی، نہ ان کو اپنا کسی قسم کا تعاون دیا، نہ ہی "واقعہ حرہ" میں کسی طرف سے شرکت کی۔

اسی جگہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آجانا مناسب ہیکہ بعض لوگ "حمایت یزید" کے جوش میں یزید اور اس کی حکومت کے خلاف حضرت حسینؓ کے اس اقدام کو "خروج یا بغاوت" سے تعبیر کرتے ہوئے یزید کو برسر صواب، اور حضرت حسینؓ کو برسر خطا بتاتے ہیں، ایسا کہنے والے امت کے اجماعی موقف کو "کورانہ تقلید" اور اپنی بے جا جسارت و گستاخی کو "تحقیق" کا نام دیتے ہیں، ہم ایسی "تحقیق" سے سو بار اللہ کی پناہ مانگتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے

جن حالات میں، اور جن خبروں کی بنیاد پر جو اقدام کیا، وہ برسر حق تھا، اور ایک مجتہد مطلق ہونے کے ناطے ان کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسرا اقدام کرنا جائز بھی نہ تھا۔

جہاں تک "اصحاب تحقیق" کا معاملہ ہے تو ان کی دلیل یہی ہیکہ چونکہ حضرت حسینؓ نے یزید کی "متفق علیہ" اور قائم شدہ خلافت کے خلاف "خروج" کیا اس لئے وہ بہرحال "باغی" قرار پائیں گے، قطع نظر اس کے کہ فضیلت و مرتبہ میں یزید کے مقابلہ حضرت حسینؓ کہیں بڑھے ہوئے تھے، لیکن شریعت مقدسہ کی واضح تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کے اتفاق کے بعد کسی خلیفہ کے خلاف خروج کی اجازت نہیں ہے اور ایسے کسی اقدام کو "خروج یا بغاوت" ہی سے تعبیر کیا گیا ہے، جو بہرحال ایک جرم ہے۔

اس "مغالطہ" کی بنیاد اس بات پر ہیکہ پہلے یزید کی خلافت کو ایسی "متفق علیہ" قرار دے لیا گیا کہ گویا اہل الرائے افراد میں سے کسی کو اس سے اختلاف ہی نہ تھا اور پھر حضرت حسینؓ کے اختلاف کو ایک "عامی" کے اختلاف یا زیادہ واضح الفاظ میں "حکومت کی ہوس" سے تعبیر کر کے ان کے اقدام کو "بغاوت" قرار دے لیا گیا، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یزید کی خلافت سے متعدد اہل الرائے اور مجتہد اصحابؓ مثلاً حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ بن علیؓ نے ولی عہدی کے وقت ہی اختلاف ظاہر کیا تھا، ان میں سے دیگر حضرات نے تو بعد میں اپنا اختلاف واپس لے لیا تھا، لیکن حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ بن علیؓ کے متعلق واضح طور پر ہم کو یہ معلوم ہے کہ انھوں نے اپنا اختلاف واپس نہیں لیا تھا، اور ان دونوں نے نہ ولی عہدی کی بیعت کی، نہ ہی بعد میں امارت قائم ہونے کے وقت، اگر ہم

اس بات کو تسلیم بھی کرلیں کہ ان دونوں کا ہم نوا اور کوئی نہ تھا، اور بقیہ تمام اہل الرائے حضرات نے یزید کی بیعت قبول کرلی تھی، تو بھی ان دونوں حضرات کے اختلاف کو بدنیتی اور حکومت کی ہوس سے تعبیر کرنا، ایک بے ہودہ جسارت کے سوا اور کچھ نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں بزرگواروں کے مجتہد ہونے کی حیثیت کا انکار کرنے کی تو شاید کوئی بھی جرأت نہ کرسکے، پھر اگر دوسری تمام غیر معتبر اور تشنۂ تحقیق باتوں سے قطع نظر، انھوں نے صرف اپنے اجتہاد کی بنیاد پر پوری نیک نیتی کیساتھ یزید کی خلافت قبول کرنے سے انکار کرکے ذاتی طور پر بیعت نہیں کی تو اسے کیونکر جرم گردانا جاسکتا ہے؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر دیگر تمام اہل الرائے حضرات نے بیعت کرلی تھی اور عوام نے یزید کو، خلیفۃ المسلمین،، کی حیثیت سے تسلیم کرلیا تھا، تو حکومت قائمہ کے خلاف کوئی اقدام کرنے کی نہ ان دونوں حضرات کو اجازت ہوسکتی تھی، نہ ہی کسی اور کو، چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ بن علیؓ دونوں میں سے کسی کیلئے کسی ضعیف سے ضعیف بلکہ موضوع روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے بیعت سے انکار کے بعد، خلافت سازی،، کی کوشش شروع کردی ہو، جہاں تک حضرت حسینؓ کا معاملہ ہے تو ان کو مکہ مکرمہ میں کوفیوں کے پیہم خطوط ملے کہ عراق کے لوگ یزید سے بیعت نہ کرکے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہتے ہیں، آپ فوراً کوفہ آجائیے، تاکہ امت مسلمہ اختلال و انتشار سے محفوظ ہوجائے، یہ خطوط کوفہ کے ایسے مقتدر و باعزت افراد کی طرف سے لکھے ہوئے تھے جن کے اصرار کو حضرت حسینؓ نظر انداز نہیں کرسکتے تھے، پھر بھی انھوں نے احتیاط کے طور پر حضرت مسلم بن عقیلؓ کو صحیح صورت حال کا پتہ لگانے کے لئے کوفہ بھیجا، حضرت مسلمؓ کی کوفہ روانگی سے پہلے اور بعد میں کوفہ کے سبائیوں کے متعدد وفود بھی حضرت حسینؓ سے مکہ میں آکر ملاقاتیں کرکے اور اسی مضمون کو بیان کرکے جو خطوط میں لکھا گیا تھا

حضرت حسینؓ سے کوفہ کی طرف کوچ کرنے کی درخواستیں کرتے رہے تھے، پھر حضرت حسینؓ کے نمائندہ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی طرف سے وہ خط حضرت حسینؓ کو ملا، جس میں لکھا گیا تھا کہ کوفہ کے بارہ ہزار، یا ایک روایت کے مطابق اٹھارہ ہزار اور ایک دوسری روایت کے مطابق ساٹھ ہزار افراد تک نے آپ کی خلافت کیلئے میرے ہاتھوں پر بیعت کرلی ہے، اور یہاں عام طور پر لوگ انقلاب حکومت چاہتے ہیں، اور آپ کے سوا کسی دوسرے کو خلیفہ کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، پھر آخر میں کوفہ کے ساٹھ سبائیوں پر مشتمل وہ وفد حضرت حسینؓ سے آکر ملا، جس نے ہر طرح اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ تمام اہل عراق آپ اور صرف آپ کی خلافت پر متفق ہو چکے ہیں، بڑی تعداد میں لوگوں نے یزید کی حکومت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے، اور وہ یزید کے عمال کے مظالم کے شکار ہو رہے ہیں، بقیہ لوگ آپ کے کوفہ پہونچنے کے منتظر ہیں۔

یہ صحیح ہیکہ کوفہ کے واقعی حالات وہ نہیں تھے جو حضرت حسینؓ کے سامنے بیان کئے گئے تھے، اور حضرت حسینؓ تک خطوط اور وفود کے ذریعہ پہونچائی جانے والی یہ تمام خبریں کوفہ کے ان تھوڑے سے سبائیوں کی سازش کا ایک حصہ تھیں، جنھوں نے اس سے پہلے اسی طرح حضرت علیؓ کو بھی فریب دیا تھا، لیکن سوال یہ ہیکہ کیا حضرت حسینؓ کے لئے اس بات پر یقین کرلینے کے لئے کافی اسباب نہ تھے کہ عراق کے لوگ "عوامی انقلاب" کے ذریعہ حکومت تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور میرے سوا کسی دوسرے کی قیادت پر وہ لوگ متفق نہیں ہو سکتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ، اور حضرت حسینؓ کے دوسرے جن ہمدردوں و بہی خواہوں نے ان کو کوفہ جانے سے روکا تھا وہ اُن سابقہ تجربات کی بنیاد پر تھا جو اہل کوفہ کی طرف سے اب تک ہوئے تھے، اور جن سے

یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور انکے ذریعہ برپا ہونے والے دین کے دشمن ہیں، اور ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جاسکے۔ اس کے برخلاف حضرت حسینؓ کے اطمینان کے لئے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے نمائندہ مسلم بن عقیلؓ نے بھی کوفہ پہونچکر اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیکر وہی بات لکھی جو کوفہ سے آنیوالے لوگ زبانی بتارہے تھے۔ ان حالات میں اگر حضرت حسینؓ نے "عوامی انقلاب" کی قیادت کے خیال سے مکہ مکرمہ سے کوفہ کا سفر شروع کیا، تو اسے "خروج یا بغاوت" سے تعبیر کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ بغاوت نام ہے کسی متفق علیہ اور قائم شدہ حکومت کے خلاف کسی فرد یا چند افراد پر مشتمل ایک چھوٹے سے گروہ کے اقدام کا، جبکہ حضرت حسینؓ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، وہ تو اپنے علم ویقین کے مطابق عراقی عوام کو، ان کی خواہش و اصرار پر مظالم سے بچانے، ان کو متحد کرنے، اور "خلافت اسلامیہ" عطا کرنے کا جذبہ لے کر روانہ ہوئے تھے، اس پس منظر میں حضرت حسینؓ کی مکہ سے روانگی کو "خروج اور بغاوت" سے تعبیر کرنا بہت ہی سنگین جسارت اور بہت بڑا ظلم ہے، پھر ایسی صورت میں جبکہ بعد کے واقعات نے حضرت حسینؓ کے موقف اور ان کے ارادوں کو پوری طرح واضح کر دیا۔ کہ کوفہ پہنچنے سے پہلے ہی جب ان کو حضرت مسلم بن عقیلؓ کی شہادت اور دوسرے واقعات سے یہ یقین ہوگیا کہ "پرانے شکاریوں نے نئے جال" کے ذریعہ فریب دیا ہے۔ اور پھر کوفہ پہونچکر اور اہل کوفہ سے مل کر جب انھیں یہ معلوم ہوگیا کہ یہاں کوئی عوامی شورش نہیں ہے، کوفہ کے مقتدر و اہل الرائے افراد یزید کی بیعت پر عام طور پر قائم ہیں، ان کے نام سے میری طرف بھیجے گئے خطوط جعلی تھے، اور یزید اور اس کے عمال مکہ سے میرے کوفہ آنے کو حکومت وقت کے خلاف خروج سمجھ رہے ہیں، نعمان بن بشیر کی جگہ عبیداللہ

بن زیاد کو کوفہ کا گورنر اسی لئے مقرر کیا جا چکا ہے کہ وہ پوری مستعدی اور فوجی قوت کے ساتھ میرا مقابلہ کرے، وہ لوگ جنھوں نے ساتھ دینے اور بیعت کرنے کے وعدے کئے تھے سب غائب ہو چکے ہیں، غرضیکہ جب حضرت حسینؓ کو پوری طرح اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ مکہ میں بتائے گئے حالات سے کوفہ کے حالات بالکل مختلف ہیں، اور یہاں کسی "عوامی انقلاب" کی نہ طلب ہے اور نہ موقع، تو انھوں نے عبیداللہ بن زیاد کے نمائندہ عمر بن سعد سے صاف صاف کہدیا کہ:۔

"میری تین باتوں میں سے ایک مان لو، یا مجھے واپس جانے دو، یا یزید کے پاس پہونچا دو، یا ترکوں کی طرف جانے دو تاکہ میں ان سے جہاد کرسکوں"

مگر ان سبائیوں کو جو ہزار جتن کر کے اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر، نہ جانے کن کن مکاریوں سے حضرت حسینؓ کو یہاں لائے تھے یہ کیونکر گوارہ ہو سکتا تھا کہ اب حضرت حسینؓ بچ کر نکل جائیں، کیونکہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر حضرت حسینؓ یہاں سے زندہ واپس چلے گئے تو ہماری ساری سازش کھل کر رہے گی، اور یزید پر حسینؓ کی بے گناہی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر ہو کر رہے گا کہ حسینؓ کو کس طرح کوفہ کا سفر کرایا گیا، اور کن کن لوگوں کا اسمیں ہاتھ تھا، اور یہ سب ظاہر ہونے کے بعد ان سبائیوں کو اپنا انجام معلوم تھا، اس لئے انھوں نے "ڈھکا پردہ ڈھکا رکھنے" ہی میں اپنی عافیت سمجھی، اور نواسۂ رسول حضرت حسینؓ پر وہ جنگ مسلط کر دی، جو بالآخر ان کی مظلومانہ شہادت پر ختم ہوئی۔

یہ ہیں وہ حقائق، جن سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہیکہ حضرت حسینؓ نے مکہ سے کوفہ کے لئے روانہ ہوتے وقت جو موقف اختیار کیا تھا وہ اس وقت کے معلوم حالات واخبار کی بنا پر بالکل مناسب اور درست تھا، پھر جب ان کے سامنے حالات و

واقعات کی صحیح صورت آئی، اور انھوں نے اپنے موقف میں تبدیلی کی وہ اسوقت کے لحاظ سے بالکل درست و مناسب تھا۔

سچائی یہ ہیکہ نہ حضرت حسینؓ کو خلافت و امارت کی ہوس تھی، نہ وہ امت کے خون میں اپنے ہاتھ رنگنا پسند کرتے تھے اور نہ ہی اپنی اور اپنے افراد خاندان کی بربادی وہلاکت کو وہ پسند کرتے تھے، جو کچھ ہوا، وہ سبائیوں کی تہابت ہی منظم اور منصوبہ بند سازش سے ہوا، جس کے لئے حضرت حسینؓ کو کسی طرح ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لئے جو لوگ یزید کی حمایت کے جوش میں "مقام حسینؓ" کو فراموش کر کے ان پر "خروج و بغاوت" کی پھبتی کستے ہیں، وہ نہ صرف کردار حسینؓ کو مجروح کر کے ان کی مظلومیت میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ تاریخ کو مسخ کر کے ناقابل معافی مجرمین کی فہرست میں اپنا نام درج کراتے ہیں۔

اسی سلسلہ کی ایک اور بات بھی ہے جس کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت حسینؓ کے قتل کا یزید کیطرف انتساب بھی سبائیوں کی اسی مکروہ سازش کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعہ وہ اسلام کے خوبصورت پیکر کو داغدار بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ حضرت حسینؓ کی المناک شہادت کا حادثہ یزید کے دور امارت میں پیش آیا۔ لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہیکہ یہ شہادت یزید کے حکم یا اس کے ایما سے ہوئی تھی، کیونکہ یزید کے سلسلہ میں کسی کمزور سے کمزور تاریخی روایت میں بھی یہ بات نہیں بیان کی گئی ہیکہ اس نے کسی بھی شخص کو حضرت حسینؓ کے قتل کا حکم دیا ہو، یا قتل حسینؓ پر اپنی رضامندی ظاہر کی ہو، بلکہ حافظ ابن کثیرؒ تو تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے ایک آزاد کردہ غلام کا بیان ہیکہ جب یزید کے سامنے حضرت حسینؓ کا سر مبارک لاکر رکھا گیا تو میں نے اسکو روتے

دیکھا، اس نے کہا کہ اگر ابن زیاد اور حسینؓ میں باہم کوئی رشتہ ہوتا تو وہ (حسینؓ کے ساتھ) ایسا معاملہ نہ کرتا۔" (البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۷۱)

اسی طرح ایک دوسری روایت کے مطابق:۔

"جب حضرت حسینؓ کا سر مبارک یزید کے سامنے آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے اپنے لشکر کے لوگوں سے کہا کہ اگر تم حسینؓ کو قتل نہ کرتے تو میں تم سے کچھ نہ کہتا، اللہ ابن سمیّہ (ابن زیاد) پر لعنت کرے، خدا کی قسم اگر میں ہوتا تو حسینؓ کو معاف کر دیتا (قتل نہ کرتا)۔" (الاصابہ ج ۱ ص ۱۹)

اس قسم کے اور بھی بیانات تاریخ کی مختلف کتابوں میں یزید سے منسوب ہیں جن سے یہی واضح ہوتا ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کی شہادت پر اپنے رنج اور افسوس کا اظہار کیا ہے، اس لئے یزید کو قاتل حسینؓ کے نام سے یاد کرنا، اور یزید کے نام سے اس طرح نفرت کرنا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ کے غیر نزاعی قاتلوں کے نام بے تکلف لئے جائیں، اور اپنے بچوں کے نام حضرت عمرؓ کے مجوسی قاتل کے نام پر "فیروز" رکھ دیئے جائیں تو کچھ حرج نہیں، لیکن یزید کا نام اس لئے نہ آنے پائے کہ وہ قاتل حسینؓ ہے انتہائی احمقانہ اور گمراہ کن خیال ہے، کیونکہ اس کے علاوہ کہ یزید کا قاتل حسینؓ ہونا، یا قتل حسینؓ پر راضی ہونا کہیں سے ثابت نہیں ہے یزید نام کے بہت سے دوسرے اصحابؓ کرام و تابعینؒ عظام گزرے ہیں، لہٰذا اس نام سے نفرت انتہائی مضحکہ خیز ہے۔

کچھ لوگ یزید کے قتل حسینؓ سے راضی ہونے پر اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ اگرچہ یزید کا حضرت حسینؓ کو شہید کر دینے کا حکم تو نہیں ملتا لیکن اگر اسے واقعی یہ امر ناگوار گذرا ہوتا تو اس نے قاتلان حسینؓ سے قصاص لیا ہوتا، اور مجرمین کو کیفر کردار تک پہونچایا ہوتا، جس کا ثبوت نہیں ملتا، تو یہ استدلال انتہائی بیہودہ ہے، کیونکہ

اولاً تو جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا کہ حضرت حسینؓ کے ورثا، کی طرف سے قصاص کا مطالبہ نہیں کیا گیا جبکہ یہ ان ہی کا حق تھا۔ پھر اس کی بھی وضاحت ہو گئی کہ قتل حسینؓ میں سبائیوں کی گہری اور منصوبہ بند سازش کا دخل تھا، اور کسی ایک فرد کو اس سلسلہ میں نامزد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسے حالات میں حکومت وقت کی کچھ انتظامی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اور ان تمام افراد کو جو کسی بھی درجہ میں سازش کے شریک ہوں قابل مواخذہ قرار دینے میں بدامنی اور خلفشار پھیلنے کا شدید خطرہ ہوتا ہے۔ جس کی رعایت سے حکمراں کو ایسے معاملات کو معرض التوا میں ڈال کر مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان غنیؓ کے قاتلوں کے سلسلہ میں حضرت علیؓ نے کیا تھا۔ اور باوجود شدید مطالبہ کے وہ قاتلان عثمان سے قصاص نہیں لے سکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی صاحب ایمان ہرگز نہ یہ کہہ سکتا ہے نہ ہی خارجیوں کی اس بے بنیاد بات پر یقین کر سکتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے قتل میں حضرت علیؓ شریک تھے۔ سبحانک ھٰذا بہتان عظیم۔

پھر کیا وجہ ہے کہ صرف قاتلان حسینؓ سے انتقام نہ لے سکنے کی بنیاد پر یزید کو قتل حسینؓ میں شریک ہونے یا اس سے راضی ہونے کا مجرم گردانا جائے؟

حضرت حسینؓ کی اصل مظلومیت

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حضرت حسینؓ یقیناً تاریخ کے ایک ناقابل فراموش مظلوم ہیں، لیکن ان کی اصل مظلومیت یہ نہیں ہے کہ وہ شہید ہو گئے۔ بلاشبہ کربلا کے میدان میں ان کی شہادت بھی ان کی مظلومیت کا ایک عنوان ہے، مگر یہ وہ شرف نہیں ہے جس کو پہلی مرتبہ حضرت حسینؓ ہی نے حاصل کیا ہو۔ ان سے پہلے ان سے کہیں زیادہ مظلومیت کے ساتھ ان کے خالو اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت ہو چکی تھی، پھر ان سے بھی پہلے اسلام کی راہ میں شہادت پیش کرنے والی پہلی خاتون حضرت سمیہ کی شہادت بھی ناقابل فراموش ہے جنکو مشہور دشمن اسلام اور محروم ازلی ابو جہل بن ہشام نے ٹانگیں چرواکر شہید کیا تھا۔

حضرت حسینؓ کی اصل مظلومیت یہ ہے کہ ان کے قاتل ہی ان کے سب سے بڑے دوست اور ان کے غم میں آنسو بہانے والے بن بیٹھے، اور اس طرح انھوں نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ حضرت حسینؓ کی شہادت کے اصلی اسباب و محرکات کو او جھل کر دیا۔

اگر حادثہ کربلا، کی سبائی تفصیلات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے، اور یہ خلاف واقعہ بات مان لی جائے کہ مکہ مکرمہ سے روانگی کے وقت سے تادمِ شہادت حضرت حسینؓ کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، تو پھر ناصبیوں و خارجیوں کے اس الزام کے دفاع کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ حضرت حسینؓ (معاذ اللہ) باغی تھے، کیونکہ اس واقعہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یزید کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی تھی، اور تمام صوبوں میں اسی کے عامل کام کر رہے تھے، عراق کے بارے میں خطوط اور وفود کے ذریعہ حضرت حسینؓ کو جو اطلاعات دی گئی تھیں، وہ بالکل غلط تھیں، حضرت مسلم بن عقیلؓ کے ہاتھوں پر حضرت حسینؓ کے لئے جن بارہ ہزار، اٹھارہ ہزار یا ساٹھ ہزار لوگوں نے بیعت کی تھی وہ بھی ایک دھوکا ہی تھا، کیونکہ وقت پڑنے پر کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا، حضرت حسینؓ کو صرف بہتّر نفر پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت، کیساتھ جس میں نابالغ بچے اور ضعیف العمر افراد بھی شامل تھے، "چار ہزار کی فوج" سے مقابلہ کرنا پڑا تھا، ایسی صورت میں کیا یہ کہنے کی کوئی گنجائش ہے کہ حضرت حسینؓ "عوامی مطالبہ" پر ایک "عوامی انقلاب" کی قیادت کر رہے تھے؟ اگر نہیں تو حالات سے

واقف ہونے، اور عوامی تائید نہ حاصل ہو سکنے کے بعد جنگ میں حصہ لینے کے لئے کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟۔

حقیقت یہ ہیکہ کربلا میں تو ایک مرتبہ حضرت حسین کو شہید کر کے ان پر ظلم کیا گیا لیکن "سبائیوں" اور پھر ان کے جواب میں "ناصبیوں و خارجیوں" نے میٹھے اور کڑوے انداز میں حضرت حسینؓ کی کردارکشی کر کے نہ جانے کتنی کربلاؤں سے ان کو گذار دیا۔ بس یہی ہے حضرت حسینؓ کی اصل مظلومیت۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ابو مخنف کی دروغ گوئیوں پر یقین نہ کر کے اسے رد کرنے اور حضرت حسینؓ کی مظلومانہ شہادت کے حقیقی پس منظر، اور پاک مقصد کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)



حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

پس منظر

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہماری تاریخ کے ان مظلوم صحابیوں میں سے ہیں جن کی تمام خوبیوں اور روشن کارناموں کو اس طرح فراموش کر دیا گیا ہے کہ مؤرخین کی نوک قلم پر "ایک واقعہ" کے سوا شاید ہی کسی موقع پر ان کا نام آتا ہو، یہی وجہ ہے کہ امت کے سنجیدہ اور اہل علم طبقہ کے بھی بہت کم افراد ہوں گے جو ان کے ابتدائی حالات، انتظامی صلاحیتوں، اسلامی خدمات حتیٰ کہ ان کے پورے نام تک سے واقف ہوں۔

یہ سب کچھ تغافل و تساہل کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بیشتر مؤرخین نے ان کے ساتھ "تجاہل عارفانہ" برتا۔ کیونکہ سبائی پروپیگنڈے پر یقین کر لینے کے بعد ان کی عقیدت کا تقاضا یہی تھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا بار بار اور تفصیل کے ساتھ ذکر نہ کرنا، ان کا ذکر کرنے سے بہتر ہی ہے، مؤرخین کی اس عام روش کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا حق بجانب ہوگا کہ اگر جنگ صفین "کے ذیل میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کا ذکر کرنا ناگزیر نہ ہوتا تو شاید اس محتاط طبقہ" کے قلم پر ان دونوں مظلوم صحابیوں کا نام بھی نہ آتا، سبائیت ایک ایسا "معصوم زہر" ہے جو "عقیدت کے پردوں" سے چھن کر جب ذہن و دماغ میں سرایت کرتا ہے تو

فکر ونظر کی تمام صلاحیتوں کو مضمحل بلکہ مفلوج کر دیتا ہے، اور پھر گل کاریوں کے وہ وہ نمونے سامنے آتے ہیں کہ حق کے ایک متلاشی کو قدم قدم پر بکھرے ہوئے کانٹوں سے اپنا دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات ضرور ہے لیکن یہ کہے بغیر چارہ بھی نہیں کہ چودہویں صدی کا کوئی "طالع آزما محقق" جب "صحیح تاریخ کے نام پر" حضرت ابو موسی اشعری جیسے فضیلت مآب، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد یافتہ صحابیؓ کو ابلہ، بیوقوف، اور پست حوصلہ اور حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے مدبر، دانا، اور انتخاب رسالت صحابیؓ کو چالباز غلط کار وعیار ثابت کرتا ہے، اور محمد بن جریر طبری، حافظ ابن کثیرؒ، اور علامہ ابن الاثیر جزری کے حوالے دیکر یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ یہ "دشمن اصحابؓ سبائی نہیں، بلکہ اسلاف کے کردار کی وہ صحیح صحیح تصویر پیش کرنیوالا محقق ہوں جو ان بزرگوں نے اپنی اپنی تاریخوں میں پہلے بیان کر دی ہیں" تو دجل وفریب کی تمام کارروائیوں کو سمجھنے کے باوجود دل کی بیساختہ پکار یہی ہوتی ہے کہ کاش البدایۃ الکامل، اور الطبری میں وہ سبائی روایات نہ درج کی جاتیں جنکو تاریخی روایات نہیں، بلکہ "قرآنی آیات" کی حیثیت سے پیش کر کے کچھ نابکاروں نے صحابہ کرامؓ کی ردائے تقدیس کو میلا کرنے کا موقع فراہم کر لیا۔

بات ان مستند مورخین ہی تک ہوتی تو تاریخ کی حقیقت بیان کر کے ان مورخین کی گلو خلاصی کرالی جاتی، لیکن جب امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ جیسے محدث وفقیہ نے اپنی جامع کے ابواب المناقب میں اہلبیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علیحدہ علیحدہ باب باندھ کر زبان درازی کرنے والے کو یہ موقع فراہم کر دیا ہو کہ اہلبیت نبیؐ میں نبیؐ کی بیویاں شامل نہیں ہیں، اسی لئے امام ترمذیؒ نے ان کے فضائل

بیان کرنے کے لئے علحٰدہ باب باندھا، تو سبائی تحریک کی وسعت، اس کی ہمہ گیری، اور قوت اثر سے انکار کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی، اور ہم کو محمد بن جریر طبری جیسے مؤرخین سے شکوہ کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہ جاتا، حقیقت یہ ہیکہ عبداللہ بن سبا اور اس کے بدباطن حمایتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانوادہ کے نام پر اور ان کی عقیدت کا غلاف ڈال کر اتنی خفیہ، اور جذباتی تحریک چلائی تھی کہ حضرت محمد بن ابی بکرؓ جیسے شخص بھی کچھ ہی دیر کے لئے سہی بہرحال ان کے دام تزویر میں اس طرح آگئے کہ خلیفۃ المسلمین وامام برحق حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کے درپے ہوگئے، یہ الگ بات ہے کہ توفیق خداوندی انکے معاون رہی، اور جلد ہی ان کو اپنے اس شرمناک فعل پر ندامت ہوگئی لیکن جب محمد بن ابی بکرؓ جیسے لوگ عبداللہ بن سبا اور اس کی برپا کی ہوئی تحریک کے چکمہ میں آسکتے ہیں، تو چودھویں صدی کا کوئی "خود رو محقق" اگر سبائیت کی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہم جیسے صحابہؓ کا قد ناپنے لگ جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، ہاں ان حالات میں اہل علم، اور اصحاب فکر ونظر کی یہ ذمہ داری ضرور ہیکہ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو اپنی زبان اور اپنے قلم کی پوری قوت کے ذریعہ سبائیت کے زیر زمین فتنہ سے روشناس کراکے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور دوسرے مظلوم صحابہؓ کرام کے حقیقی مقام اور ان کے روشن کارناموں سے واقف کرائیں، خداتعالیٰ اس کار عظیم کے لئے امت کے زیادہ سے زیادہ افراد کو ہمت وحوصلہ اور استعداد عطا فرمائے، (آمین)

حیات وکارنامے

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا نام عبداللہ بن قیس تھا، اور کنیت ابوموسیٰ، ان کے آباء واجداد کی تیرہویں پشت

کے بزرگ کا نام اشعر بن ادد تھا، ان ہی کی طرف منسوب ہوکران کی تمام اولاد اشعری کہلائی۔ مکہ مکرمہ میں اپنے کچھ اشعری بھائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کیا، اور حبشہ کی طرف ہجرت کی، پھر وہاں سے حضرت جعفر طیارؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ اس وقت پہونچے جب حضورؐ خیبر فتح کر چکے تھے۔

حضرت ابوموسیٰؓ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بہت ہی معتمد اصحاب میں سے تھے، حضورؐ نے آنکو زبید اور عدن کا حاکم مقرر کیا تھا، اور اس منصب پر حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے بھی ان کو باقی رکھا، بعد میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی معزولی کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۷ھ میں ان کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا، اور پھر ان کو اہواز کی طرف جانے کا حکم دیا، چنانچہ یہ اہواز گئے، اور اسے جنگ کر کے یا بعض لوگوں کے بیان کے مطابق صلح کر کے فتح کیا، پھر ۱۹ھ میں مقام نصیبین کو فتح کیا۔ پھر ۲۳ھ میں اصفہان کو فتح کیا، حضرت عمرؓ کی شہادت تک یہ بصرہ ہی کے عامل رہے، حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور خلافت کی ابتدا میں بھی انکو ان کے اسی عہدہ پر بحال رکھا، پھر کچھ دنوں کے بعد ان کی جگہ عبداللہ بن عامر کو بصرہ کا حاکم مقرر کر دیا، تب حضرت ابوموسیٰؓ بصرہ چھوڑ کر کوفہ میں آگئے اور وہیں قیام کیا، کوفہ کے عامل حضرت سعید بن عاصؓ کی معزولی کے بعد اہل کوفہ کی درخواست پر حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت ابوموسیٰؓ کو کوفہ کا عامل مقرر کر دیا۔ اور پھر حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت تک یہ اسی منصب پر فائز رہے۔ ؎۱

؎۱ اسد الغابۃ ج ۶ ص ۲۶۔۲۷ (ماخوذ) ابن الاثیر نے اسد الغابۃ میں اور علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۳۹۰ میں بھی لکھا ہے لیکن طبری ج ۴ ص ۱۲۴ میں ہیکہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ان فتوحات ومناصب سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ انتہائی بیدار مغز اور باصلاحیت افراد میں سے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے لیکر حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت تک بڑے بڑے انتظامی اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے اور انتہائی خوش اسلوبی کیساتھ مفوضہ خدمات کو انجام دیا۔ بصرہ اور کوفہ دونوں ایسے مقام تھے جہاں کے لوگ اپنی شورشوں اور ہنگامہ آرائیوں کے ذریعہ جلد جلد عامل تبدیل کرلیا کرتے تھے چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ جیسے مدبر حکمران نے ایک مرتبہ کوفہ کے حالات سے بددل ہوکر فرمایا تھا۔

من عذيري من اهل الكوفة ان استعملت عليهم القوي فجروه وان وليت عليهم الضعيف حقروه ــــــــ	پناہ بخدا! کوفہ کے لوگ بھی عجیب وغریب ہیں، اگر میں ان پر کوئی مضبوط آدمی حاکم بناتا ہوں تو یہ لوگ اس میں کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں، اور اگر کسی کمزور کو حاکم بناتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر وتذلیل کرتے ہیں۔

(عثمان ذو النورین ص ۹۰-۱۹۶ بحوالہ فتوح البلدانؒ)

اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے جب بصرہ کی گورنری سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو مصلحتاً معزول کرکے ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰؓ کو گورنر بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا

(باقی صفحہ گذشتہ) حضرت سعید بن العاصؓ معزول نہیں کئے گئے بلکہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت تک کوفہ کے گورنر ہی رہے، البتہ حضرت ابوموسیٰؓ کو حضرت عمرؓ ہی نے ۲۲ھ میں حضرت عمار بن یاسرؓ کی معزولی کے بعد اہل کوفہ کی درخواست پر مختصر مدت کے لئے بصرہ سے کوفہ منتقل کر دیا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر ان کو بصرہ واپس کر دیا تھا، اور حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت وہ بصرہ ہی کے گورنر تھے، اس طرح حضرت ابوموسیٰ مختصر مدت کیلئے کوفہ کے گورنر رہے،

توحضرت ابوموسیٰؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

انی ارید ان ابعثک الی بلد قد عشش فیہ الشیطان

میں تم کو ایک ایسے شہر میں (گورنر بنا کر) بھیجنا چاہتا ہوں جہاں شیطان نے گھونسلہ بنا لیا ہے۔

(عثمان ذوالنورین ص ۹۷-۱۹۶ بحوالہ فتوح البلدان)

لیکن اس کے باوجود یہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی صلاحیت کی بات تھی کہ وہ بصرہ اور کوفہ دونوں جگہ کے حاکم رہے اور ایسے کامیاب حاکم، کہ ان کے تقرر کے بعد شورش پسندوں کی ایک نہ چل سکی، اور ۱۷ھ سے ۲۹ھ تک دس سال سے زائد عرصہ تک بصرہ کے با اختیار اور کامیاب حاکم رہے، پھر اسی دوران، یا اس کے بعد (اختلاف روایت کے مطابق) کوفہ کے بھی عامل رہے۔

اہواز، نصیبین اور اصفہان کی درج بالا جنگی مہموں کے علاوہ ہجرت مدینہ کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فتح مکہ غزوہ حنین، غزوہ تبوک اور دوسری مہموں میں بھی شرکت کی تھی، جس سے ان کی جنگی و حربی صلاحیتوں کا اندازہ کر لینا آسان ہے۔

ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا علم و تفقہ میں بھی بہت بلند مقام ہے اور وہ جماعت صحابہؓ کے ممتاز علمائے فقہ میں شمار ہوتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی اپنی معرکۃ آرا، کتاب الفاروق جلد ۲ صفحہ ۲۱۲ میں تحریر کرتے ہیں۔

"محدثین کا عام بیان ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں چھ شخص تھے جن پر علم فقہ کا مدار تھا، عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابی ابن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، امام محمد نے کتاب الآثار میں روایت کی ہے ستۃ من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یتذاکرون الفقه بینھم علی ابن ابی طالب و ابی و ابو موسیٰ علیٰ حدۃ و عمر و زید و ابن مسعود یعنی اصحاب رسول اللہ میں سے چھ شخص تھے، جو باہم مسائل فقہیہ میں بحث و مذاکرہ کرتے تھے علیؓ، ابیؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ ایک ساتھ، اور عمرؓ، زیدؓ اور ابن مسعودؓ ایک ساتھ، صفوان بن سلیم کا قول ہے لم یکن یفتی فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر عمر و علی و معاذ و ابی موسیٰ[1] یعنی آنحضرتؐ کے زمانہ میں صرف چار شخص فتویٰ دیتے تھے عمرؓ، علیؓ، معاذؓ، ابو موسیٰؓ۔

امام شعبی کا مقولہ ہے کان العلم یوخذ عن ستۃ من الصحابۃ[2] یعنی علم چھ صحابہ سے سیکھا جاتا تھا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا مقام جماعت صحابہؓ میں بھی کیا ہے، اور خود صحابہ کرامؓ اپنے درمیان ان کو کس مقام کا حامل گردانتے تھے؟ وہ علم کا میدان ہو، یا انتظام و سیاست کا، امن و عافیت کا میدان ہو، یا جنگ کا، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ہر جگہ اپنی امتیازی صلاحیتوں کے ثبوت پیش کئے ہیں، حضرت ابو موسیٰؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی اپنے قبیلہ کے سردار اور معزز ترین فرد تھے، اور اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ان کی یہ شان باقی رہی، جو خدمات ان کے سپرد کی گئیں ان کو انھوں نے بحسن و خوبی انجام دیا، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اور پھر آپ کی وفات کے بعد، آپؐ کے خلفائے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، ذکر ابو موسیٰ اشعریؓ [2] فتح المغیث ص ۳۸۱ (یہ دونوں حوالے علامہ شبلی کی منقولہ بالا عبارت میں شامل ہیں۔)

راشدین کا ان کو برابر اعتماد حاصل رہا۔

ان حقائق کی موجودگی میں جنگ صفین کے موقع پر "تحکیم" میں ان کی ابلہی اور سفاہت کا تاثر دینا، اور حضرت علیؓ کی طرف سے ثالثی کے لئے ان کو نااہل حدود سے تجاوز کرنے والا، اپنے فرائض و اختیار سے بے خبر، وغیرہ جیسے بیہودہ الزامات سے آلودہ کرنا، حضرت ابو موسیٰؓ اور تاریخ اسلام پر ظلم عظیم تو ہے ہی، اپنے خبث باطن اور بغض قلبی کا ایسا بھونڈا مظاہرہ بھی ہے جس کی نہ کسی صحیح العقیدہ مسلمان سے امید کی جا سکتی ہے، نہ ہی مسلمان "سبائیت کے ان علمبرداروں" کو سچا مسلمان ماننے پر تیار ہو سکتے ہیں۔

تحکیم

حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کی بلند قامت شخصیت، اور ان کی بیش بہا خدمات کو جس ایک واقعہ کی "سبائی تفصیلات" کے ذریعہ ملیامیٹ کر کے ان کو معاملہ نافہم سفیہ اور نادان قرار دیا جاتا ہے، اور ان کے مقابلہ میں دوسرے جلیل القدر صحابی حضرت عمرو بن العاصؓ کو ہوشیار، مطلب پرست اور چالباز باور کرانے کی ناپاک کوشش کی جاتی ہے وہ ہے واقعہ تحکیم، مناسب ہوگا کہ پہلے تحکیم کی ضروری تفصیلات بیان کر دی جائیں۔

حضرت علیؓ کے دور خلافت میں سبائی منافقین کی ریشہ دوانیوں، اور ان کے ناروا تسلط کی بدولت، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان "صفین" کے مقام پر جنگ چھڑ گئی، اس جنگ کی بنیاد یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں نے حضرت علیؓ کی بیعت خلافت قبول کرنے سے اس وقت تک کے لئے صاف انکار کر دیا تھا، جب تک خلیفہ مظلوم حضرت عثمان غنیؓ کے خون ناحق کا قصاص نہ لیا جائے۔

جبکہ حضرت علیؓ کا یہ مطالبہ تھا کہ پہلے حضرت معاویہؓ اور تمام اہل شام بیعت کریں، اس کے بعد حالات سازگار ہونے پر قاتلان عثمانؓ سے قصاص لیا جائیگا، حضرت معاویہؓ کا کہنا تھا کہ چونکہ قاتلان عثمانؓ ہی نے حضرت علیؓ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کر کے سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، اور ملک کے انتظام و تدبیر اور حضرت علیؓ کے تمام فیصلوں میں وہ پوری طرح دخیل ہیں، اسی لئے حضرت علیؓ نہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لے پا رہے ہیں، نہ ہی اس صورت حال کے برقرار رہتے ہوئے وہ قصاص لے سکیں گے، لہٰذا فتنہ کے سدباب کی بس یہی صورت ہیکہ یا تو وہ خود قصاص لیکر ان قاتل سبائیوں سے اپنی گلو خلاصی کریں، یا پھر قاتلوں کو ہمارے حوالہ کر دیں تاکہ ہم ان کو ان کے کیفر کردار تک پہونچا کر پوری ملت اسلامیہ کے زخمی دلوں کو سکون پہنچا سکیں۔ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو شام کی گورنری سے معزول کر دیا، لیکن حضرت معاویہؓ اور اہل شام نے حضرت علیؓ کے اس حکم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور ان کی جانب سے مقرر کردہ نئے گورنر حضرت سہل بن حنیفؓ کو واپس جانا پڑا، اختلافات بڑھتے رہے، اور فریقین میں سے کوئی بھی اپنے موقف سے ہٹنے پر تیار نہ ہوا، بالآخر حضرت علیؓ نے اہل شام کے خلاف فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ اور جنگ جمل سے فراغت کے بعد اپنی فوج کو شام کی طرف کوچ کا حکم دیا جب حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے بھی اپنی فوج کو اس راستہ کیطرف کوچ کا حکم دیا، جدھر سے حضرت علیؓ اور ان کی فوج کو آنا تھا، بالآخر مقام صفین میں دونوں فوجیں بالمقابل ہوئیں، اور متعدد معرکے ہوئے، ان معرکوں کے بعد حضرت معاویہؓ کی طرف سے قرآن مجید بلند کر کے مصالحت کی دعوت دی گئی جسے حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں نے فوراً منظور کر لیا، اور دونوں جانب سے جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱؎ (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

جنگ بندی کے بعد "تحکیم" ہوئی یعنی کتاب اللہ کے حکم کے مطابق حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاصؓ ثالث مقرر ہوئے کہ یہ دونوں مل کر کتاب و سنت کے مطابق نزاعی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لہ اس جگہ تاریخ کی ان مکذوبہ سبائی تفصیلات کو بیان کرنے سے ہم نے قصداً گریز کیا جن میں بیان کیا گیا ہے کہ اپنی شکست قریب ہوتے دیکھ کر حضرت عمرو بن العاصؓ نے "جنگی چال" کے طور پر حضرت معاویہؓ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ہمارے لشکر کی طرف سے قرآن بلند کر دیئے جائیں، تاکہ ہماری فوج کو شکست کے بغیر یا تو جنگ سے چھٹی مل جائے، یا کم از کم تازہ دم ہونے کے لئے مہلت مل جائے، اور علیؓ کی فوج میں اس سے انتشار پیدا ہو جائے، چنانچہ حضرت عمروؓ کے اسی مشورہ پر حضرت معاویہؓ کی طرف سے نیزوں پر قرآن "بلند کئے گئے" اور نتیجہ وہی سامنے آیا جس کی حضرت عمروؓ نے امید قائم کی تھی کہ حضرت علیؓ کی فوج انتشار کا شکار ہو کر دو گروہوں میں بٹ گئی، خود حضرت علیؓ اور ان کے "مخلص ساتھی" اس "جنگی چال" کو سمجھ کر جنگ جاری رکھنے پر اصرار کر رہے تھے، جبکہ دوسرے گروہ نے یہ کہہ کر جنگ جاری رکھنے سے صاف انکار کر دیا کہ جب ہم کو کتاب اللہ کی طرف دعوت دی جا رہی ہو تو ہمارے لئے اس سے پیٹھ پھیر کر جنگ جاری رکھنا حرام ہے، حضرت علیؓ نشیب و فراز سمجھاتے رہے اور جنگ جاری رکھنے پر بہت زور ڈالا لیکن ان کی ایک نہ چلی، بالآخر وہ "بادل ناخواستہ" جنگ بندی کر کے مصالحت پر مجبور ہوئے، ان تفصیلات کا جھوٹا ہونا کئی وجوہ سے ظاہر ہے، اول حضرت معاویہؓ و حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے جلیل القدر صحابیوں کا قرآن مجید کو اپنی نفس پرستی، اور مطلب برآری کے لئے استعمال کرنا، دوم ایسے بھونک کر ان کے سہارے قرآن کو بلند کر کے قرآن کی کھلی توہین کرنا، اور حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کا اس پر کوئی احتجاج نہ کر کے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لینا، سوم حضرت علیؓ کا امن کے مقابلہ جنگ، صلح کے مقابلہ خون مسلم کی ارزانی (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

معاملہ کا جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لئے قابل قبول ہوگا، اس سلسلہ میں حسب ذیل دستاویز لکھی گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هذا ما تقاضى عليه على ابن ابى طالب ومعاوية بن ابى سفيان قاضى على على اهل الكوفة ومن معهم من شيعتهم من المؤمنين والمسلمين وقاضى معاوية على اهل الشام ومن كان معهم من المؤمنين والمسلمين انا ننزل عند حكم الله عزوجل وكتابه ولا يجمع بيننا غيره وان كان الله عزوجل بيننا من فاتحته الى خاتمته نحيى ما احيى ونميت ما امات فما وجد الحكمان فى كتاب الله عزوجل وهما ابو موسى الاشعرى عبد الله بن قيس وعمرو بن العاص القرشى عملا به

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ وہ تصفیہ ہے جو علیؓ بن ابی طالب اور معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے درمیان ہوا۔ علیؓ کا یہ فیصلہ تمام اہل کوفہ اور ان کے سب ہوا خواہوں کی طرف سے ہوا جو اہل ایمان اور اہل اسلام ہیں، اور معاویہؓ کا یہ فیصلہ اہل شام اور ان کے سب ساتھیوں کی طرف سے ہوا جو اہل ایمان اور اہل اسلام ہیں، ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور سوائے اس کے ہم کسی بات پر متفق نہیں ہوں گے، اب شروع سے آخر تک جب خدا تعالیٰ ہی ہمارے درمیان ہے تو ہم بھی اسی چیز کو زندہ رکھیں گے جسے اس نے زندگی بخشی، اور ایسی چیز کو مٹائیں گے جسے اس نے قابل فنا قرار دیا، لہٰذا یہ دونوں ثالث یعنی ابو موسیٰ اشعریؓ عبداللہ بن قیسؓ اور عمرو بن العاص قرشیؓ جو کچھ کتاب اللہ عزوجل

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور قرآن کے مقابلہ نفس پرستی پر اصرار کرنا وغیرہ وغیرہ۔

وما لم یجد فی کتاب اللّٰہ عزوجل فالسنة العادلة الجامعة غیر المفرقة[1]

میں پائیں اس پر عمل کریں، اور اگر کتاب اللہ میں کچھ نہ پائیں تو پھر اس سنت کو دیکھیں جو عادلانہ ہو اور مجتمع کرنے والی نہ کہ ایسی جو تفرقہ ڈالے،

اس دستاویز کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت علیؓ سے اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت معاویہؓ سے علٰحدہ علٰحدہ معاہدہ کی ایک دوسری دستاویز حاصل کی، جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

انا علی ما فی هذه الصحیفة وان قد اوجبت قضیتهما علی المؤمنین فان الامن والاستقامة ووضع السلاح بینهم اینما ساروا علی انفسهم واهلیهم و اموالهم وشاهدهم وغائبهم وعلی عبد اللّٰہ بن قیس وعمرو بن العاص عهد اللّٰہ ومیثاقه ان یحکما بین هذه الامة ولا

میں اس دستاویز (یعنی ثالثی نامے) کے مضمون پر عملدرآمد کا عہد کرتا ہوں، اور ان کے فیصلہ کی پابندی اہل ایمان پر لازمی قرار دیتا ہوں، یعنی وہ جہاں کہیں بھی جائیں ان کی جانیں، ان کے اہل و عیال، ان کے مال و متاع، اور ان کے حاضر و غائب سب کے حق میں امن رہے گا، اس کی پوری پاسداری کی جائے گی، اور کسی کے خلاف ہتھیار نہیں استعمال ہوگا، اور عبد اللہ بن قیس اور عمرو بن العاصؓ پر عہد و پیمان الٰہی کے سبب یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس امت کے بارے میں ثالثی کا فرض ادا کریں، اور

---

[1] محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ تحت عنوان التحکیم منقول از حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی ص ۹۸۔ طبری ج ۶ ص ۲۹۔

يردا ها في حرب ولا فرقة
حتى يعصيا واجلا القضاء
الى رمضان وان احبا ان
يوخرا ذالك اخراه على
تراض منهما وان لتوفي
احد الحكمين فان امير
الشيعة يختار مكانه ولا يالو
من اهل المعدلة والقسط
وان مكان قضيتهما الذين
يقضيان فيه مكان عدل
بين اهل الكوفة واهل الشام
وان رضيا واحبا فلا
يحضرهما فيه الا من
ارادا ويأخذ الحكمان
من ارادا من الشهود
ثم يكتبان شهادتهما
على ما في هذه الصحيفة
وهم انصار على من
ترك هذه الصحيفة
واراد فيه الحادا وظلمة
(حوالہ مذکورہ محاضرات...الخ)

نہ دوبارہ اسے جنگ میں ڈھکیلیں اور نہ
اختلاف پیدا کر کے گنہگار بنیں، اور یہ دونوں
فیصلہ کے لئے رمضان کا مہینہ مقرر کرلیں
اور اگر چاہیں تو باہمی رضامندی سے اس
مدت کو اور مؤخر کرلیں۔ اور اگر دونوں
ثالثوں میں سے کسی کی وفات ہوجائے
تو اس گروہ کا امیر اس کی جگہ دوسرے
شخص کا تقرر کردے، مگر اس (نئے ثالث)
کی عدالت و انصاف کے خیال سے منہ
نہ موڑے، ان دونوں کے فیصلہ سنانے
کی جگہ جہاں یہ فیصلہ دیں گے، اہل کوفہ اور
اہل شام کی آبادیوں کے بیچ کی جگہ ہوگی،
ان دونوں کی رضامندی اور خواہش سے
کے بغیر کوئی شخص ان کے پاس نہ جائے،
یہ دونوں ثالث جن لوگوں کی چاہیں گواہی
لیں، پھر اس صحیفہ (ثالثی نامہ) کے سلسلہ
میں یہ دونوں اپنا فیصلہ لکھیں، مسلمان اس
شخص کے مقابلہ میں ان کی مدد کریں گے
جو اس صحیفہ کو پس پشت ڈالدیگا، اور اس
سلسلہ میں ہٹ دھرمی اور ظلم کا ارتکاب
کرے گا۔

تحکیم کے سلسلہ کی ان دونوں دستاویزوں میں جو تاریخ کی تمام متداول کتابوں میں بلا اختلاف مذکور ہیں، حسب ذیل امور کی وضاحت کر دی گئی تھی۔

۱۔ حضرت علیؓ اور ان کے تمام ساتھیوں، اور حضرت معاویہؓ اور ان کے تمام ساتھیوں کو مساویہ طور پر اہل ایمان و اہل اسلام تسلیم کیا گیا۔

۲۔ ثالثوں کو اپنے فیصلے، اور اس سلسلہ کی جملہ کارروائیوں کے لئے کتاب وسنت کو بنیاد بنانیکا پابند کیا گیا، اور اس بات کی بطور خاص تاکید کی گئی کہ وہ تفرقہ ڈالنے والی ہر کارروائی سے قطعاً گریز کریں۔

۳۔ تا فیصلہ فریقین پر قیام امن کی ذمہ داری ڈالی گئی، اور ایک دوسرے کے علاقہ میں بے خوف وخطر آنے جانے کی سہولت دی گئی۔

۴۔ دونوں ثالثوں کی عدالت وانصاف پر فریقین نے اپنے کامل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ان کو اس بات کا پابند کیا کہ اب وہ ایسا فیصلہ کریں جس سے یہ عارضی جنگ بندی مستقل اور پائیدار امن کی صورت اختیار کرے، اور دوبارہ اختلاف وجنگ کی صورت نہ پیدا ہونے پائے۔

۵۔ ثالثوں کی مرضی کے بغیر کسی فریق کو ان سے ملنے کی اجازت نہ تھی، البتہ ثالثوں کو یہ اختیار تھا کہ وہ جتنے لوگوں سے چاہیں مل کر ان کی گواہی حاصل کریں، اور مشورے کریں۔

۶۔ شہادت ومشاورت اور دوسرے تمام ضروری مراحل سے گذرنے کے بعد ثالثوں کے فیصلہ سنانے کے لئے رمضان کا مہینہ[1] مقرر کیا گیا، لیکن کارروائی

---

[1] یعنی تقریباً ساڑھے چھ ماہ بعد، کیونکہ یہ معاہدہ ۱۳ صفر ۳۷ھ میں ہوا تھا، اور فیصلہ کے لئے رمضان ۳۷ھ کا مہینہ مقرر کیا گیا۔

مکمل نہ ہونے اور ثالثوں کے ضرورت محسوس کرنے کی صورت میں ان کو فیصلہ کی تاریخ مزید آگے بڑھانے کی اجازت دی گئی۔

۷۔ فیصلہ سنانے کی جگہ کے لئے یہ پابندی رکھی گئی کہ وہ اہل کوفہ اور اہل شام کی آبادیوں کا درمیانی مقام ہو۔

۸۔ ثالثوں پر ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ اپنا فیصلہ تحریری طور پر پیش کریں۔

۹۔ فریقین نے مسلمانوں کی طرف سے یہ ذمہ داری لی کہ ان کی طرف سے فیصلہ کی پوری پوری پابندی کی جائے گی، اور جو شخص اس فیصلہ کی خلاف ورزی کرکے ظلم کا ارتکاب کرے گا، مسلمان اس سے نپٹیں گے۔

۱۰۔ فیصلہ دینے سے پہلے کسی ایک ثالث کی وفات ہو جانے کی شکل میں اس کی جگہ پر دوسرے ثالث کی تقرری کی گنجائش اسی شرط کے ساتھ رکھی گئی جس شرط پر موجودہ ثالث حضرت ابوموسیٰؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ پورے تھے، یعنی عدل وانصاف کی پابندی۔

ان دونوں دستاویزوں کی عبارتوں اور ان کی وضاحتوں کی روشنی میں ثالثوں کی پوزیشن، اور ان کے طریق کار کے سلسلہ میں دو بنیادی باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

اوّل یہ کہ فریقین کو ثالثوں کے اخلاص، عدل وانصاف، تدبر ودانائی، معاملہ فہمی، اور نزاعی مسئلہ کا قابل قبول حل نکال لینے کی صلاحیت پر کامل اعتماد تھا

دوم یہ کہ ثالث کتاب وسنت کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے ایسا طریق کار اپنائیں گے جو مکمل طور پر غیر جانبدارانہ ہو، اور امت کے بہترین مفاد میں وہی فیصلہ دیں گے جو جنگ وجدال، اور اختلاف وانتشار کو ختم کرکے امن وامان قائم کرنیوالا ہو۔

مندرجہ بالا تمام حقائق کی روشنی میں ثالثوں کے متفق علیہ مقام، ان کی اہم ترین ذمہ داری، اور ان کی مرجعیت پر نگاہ رکھتے ہوئے اس پر غور کیجئے کہ ان سے کس فیصلہ کی توقع کی جاسکتی ہے، اور تاریخ ہمیں کس فیصلہ کی خبر دے رہی ہے؟۔

ثالثوں کا فیصلہ

سب سے پہلے اس بات کا ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ یہ پورا معاملہ اس دور کا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک نے خیر القرون قرار دیا ہے، اور معاملہ کے دونوں فریقوں اور ثالثوں کا تعلق اس جماعت سے ہے جس سے بہتر، پاکیزہ، اور لائق تقلید انسانی گروہ کا روئے زمین پر تصور نہیں کیا جاسکتا، اور پھر تاریخ کے اس بیان پر غور کیا جائے کہ ثالثوں نے فیصلہ وہ دیا جس نے فتنے کے نئے دروازوں کو کھول دیا، ایک فریق نے کھلے عام فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور اس کے مقرر کردہ ثالث کو "منہ چوری" پر مجبور ہونا پڑا۔ دوسرے فریق نے اپنے مقرر کردہ ثالث کی "عیاری" پر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ فریقین نے ایک دوسرے کو، اور اسی طرح ثالثوں نے ایک دوسرے کو جی بھر کر برا بھلا کہا، غرضیکہ امت میں ایک نہ ختم ہونے والے فساد کا دروازہ کھل گیا

انا للہ وانا الیہ راجعون ؕ

تاریخ کے بیان کے مطابق

واجتمع الناس باذرح فی شعبان اور اسی سال کے شعبان[1] میں لوگ مقام اذرح

---

[1] اذرح یا دومۃ الجندل کے اجتماع کیلئے سیوطی کے علاوہ دوسرے تمام مؤرخین نے رمضان کا مہینہ لکھا ہے، صرف وہی شعبان کا مہینہ تحریر کر رہے ہیں، جبکہ معاہدہ ثالثی کی دستاویز کے مطابق بھی فیصلہ کے لئے رمضان ہی کا مہینہ مقرر ہوا تھا۔ قیاس کن زگلستان......

من هذه السنة وحضرها	میں جمع ہوئے، اس میں حضرت سعد بن ابی
سعد بن ابي وقاص وابن عمر	وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ان
وغيرهما من الصحابة	دونوں کے علاوہ دیگر صحابہؓ بھی تھے،
فقدّم عمرو ابا موسى الاشعري	عمروؓ نے اپنی چالاکی سے ابو موسیٰ اشعریؓ کو
مكيدة منه فتكلم فخلع	آگے بڑھایا، انھوں نے تقریر کی اور علیؓ
عليا وتكلم عمرو فاقر	کو معزول کر دیا، ان کے بعد عمروؓ نے تقریر
معاوية وبايع له فتفرق	کی اور معاویہؓ کو برقرار رکھ کر ان کی بیعت کر
الناس على هذا وصار	لی، پھر لوگ اسی پر منتشر ہو گئے، اور علیؓ اپنے
عليّ في خلاف من اصحابه	ساتھیوں کے اختلاف میں پڑ گئے، یہاں
حتى صار على يعض على اصبعه	تک کہ علیؓ اپنی انگلی دانتوں سے کاٹتے
ويقول أُعصىٰ ويطاع	اور کہتے کہ میری تو نافرمانی کی جا رہی ہے اور
معاوية....الخ[له]	معاویہؓ کی اطاعت کی جا رہی ہے۔

طبری، ابن الاثیر اور ابن کثیر وغیرہ نے فیصلہ کی جو تفصیلات اپنی اپنی تاریخوں میں درج کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

دونوں ثالثوں یعنی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے نئے خلیفہ کے انتخاب کا معاملہ عام مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے، اس کے بعد دونوں ثالث مجمع عام میں آئے، جہاں دونوں طرف کے چار چار سو اصحابؓ کرام اور ان کے علاوہ کچھ غیر جانبدار و بزرگ حضرات مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت

له تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۸۷۔

عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ وغیرہم موجود بھی تھے، حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے کہا کہ ہم لوگوں کے درمیان جو کچھ طے ہوا ہے، اسے ان لوگوں کو بتا دیجئے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سنکر حضرت ابوموسیٰؓ سے کہا کہ اگر آپ دونوں کے درمیان متفقہ طور پر کوئی بات طے ہو گئی ہے تو اس کا اعلان عمروؓ کو کرنے دیجئے، مجھے اندیشہ ہے کہ آپ دھوکا کھا گئے ہیں، لیکن حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا کہ مجھے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے، اور ہمارے درمیان ایک بات پر اتفاق ہو چکا ہے، پھر وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم دونوں اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ہم علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کر دیں، پھر لوگ باہمی مشورہ سے جس کو پسند کریں خلیفہ کی حیثیت سے منتخب کر لیں، لہذا میں علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے معاملہ آپ لوگوں کے ہاتھ میں دیتا ہوں کہ اب آپ جسے چاہیں اپنا نیا امیر بنا لیں؛ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ جو کچھ میرے ساتھی نے ابھی کہا، اسے آپ لوگوں نے سن لیا کہ انھوں نے اپنے آدمی علیؓ کو معزول کر دیا میں بھی ان کی طرح علیؓ کو معزول کرتا ہوں، اور اپنے آدمی معاویہؓ کو قائم رکھتا ہوں؛ کیونکہ وہ عثمانؓ بن عفان کے ولی اور ان کے خون کے دعویدار اور ان کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، یہ سنکر حضرت ابوموسیٰؓ نے حضرت عمروؓ سے کہا، تم نے یہ کیا کیا؟ خدا تمہیں توفیق نہ دے، تم نے دھوکا دیا، اور گنہگار بنے، تمہاری مثال تو اس کتے کی ہے جس پر بوجھ لادو تو بھی ہانپے، چھوڑ دو تو بھی ہانپے، اس کے جواب میں حضرت عمروؓ نے کہا کہ تمہاری مثال اس گدھے کی ہے جو بوجھ ڈھوئے پھر تا ہے" حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا کہ، ابوموسیٰؓ تمہارے حال پر افسوس ہے کہ تم عمروؓ کی چالوں کے مقابلے میں بہت کمزور نکلے، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے کہا کہ،، ابوموسیٰؓ اگر اس سے پہلے ہی مر گئے ہوتے تو ان کے حق میں زیادہ اچھا ہوتا ،،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ " دیکھو اس امت کا کیا حال ہوگیا ہے کہ اس کا مستقبل دو ایسے شخصوں کے حوالے کر دیا گیا کہ ان میں سے ایک کو اس کی پرواہ نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے اور دوسرا انتہائی کمزور ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ثالثوں کے درمیان طے وہی بات ہوئی تھی ۔ جس کا حضرت ابو موسیٰؓ نے اعلان کیا تھا ۔ لیکن حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنی چالاکی سے حضرت ابو موسیٰؓ کو مات دیدی ، اسی لئے وہ اس مجمع سے اٹھ کر حضرت معاویہؓ کے پاس گئے اور ان کو خلافت کی مبارکباد پیش کی ، دوسری طرف حضرت ابو موسیٰؓ اتنے شرمندہ تھے کہ وہ پھر حضرت علیؓ کو منہ بھی نہ دکھا سکے اور سیدھے مکہ چلے گئے ۔

ظاہر ہیکہ یہ فیصلہ مؤرخین کے بیان کے مطابق یکطرفہ طور پر حضرت معاویہؓ کے حق میں اور حضرت علیؓ کے خلاف ہوا تھا ، پھر حضرت علیؓ نے اس پر اپنا کیا ردعمل ظاہر کیا ؟ اس کو بھی ، " چودھویں صدی کے ایک محقق " کے الفاظ میں جو انھوں نے الطبری ج ۴ ص ۵ کے حوالہ سے بیان کیا ہے ، ملاحظہ کر لیجئے ، کہ حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کو رد کر کے اپنی جماعت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا ۔

" سنو یہ دونوں صاحب جنھیں تم لوگوں نے حکم مقرر کیا تھا ، انھوں نے قرآن کے حکم کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا ، اور خدا کی ہدایت کے بغیر ان میں سے ہر ایک نے اپنے خیالات کی پیروی کی ، اور ایسا فیصلہ دیا جو کسی واضح حجت اور سنت ماضیہ پر مبنی نہیں ہے ، اور اس فیصلہ میں دونوں نے اختلاف کیا ہے ، اور دونوں ہی کسی صحیح فیصلے پر نہیں پہونچے ہیں "

اسی سلسلہ بیان میں موصوف اس کے بعد تحریر کرتے ہیں ۔

" اس کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ واپس پہونچ کر شام پر چڑھائی کی پھر تیاریاں شروع کر دیں .... مگر عراق کے لوگ

ہمت ہار چکے تھے اور خوارج کے فتنے نے حضرت علیؓ کے لئے مزید ایک درد سر پیدا کر دیا تھا، پھر حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کی تدبیروں سے مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور دنیائے اسلام عملاً دو متحارب حکومتوں میں بٹ گئی، آخر کار حضرت علیؓ کی شہادت (رمضان ۴۰ھ) اور پھر حضرت حسنؓ کی مصالحت (۴۱ھ) نے میدان حضرت معاویہؓ کے لئے پوری طرح خالی کر دیا۔ لہ

وضاحت طلب اُمور

فیصلہ کی مندرجہ بالا تفصیلات اور حضرت علیؓ کی جانب سے فیصلہ پر بیان کردہ ردِعمل کے سلسلہ میں درج ذیل اُمور وضاحت طلب ہیں۔

۱۔ ثالثوں کے تقرر (۱۳ صفر ۳۷ھ) اور فیصلہ سنانے (شعبان یا رمضان ۳۸ھ) کے بیچ کی مدت میں ثالثوں کے درمیان کسی ملاقات، یا ان کے کسی سے مشورہ کرنے یا شہادت حاصل کرنے، یا اس سلسلہ کی کسی دوسری سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا، تاریخ ہمیں بس اتنا ہی بتاتی ہے کہ ایک بیٹھک اس وقت ہوئی جب ثالثوں کا تقرر ہوا، اور دوسری اس وقت ہوئی جب فیصلہ سنایا گیا، غور و خوض کرنے، اور شہادت و مشورہ حاصل کرنے کی درمیانی مدت میں ثالثوں نے اپنے فرائض کس طرح انجام دیئے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں۔

۲۔ تحکیم کی دستاویز میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ ثالثوں کا فیصلہ تحریری ہوگا لیکن تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ فیصلہ کی مجلس میں ثالثوں نے صرف تقریریں

لہ خلافت و ملوکیت ص ۱۴۴-۱۴۵۔

کیں، اور کوئی تحریر نہیں پیش کی، نہ ہی کسی ایسی تحریر کا تاریخ میں کہیں سراغ ملتا ہے ثالثوں نے ایسا کیوں کیا؟ تحریری فیصلہ تھا اور تاریخ سے اسے غائب کر دیا گیا، یا فیصلہ تحریری تھا ہی نہیں؟ اگر فیصلہ تحریری شکل میں تھا ہی نہیں، تو فریقین کی طرف سے شریک مجلس چار چار سو اصحابؓ اور ان کے علاوہ دوسرے غیر جانبدار و بزرگ حضرات میں سے کسی نے تحریری فیصلہ کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ ان سوالوں کے جواب سے تاریخ خاموش ہے، ع پتہ چلتا ہے چوری کا یہیں سے

۳۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ (معاذ اللہ) بہت ہی ناسمجھ اور بیوقوف قسم کے آدمی تھے، اور حضرت عمرو بن العاصؓ (معاذ اللہ) نہایت ہی چالاک اور فطرتی قسم کے آدمی تھے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے حضرت ابو موسیٰؓ کو مخاطب کر کے کہے تھے کہ "مجھے اندیشہ ہے کہ آپ دھوکا کھا گئے ہیں"، لیکن فیصلہ پر حضرت علیؓ نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس میں دونوں ثالثوں کو یکساں طور پر مجرم گردانا کہ دونوں نے قرآن کے حکم کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا، دونوں نے اپنی خیالات کی پیروی کی، دونوں کسی صحیح فیصلے پر نہیں پہونچے، اور دونوں نے ایسا فیصلہ دیا جو کسی واضح حجت اور سنت ماضیہ پر مبنی نہیں ہے؟ ان دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے اور حضرت ابو موسیٰؓ کا واقعی قصور کیا ہے؟ حضرت عمرو بن العاصؓ کی "سازش" میں شریک ہو کر حضرت علیؓ کو خلافت سے معزول کرنا، یا ان کی وہ "سفاہت و ابلہی" جس کی وجہ سے حضرت عمروؓ بن العاص کو انھیں مات دینے کا موقع مل گیا؟۔

۴۔ دونوں ثالثوں کی "سازش"، یا حضرت ابو موسیٰؓ کی "ابلہی" اور حضرت عمروؓ کی "چالاکی" کے باوجود دونوں کا کوئی متفقہ فیصلہ تو سامنے آیا نہیں، ایک نے کچھ کہا اور دوسرے نے کچھ، پھر اسی مجلس میں ہر ایک نے دوسرے کو ملامت کرتے

ہوئے (معاذ اللہ) کتا اور گدھا بھی بنایا، پھر وہ کون سا فیصلہ ہے جس پر حضرت عمرو بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو خلافت کی مبارکباد دی، اور حضرت علیؓ نے اس پر اپنی ناگواری و بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رد کیا؟۔

۵۔ تحکیم کس سلسلہ میں ہوئی تھی، اور ثالثوں کو کس بات کا فیصلہ کرنا تھا؟ فیصلہ کی بیان کردہ تقریروں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں مدعی خلافت تھے، بلکہ دونوں کی خلافت اپنے اپنے حلقۂ اثر میں تسلیم بھی کی جا چکی تھی، اور حضرت ابو موسیٰؓ نے اپنے فیصلہ میں دونوں کو اس منصب سے معزول کر کے نئے خلیفہ کے انتخاب کی سفارش کی تھی، جبکہ حضرت عمروؓ نے صرف حضرت علیؓ کو معزول کر کے حضرت معاویہؓ کو "خلافت" پر برقرار رکھا تھا، حالانکہ یہ کسی گری پڑی تاریخی روایت سے بھی نہیں ثابت ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کر کے اس کی بیعت لی ہو، اس کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی خلافت پر بیعت ہو چکی تھی، اور انھیں امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا تھا، صرف حضرت معاویہؓ اور ان کے شامی ساتھیوں نے بیعت نہیں کی تھی، وہ بھی اس لئے نہیں کہ وہ خود خلافت کے مدعی تھے بلکہ اس لئے کہ ان کا مطالبہ تھا کہ پہلے قاتلان عثمان غنیؓ سے قصاص لیا جائے تب ہم بیعت کریں گے، پھر حضرت ابو موسیٰؓ نے حضرت معاویہؓ کو کس چیز سے معزول کیا تھا، اور حضرت عمروؓ نے ان کو کس چیز پر برقرار رکھا تھا؟ اگر یہ شام کی گورنری کا معاملہ کہا جائے تو اولاً تو تحکیم اس سلسلہ میں تھی ہی نہیں، نہ ہی اس کا ثالثوں کی دستاویزوں میں ذکر تھا، اور اگر دونوں ثالثوں نے یا ایک ثالث نے از خود انھیں شام کی گورنری سے معزول کیا تھا، تو اس کا فائدہ کیا تھا؟ اور قاتلان عثمانؓ سے قصاص، یا حضرت علیؓ کی بیعت خلافت سے اس کا کیا تعلق تھا؟ حالانکہ یہی دونوں اصل نزاعی

مسئلے تھے،

۶۔ ثالثوں کے اس فیصلے یا "متضاد تقریروں" کا فیصلہ کی مجلس میں شریک آٹھ سوسے زائد اصحابؓ پر کیا اثر ہوا؟ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو توچند لوگوں کا بُرا بھلا کہنا بیان بھی کیا گیا ہے، لیکن حضرت عمروؓ بن العاص (جو بیان کے مطابق اصلی ملزم تھے) توصاف بچکر نکل گئے، اوران کو حضرت ابوموسیٰؓ کے سوا کسی نے کچھ نہ کہا، کیا ان کی "چالاکی" کے آگے سب نے ہتھیار ڈال کر حضرت معاویہؓ کی خلافت تسلیم کرلی۔ اورکیا اس فیصلہ کے بعد حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے مقابلہ میں خلافت کی بیعت لی؟ اگر نہیں ـــــ اور یقیناً نہیں، توکیوں؟ کیا انھوں نے بھی حضرت علیؓ کی طرح اس فیصلہ کو رد کردیا تھا؟ اگرایسا ہوتوان کے فیصلہ رد کرنے کی کیا وجہ تھی؟ اور اگر ایسا نہیں ہے، توحضرت معاویہؓ نے فیصلہ پرکیا ردعمل ظاہر کیا؟

۷۔ حضرت علیؓ کی طرف سے فیصلہ کی علی الاعلان مخالفت اور دونوں ثالثوں کو مجرم گردانے کے بعد، پھر شام پرچڑھائی کی تیاریاں شروع کرنے سے فریقین میں اشتعال وہیجان پیدا ہونا، اورچھ ماہ پہلے کی جنگ بندی کا ختم ہونا، بالکل فطری تھا، پھر اگر حضرت علیؓ خارجیوں کے فتنہ کی وجہ سے شام پرچڑھائی کرنے سے مجبور ہوگئے تھے، توحضرت علیؓ کی اس کمزوری سے حضرت معاویہؓ نے فائدہ اٹھاکرکوفہ پرکیوں نہ چڑھائی کردی؟ صلح کی امید پر صفر کے مہینے میں جوجنگ بندی ہو ئی تھی وہ اس "ناکام فیصلہ" کے بعد مستقل کیسے ہوگئی، جبکہ اس فیصلہ کے بعد بھی تین سال تک حضرت علیؓ خلیفۃ المسلمین وامیر عام کی حیثیت سے، اور حضرت معاویہؓ شام کے گورنر کی حیثیت سے اپنی اپنی مفوضہ خدمات انجام دیتے رہے؟۔

یہ وہ چند وضاحت طلب امور ہیں جو اس وقت تک وضاحت طلب ہی رہیں گے جب تک ابومخنف لوط بن یحییٰ کی ان دروغ بافیوں کو صحیح تسلیم کیا جاتا

رہے گا جنکو فیصلہ کی تفصیلات بیان کرنے کے سلسلہ میں سب سے پہلے طبری نے اپنی تاریخ میں جگہ دی، اور پھر طبری ہی سے نقل اور نقل در نقل ہو کر تقریباً تمام متداول تاریخی کتابوں میں درج ہو گئیں۔ تمام امور کی وضاحت خود بخود ہو جاتی اگر کسی بھی تاریخی مجموعہ میں ثالثوں کے فیصلہ کی تحریری دستاویز درج ہوتی، لیکن اس دستاویز کو تو، سبائیوں نے غائب ہی اسی غرض سے کیا تھا کہ اس طرح صحابہ کرامؓ کو عموماً، اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ و حضرت عمرو بن العاصؓ کو خصوصاً بدنام کرنے، اور ان کی پاکباز ہستیوں کی کردار کشی کرنے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

فیصلہ پر ایک نظر

یہ بات تو پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ثالثوں کے فیصلہ کی وہ تفصیلات قطعاً غلط اور مہمل ہیں جنکا بیان طبری اور پھر اس کے بعد دوسرے تاریخی مجموعوں میں ہوا ہے، کیونکہ روایت و درایت کی کسوٹیوں پر یہ تفصیلات کھوٹی ثابت ہوتی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ فیصلہ کی تفصیلات اور اس کے متن کے محفوظ رہنے کی جگہ یہ تاریخی کتابیں ہی تھیں، مگر چونکہ سبائیوں کی کارگذاریوں کی وجہ سے ثالثوں کے فیصلہ کی وہ تحریری دستاویز تاریخ میں محفوظ نہ ہو سکی، اس لئے فیصلہ سے پہلے اور فیصلہ کے بعد کے حالات و واقعات کو بنیاد بنا کر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مجموعی طور پر فیصلہ انتہائی کامیاب فریقین کے لئے قابل قبول، اور عام مسلمانوں کے بہترین مفاد میں تھا، اور اس سلسلہ میں ثالثوں پر جو تہمتیں باندھی جاتی ہیں، اور ان کی جو گھناؤنی تصویر پیش کی جاتی ہے وہ بالکل ناقابل قبول ہے کیونکہ

۱۔ دونوں ثالث اپنی ذاتی زندگیوں میں نہایت اونچے مقام کے حامل

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے خلفائے راشدینؓ، اور عام صحابہؓ کے معتمد لوگ تھے، ان کی فکری، انتظامی، اور سیاسی صلاحیتیں صحابہؓ کی جماعت میں بھی ممتاز تھیں، ان سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لے کر ان کے ذمہ امت میں پیدا ہونے والے ایک خلفشار کو مٹانے اور کتاب و سنت کی روشنی میں صحیح فیصلہ دینے کی امید قائم کی گئی تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو اپنی حیثیت عرفی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مبارک صحبت، اور خدا کے نام کی عظمت، کسی چیز کا خیال نہ رہا ہو، اور وہ "پرائے شگون میں اپنی ناک کٹانے" کا غیر دانشمندانہ اقدام کرتے؟۔

۲۔ اگر ثالثوں نے اپنی ذمہ داریوں کو قطعاً فراموش کر کے، اور خدانخواستہ دین و دیانت کو بالائے طاق رکھ کر غلط فیصلہ دیا ہوتا تو اسی مجلس میں موجود آٹھ سو سے زائد چیدہ و نمائندہ مسلمان اسی وقت ان کی "خیریت پوچھ لیتے"، اور یہ نہ ہوتا کہ بس چند افراد "منہ پیٹتے" رہ جاتے، اور باقی لوگ خاموش تماشائی بنے رہتے، ایسا تو آج کے گئے گذرے دور میں بھی نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ عہد صحابہؓ میں؟۔

۳۔ تحکیم یا ثالثوں کے تقرر کا مقصد یہی تھا کہ نزاعی مسائل جنگ کے بجائے امن کے ماحول میں طے ہو جائیں، اور امت مسلمہ خون خرابے سے محفوظ ہو جائے کیونکہ فریقین کو تمام اختلافات کے باوجود یہ احساس بہرحال پوری شدت کے ساتھ تھا کہ مسلمان کا خون مسلمان ہی کے ہاتھوں بہہ رہا ہے؛ ثالثوں کے تقرر کے بعد رفتہ رفتہ کشیدگی کم ہوتی گئی، اور فیصلہ کے بعد پھر جنگ کی نوبت نہیں آئی، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ثالثوں کے فیصلہ سے فریقین مطمئن ہو گئے، اور انھوں نے فیصلہ قبول کر لیا۔

تحکیم اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ

جہاں تک حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ

کا معاملہ ہے تو واقعہ تحکیم کی بنیاد پر ان کے سلسلہ میں دو متضاد باتیں کہی جاتی ہیں،
اول یہ کہ حضرت علیؓ ان کو شروع ہی سے اپنا ثالث بنانے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ وہ تو اپنی طرف سے اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ثالث بنانا چاہتے تھے، مگر ان ہی کے لوگوں یعنی اہل عراق نے اس بات پر اعتراض کیا کہ عبداللہ بن عباسؓ تو آپ کے بھائی اور آپ کے مثل ہیں، ثالث تو غیر جانبدار لوگوں میں سے ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے الاشتر کا نام پیش کیا تو عراقیوں نے اسے بھی نامنظور کرتے ہوئے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ثالث بنائے جانے پر اصرار کیا، مجبوراً حضرت علیؓ نے بھی ان کو ثالث بنائے جانے کی اجازت دیدی۔
دوم یہ کہ حضرت ابوموسیٰؓ (نعوذ باللہ) ایک مغفل اور سفیہ قسم کے آدمی تھے اور ان کے مقابلہ میں حضرت عمروؓ بن العاص (نعوذ باللہ) ایک چالاک اور شاطر قسم کے آدمی تھے، اسی لئے وہ فیصلہ کے موقع پر حضرت ابوموسیٰؓ کو چکمہ دینے میں کامیاب ہوگئے
اگر یہ دونوں باتیں بالکل صحیح مان لی جائیں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کو حضرت ابوموسیٰؓ پر اعتماد کیوں نہیں تھا، اور وہ ان کو ثالث کیوں نہیں بنانا چاہتے تھے؟ اگر وجہ یہی تھی کہ ان کو حضرت ابوموسیٰؓ کی زیرکی و دانائی، اور عقل و تدبر پر اعتماد نہیں تھا، اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ثالث بننے سے کام بگڑ جائے گا، تو یہ بات حضرت ابوموسیٰؓ کی پوری زندگی کے ریکارڈ کے خلاف تھی، کیونکہ یہ حقیقت تھی جس سے حضرت علیؓ بھی بخوبی واقف تھے کہ ابوموسیٰؓ وہ شخص ہیں جن کی زیرکی و دانائی، تدبر و سیاست، فہم و فراست، اور فقہ و دیانت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتماد کرتے ہوئے علمی و سیاسی دونوں قسم کی خدمات ان کی سپرد

کیں، اور انھوں نے انھیں بخوبی انجام دیا، حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے تینوں پیشرو خلفاء نے بھی اپنے اپنے دور میں ان کی صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان کو اہم عہدے بھی عطا کئے اور ان کی قدر افزائی بھی کی، پھر حضرت ابوموسیٰؓ سے منسوب کوئی ایسا جھوٹا واقعہ بھی کسی تاریخی کتاب تک میں "تحکیم" سے پہلے کا نہیں ملتا جس سے ان کی "سفاہت" پر کچھ روشنی پڑتی ہو، بلکہ اسکے برعکس ان کے ایسے حالات معتبر ذرائع سے ملتے ہیں جن سے ان کے جماعت صحابہؓ میں امتیازی مقام کا پتہ چلتا ہے، تو اچانک ان کی "بے عقلی اور سفاہت" کی بات حضرت علیؓ کیسے سوچ سکتے تھے؟ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان کے "فیصلہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں "نہایت ہی کمزور" کیونکر قرار دے سکتے تھے؟

اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علیؓ کی مخالفت کی وجہ یہ نہیں تھی بلکہ اس کی بنیادی وجہ وہ تھی جس کا ذکر انھوں نے "ثالثوں کے فیصلہ" کے بعد کوفہ میں "اپنے ہواخواہوں" کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کیا تھا کہ "دونوں ثالث خدا کے حکم کو پس پشت ڈالنے والے، اس کی ہدایت سے روگردانی کرنے والے، اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کرنے والے ہیں"، تو ہم حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ سے منسوب ایسی "واہی تقریر" پر کیسے اعتماد کر سکتے ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے تین خلفائے راشدین کی مخالفت کرتے ہوئے ان سب کی، نیز تمام صحابہؓ کی معتمد شخصیتوں پر اس رکیک انداز میں حملے کئے گئے ہوں؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے نہ تو حضرت ابوموسیٰؓ کے ثالث بننے کی مخالفت کی، نہ ہی "فیصلہ" کے بعد انھوں نے وہ تقریر کی، جس میں ثالثوں کے کردار پر ناروا حملوں اور فیصلہ کو رد کر کے اہل شام پر پھر سے حملہ کرنے کی بات بیان کیجاتی ہے، یہ ساری داستانیں اسی مردود راوی کی گڑھی ہوئی ہیں جس کا دل مریض

اور بعض صحابہؓ سے لبریز تھا، اور جس کا نام تھا ابو مخنف لوط بن یحییٰ (کذّاب)

ان وضعی داستانوں کی صحت پر یقین کرنے سے صحابہؓ کرام جیسی مقدس جماعت کی جو گھناؤنی تصویر ابھرتی ہے، وہ تو اپنی جگہ، اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ حضرت علیؓ (نعوذ باللہ) وہ بدقسمت انسان تھے جن کا کوئی سچا ہمدرد اور خیر خواہ تھا ہی نہیں، کیونکہ اہل شام تو ان کے دشمن تھے ہی۔ اہل عراق بھی ان کے ایسے بدترین دشمن اور نافرمان تھے کہ صلح و جنگ ہر حالت میں وہ حضرت علیؓ کی مخالفت ہی کرتے تھے، اور خود حضرت علیؓ اس قدر ضعیف، اس قدر مغلوب، اور اس قدر کمزور قوتِ فیصلہ کے مالک انسان تھے کہ ان کو ہر موقع پر اپنی رائے و مرضی کے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا، وہ ابو موسیٰؓ کو ثالث نہیں بنانا چاہتے تھے، مگر عراقیوں کی مخالفت کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ اور وہی ثالث مقرر ہوئے، اسی طرح ثالثوں کے "خلاف دین و دیانت فیصلہ" کے بعد وہ شام پر پھر سے چڑھائی کرنا چاہتے تھے، انھوں نے "اپنے ہمدردوں" کے سامنے جوشِ آور تقریریں کیں، ان کو للکارا، اور ان کو تمام نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے دین کا واسطہ دیکر جنگ کا حکم دیا، مگر وہ ایسے "کمزور اور مجبور خلیفہ" تھے جن کی بات کسی نے نہیں سنی، اور ان کی "جنگ کی خواہش" کے باوجود امن قائم رہا۔ نعوذ باللہ من ھٰذہ الخرافات الباطلۃ۔

ہم صحابہؓ کرام کی عزت و ناموس پر ایسے "خرافاتی ذخیرہ" کو نچھاور کرنے ہی کو دین و ایمان کا تقاضا گردانتے ہیں جس سے اس پاکباز جماعت پر حرف آئے، جس کی پاکبازی، خدا ترسی، اخلاص و للّٰہیت، اور بے نفسی کے گواہ خدا اور اس کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔

کیونکہ ہم کو ابو مخنف، ہشام کلبی، اور محمد بن سائب جیسے سبائیوں کی روایت

کردہ "تاریخ" سے زیادہ خدا کے کلام اور اس کے پیغمبر صادقؐ کی احادیث پر اعتماد ہے،

سچائی یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ثالثوں کی دستاویزوں میں درج شرائط کی پوری پابندی کرتے ہوئے کتاب وسنت کی ہدایت میں جنگ صفین کے اسباب کا پتہ لگایا، فریقین کے موقف کی خوبیوں وخامیوں کا جائزہ لیا اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ غور وخوض کرنے، نیز استصواب رائے کرنے کے بعد انھوں نے جو فیصلہ دیا، وہ فیصلہ نہ صرف فریقین، بلکہ بلا اختلاف تمام مسلمانوں نے تسلیم کیا، فیصلہ کی تحریر کا متن تو سبائیوں کے "ہاتھ کی صفائی" کی وجہ سے تاریخ میں نہ آسکا، لیکن فیصلہ کی اس برکت کو سبائی بھی چھپانے پر قدرت نہیں رکھتے تھے کہ فیصلہ کے بعد نہ حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے درمیان کوئی جنگ ہوئی، نہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے خون عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ ہوا، اور نہ ہی حضرت علیؓ کی طرف سے شام کی گورنری سے حضرت معاویہؓ کی معزولی کے لئے اصرار ہوا، اور اس فتنہ کا پورے طور پر سد باب ہوگیا جس کے لئے ثالثوں کا تقرر ہوا تھا۔

اس شاندار کامیابی کے ہوتے بھلا حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کیوں حضرت علیؓ سے "منہ چھپاکر" مکہ جاتے؟ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی بے لوث ومخلصانہ خدمت، اور ان کی شاندار کامیابی ان کی نسلوں تک کیلئے سرمایۂ افتخار بنی رہی، چنانچہ ان کے پوتے حضرت بلال بن بریدہ بن ابی موسیٰؓ اشعری کی شان میں قصیدہ کہتے ہوئے شاعر ذی الرمہ نے حضرت ابوموسیٰؓ کے اس شاندار کارنامہ کا ذکر اس طرح کیا ہے، ؎

ابوك تلافی الدين والناس بعدما ۔۔۔ تشاءوا وبيت الدين منقطع الكسر

(ترجمہ) آپ کے باپ تو وہ تھے جنھوں نے دین اور اہل دین کی اس وقت شیرازہ بندی کی جب دین کا قصر گرنے کے قریب پہونچ گیا تھا۔

فشد اصار الدین ایام اذرح   ورد حروبا قد لقحن الی عقر

انھوں نے اذرح والے دنوں میں دین کے خیمہ کی طنابیں کس دیں، اور ان جنگوں کو روک دیا جو اسلام کی نسل منقطع کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔

فرضی اللہ عنہم وارضاہ



حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابیؓ، اسلام کے مایۂ ناز جرنیل، اور "دہاۃ عرب" میں شمار ہونے والے اسلامی فرزند، حضرت عمرو بن العاصؓ بھی سبائیوں کی دوطرفہ سازش سے تاریخ کی مظلوم شخصیتوں میں شامل ہوگئے، جب خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصر کی گورنری سے معزول کر کے ان کی جگہ حضرت عبداللہؓ بن سعد کو مقرر کیا تھا، اس وقت خلیفۂ ثالث پر "اقربا پروری" کا الزام لگانے کے لئے سبائیوں نے حضرت عمروؓ بن العاص کے خوب خوب فضائل بیان کئے، کہا گیا کہ وہ مصر کے فاتح تھے، حضرت عمر فاروقؓ کے معتمد، اور ان کے مقرر کردہ مصر کے گورنر تھے، عوام کے محبوب نمائندے تھے، میدان جنگ کے بہترین قائد تھے، اور ان کا شمار مدبرین عرب میں ہوتا تھا، ان کے مقابلہ میں حضرت عبداللہؓ بن سعد میں اس کے سوا کوئی اور خوبی نہ تھی کہ وہ حضرت عثمان غنیؓ کے رشتہ داروں میں سے تھے اور پھر حضرت عمروؓ بن العاص کے سارے فضائل بیان کرنے کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کے ذریعہ ان کی معزولی کو ان پر "ناروا ظلم" قرار دیتے ہوئے حضرت عثمان غنیؓ کو اقربا پروری سے متہم کیا گیا[1] ــــــــــ (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

حضرت عمروؓ بلاشبہ ان تمام اوصاف سے متصف تھے، لیکن سبائیوں کی طرف سے ان کے یہ فضائل ان کی شخصیت کے اعتراف کے لئے نہیں، بلکہ صرف حضرت عثمان غنیؓ پر اقرباپروری کا الزام عائد کرنے کیلئے بیان کئے جاتے ہیں، اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ یہی حضرت عمروؓ بن العاص جب حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ان کے اور حضرت معاویہؓ کے درمیان روز بروز بڑھتے ہوئے اختلافات سے پریشان ہو کر افہام و تفہیم، اور اصلاح امّت کا جذبہ لیکر حضرت معاویہؓ کے پاس شام آگئے، اور ان کو اعتماد میں لیکر ان کے اور حضرت علیؓ کے درمیان مصالحت کی راہیں ہموار کرنے لگے، تو ان ہی سبائیوں کی طرف سے ان پر کیسے کیسے الزام عائد کر دیئے گئے؟ صفین کی جنگ کا مشورہ دینے والے وہ ٹھہرائے گئے، میدان جنگ میں "نیزوں پر قرآن" بلند کرانے کا ان کو ذمہ دار بنایا گیا، اور ثالثی کے فیصلہ میں "عیاری" کرنے والا انھیں گردانا گیا، غرضیکہ وہی شخصیت جسے حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں "ہمہ صفات موصوف" قرار دیا گیا تھا، اسے ہی حضرت علیؓ مرتضیٰ کے دور خلافت میں "ہمہ عیوب" قرار دیدیا گیا۔

یعنی حضرت عثمان غنیؓ کو ظالم و جارح گردانے کے لئے حضرت عمروؓ بن العاص، نہایت اعلیٰ و ارفع، اور حضرت معاویہؓ کو ظالم و جارح قرار دینے کیلئے وہی حضرت عمروؓ بن العاص نہایت ہی پست و چالاک، یہ ہے سبائیت کا وہ دہرا معیار جسے "صحیح اسلامی تاریخ" قرار دیکر جلیل القدر اصحابؓ رسولؐ کی کردار کشی کی جارہی ہے،

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لے اس الزام کی پوری حقیقت اور اسکا مفصل جواب حضرت عثمان غنیؓ کے تذکرہ کے ذیل میں گذر چکا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے،

حضرت عمروؓ بن العاص پر عائد کئے جانے والے بے بنیاد الزامات کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان کے مختصر حالات زندگی سامنے آجائیں،

شخصیت و کردار

حضرت عمروؓ بن العاص عرب کے ان ممتاز مدبرین میں سے تھے، جو زمانۂ جاہلیت سے لیکر زمانۂ اسلام تک، پھر زمانۂ اسلام میں بھی عہد نبویؐ سے لیکر اپنی وفات یعنی حضرت معاویہؓ کے دور تک، ہمیشہ صف اوّل میں رہے، اور ان کی قائدانہ صلاحیتوں سے ہر دور میں فائدہ اٹھایا گیا، چنانچہ علامہ ابن الاثیر تحریر کرتے ہیں۔

کفار قریش نے انھیں عمرو بن العاص کو نجاشی (شاہ حبش) کے پاس بھیجا تھا کہ جس قدر مسلمان ان کے ملک میں آگئے ہیں ان کو واپس کردیں، مگر نجاشی نے اس کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ اے عمرو! تعجب ہے کہ تم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال پوشیدہ ہے، وہ تو اللہ کے سچے نبی ہیں، تم میرا کہا مانو، چنانچہ نجاشی کی یہ بات سنکر وہاں سے ہجرت کرکے حضور کے پاس آئے اور اسلام قبول کرلیا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے ۸ھ میں فتح مکہ سے چھ ماہ پہلے اسلام قبول کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک لشکر کا سردار بناکر غزوہ ذات السلاسل میں بھیجا، چنانچہ یہ پہلے تین سو افراد پر مشتمل ایک چھوٹا لشکر لیکر گئے، پھر ضرورت پڑنے پر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مدد کے لئے اور لشکر مانگا تو آپ نے ان کے تعاون کے لئے حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کی سرکردگی میں ایک لشکر اور بھیجا، جس میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دوسرے مہاجرین اولین بھی تھے، وہاں پہونچکر حضرت ابو عبیدہؓ کا لشکر بھی حضرت عمروؓ ہی کے تابع ہوگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عمان کا عامل مقرر کیا تھا، اور

اس عہدہ پر حضورؐ کی وفات تک فائز رہے، پھر خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ نے ان کو شام کی طرف سردار بنا کر بھیجا اور یہ وہاں کی فتوحات میں شامل رہے، پھر خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ نے پہلے ان کو فلسطین کا حاکم مقرر کیا، اس کے بعد ان کو ایک لشکر کا سردار بنا کر مصر بھیجا، اور انھوں نے مصر کو فتح کیا، فتح مصر کے بعد حضرت عمرؓ نے ان ہی کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا، اور حضرت فاروق اعظمؓ کی شہادت تک، پھر حضرت عثمان کے عہد خلافت کے ابتدائی چار برسوں تک یہ بھی اسی عہدے پر فائز رہے، اس کے بعد جب حضرت عثمان غنیؓ نے ان کو مصر کی گورنری سے معزول کر کے ان کی جگہ حضرت عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کر دیا، تو یہ فلسطین چلے گئے، اور وہاں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی، پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد یہ حضرت معاویہؓ کے پاس (شام) چلے گئے اور وہاں ان کے معین بنے، جنگ صفین میں بھی شریک ہوئے، اور تحکیم کے واقعہ میں ایک حکم (حضرت معاویہؓ کی طرف سے) یہ بھی تھے۔ عرب کے بڑے بہادروں میں سے تھے، ان کی وفات اصح قول کے مطابق شب عید الفطر ۴۳ھ میں ہوئی، ویسے وفات کے سلسلہ میں ۴۲ھ، ۴۸ھ اور ۵۱ھ کے اقوال بھی ہیں، جب وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

یا اللہ! میں کمزور ہوں میری مدد کر، میں گنہگار ہوں میرا عذر قبول کر، میں مغرور نہیں ہوں بلکہ استغفار کر رہا ہوں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اسی کی تکرار کرتے کرتے وفات پائی، [1] انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مندرجہ بالا حالات سے حضرت عمروؓ بن العاص کی درج ذیل امتیازی خوبیاں معلوم ہوئیں، جنھیں ہم چار ادوار میں تقسیم کر رہے ہیں۔

---

[1] ترجمہ اسد الغابہ ج ۷ص ۱۵۵ تا ۱۵۶ (ملخصاً)

۱۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی ان کی قائدانہ صلاحیت پر اعتماد کیا جاتا تھا چنانچہ جب نجاشی شاہ حبشہ نے ان مسلمانوں کو اپنے ملک میں پناہ دیدی جو حضورؐ کی اجازت سے ہجرت کر کے گئے تھے، تو کفار مکہ کو اس کی بڑی ناگواری ہوئی اور انھوں نے چاہا کہ کسی طرح یہ مسلمان امن و عافیت سے نکل آئیں، مگر ظاہر ہے کہ حبشہ میں امان پانے والے مسلمان کفار قریش کی دست رس سے باہر تھے، پھر بھی انھوں نے نجاشی سے بات چیت کر کے مسلمانوں کو وہاں سے نکلوانے کی کوشش کی، اور ایک فرمانروا سے گفتگو کر کے اسے ہموار کرنے کی ذمہ داری عمرو بن العاص ہی پر ڈالی، کیونکہ ان کی صلاحیت پر مکہ والوں کو اعتماد تھا۔

۲۔ پھر جب انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جوہر قابل ؓ کی صلاحیتوں کا اندازہ فرما کر ان کو غزوۂ ذات السلاسل کا سالار مقرر کر کے ان کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا، پھر ان کے مزید لشکر طلب کرنے پر ان کی کمک کے لئے مہاجرین اولین پر مشتمل ایک لشکر حضرت ابو عبیدہؓ کی سرکردگی میں بھیجا، اور ان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ افضل الصحابہؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح جیسے اکابر صحابہؓ کے اس موقع پر قائد و امیر بنے، اس کے علاوہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو عمان کا عامل بھی مقرر فرمایا، اور آپ کی وفات تک یہ اس عہدہ پر برقرار رہے۔

۳۔ حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بھی اہم ترین انتظامی و عسکری ذمہ داریاں ان کے سپرد کی گئیں، اور انھوں نے ان ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیا، خصوصاً حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مصر کی فتح کا کارنامہ عظیم الشان و ناقابل فراموش ہے۔

۴۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں مصر کی گورنری سے معزولی کے بعد

یہ کچھ دل برداشتہ وملول ہو کر فلسطین میں گوشہ نشین ہو گئے تھے، پھر حضرت عثمانؓ غنی کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں یہ شام آئے، اور حضرت معاویہؓ کے ساتھ مل کر سرگرم سیاست میں حصّہ لیا۔

ان چاروں ادوار میں سے اول الذکر تین ادوار میں حضرت عمروؓ بن العاص کے بے داغ کردار پر کسی حرف زنی کی جرأت نہیں کی گئی، البتہ چوتھے دور میں ان پر ایسے ایسے الزامات عائد کئے گئے، اور ان کی سیرت وکردار کو اس طرح مسخ کیا گیا کہ ان کی زندگی کے تمام روشن کارناموں پر پانی پھر گیا، اب ہم بالترتیب ان سبائی الزامات اور ان کی حقیقت کو ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ پر قتلِ عثمانؓ کی ذمّہ داری ڈالنے کا مشورہ

طبری اور البدایہ جیسی کتب تاریخ کی ایک روایت کے ذریعہ حضرت عمروؓ بن العاص پر ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت معاویہؓ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ کے قتل کا ذمہ دار قرار دیکر ان سے جنگ کیجئے، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے اسی مشورہ پر عمل کرتے ہوئے، "پانچ جھوٹے گواہ،، اس بات پر تیار کرائے کہ وہ شہادت دیں کہ حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ ہی نے قتل کیا ہے، اور پھر اسی مطالبہ کی بنیاد پر بالآخر جنگ صفین برپا ہوئی

اس روایت کی حیثیت من گھڑت کہانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، کیونکہ خونِ عثمانؓ کے سلسلہ میں حضرت معاویہؓ اور تمام اہل شام کا موقف بالکل واضح تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو اس بہیمانہ وظالمانہ قتل سے بالکل بری سمجھتے تھے، البتہ وہ ان کو قاتلانِ عثمانؓ کا پشت پناہ ضرور سمجھتے تھے، اسی لئے ان کا حضرت علیؓ سے یہ مطالبہ تھا کہ یا تو وہ خود ان قاتلوں سے قصاص لیں، اور اگر یہ نہ کر سکیں

تو قاتلوں کو ہمارے حوالہ کردیں تاکہ ہم ان سے قصاص لے لیں، اس کے بعد ہم کو حضرت علیؓ کی بیعت قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا، چنانچہ جنگ جمل کے بعد جب حضرت علیؓ کے قاصد حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ حضرت معاویہؓ کے نام حضرت علیؓ کا وہ خط لیکر آئے جس میں ان کو فہمائش کرتے ہوئے اطاعت و بیعت قبول کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا، تو اس خط کو پاکر حضرت معاویہؓ نے کیا کیا؟ اس کا حال حافظ ابن کثیرؒ ہی یوں بیان کرتے ہیں۔

فطلب معاویة عمرو بن العاص ورؤس اهل الشام فاستشارهم فابوا ان يبايعوه حتى يقتل قتلة عثمان او يسلم اليهم قتلة عثمان وان لم يفعل قاتلوه ولم يبايعوه حتى يقتل قتلة عثمان[1]

پس حضرت معاویہؓ نے حضرت عمروؓ بن العاصؓ اور رؤسائے شام کو بلا کر ان سے اس سلسلہ میں مشورہ مانگا، تو ان لوگوں نے اس وقت تک ان (حضرت علیؓ) کی بیعت سے انکار کردیا، جبتک وہ خود قاتلان عثمانؓ کو قتل کردیں یا ان کے سپرد نہ کردیں اور اگر ان دونوں میں سے کوئی بات حضرت علیؓ نہ مانیں تو ان سے جنگ ہو اور بیعت نہ ہو، تاوقتیکہ وہ قاتلان عثمان کو قتل نہ کردیں۔

اسی طرح ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت معاویہؓ نے حضرت ابوامامہؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کے سامنے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں علیؓ سے صرف خون عثمانؓ کے قصاص کے لئے لڑ رہا ہوں،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ، ص ۲۵۳ ۔

انھوں نے قاتلانِ عثمانؓ کو پناہ دے رکھی ہے آپ لوگ ان سے جاکر
کہئے کہ وہ قاتلین سے قصاص لے لیں، پھر اہلِ شام میں سے سب سے
پہلے میں ان کی بیعت قبول کروں گا۔" [1]

اسی طرح یہی حافظ ابن کثیرؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی طرف سے آئے ہوئے وفد کے سامنے حضرت معاویہؓ نے اپنے موقف کی یوں وضاحت کی:

"ہم آپ کے خلیفہ حضرت علیؓ کو نہ خونِ عثمانؓ کا ذمہ دار گردانتے ہیں
نہ ہی اس سے بری کہتے ہیں، بلکہ انھیں ان قاتلانِ عثمانؓ سے دستبردار
ہوجانا چاہیئے، جنکو انھوں نے پناہ دے رکھی ہے، وہ انھیں ہمارے سپرد
کردیں تاکہ ہم ان سے قصاص لے لیں، پھر ہم کو ان کی اطاعت میں کوئی
عذر نہیں ہے۔" [2]

ان روایات سے درج ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ حضرت معاویہؓ، حضرت عمروؓ بن العاص و دیگر اہلِ شام، حضرت عثمان غنیؓ کے قتل سے حضرت علیؓ کا کوئی تعلق نہیں سمجھتے تھے، لیکن ان حضرات کا یہ خیال ضرور تھا کہ چونکہ حضرت عثمانؓ کے قتل کے ذمہ دار مصر کے باغی ٹولہ ہی نے سب سے پہلے حضرت علیؓ کی خلافت کی تحریک کرکے ان سے بیعت کی ہے، اس لئے حضرت علیؓ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لینے میں تساہلی سے کام لے رہے ہیں، جبکہ ان کو زمامِ خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے خلیفۂ مظلوم کے قاتلوں سے قصاص ہی لینا چاہیئے تھا، یہی وجہ ہے کہ اہلِ شام نے حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت قبول کرنے کے لئے یہ شرط لگادی تھی کہ وہ یا تو خود قصاص لے لیں، یا قاتلوں کو ہمارے

---

[1] البدایۃ ج ۷، ص ۲۵۹ [2] البدایۃ ج ۷، ص ۲۵۷۔

حوالہ کردیں، تب ہی بیعت کی جائے گی۔

۲۔ یہ موقف تمام اہل شام کا تھا، اس لئے نہ تو حضرت عمروؓ بن العاص کو یہ مشورہ دینے کی ضرورت تھی کہ حضرت معاویہؓ، حضرت علیؓ کو خون عثمان کا ذمہ دار ٹھہرائیں، نہ ہی حضرت معاویہؓ کو اس سلسلہ میں "جھوٹے گواہوں" کی گواہی کی حاجت تھی۔

۳۔ حضرت عمروؓ بن العاص سے تنہا نہ حضرت معاویہؓ نے اس سلسلہ میں کوئی مشورہ طلب کیا تھا، نہ ہی انھوں نے تنہا مشورہ دیا تھا، بلکہ حضرت علیؓ کے قاصد حضرت جریر بن عبداللہؓ جب ان کا خط لیکر آئے تو دیگر روسائے شام کے ساتھ حضرت معاویہؓ نے حضرت عمروؓ کو بھی مشورہ کے لئے طلب کیا تھا، اور سب نے متفقہ طور یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ حضرت علیؓ سے یہ مطالبہ کیجئے کہ وہ قاتلان عثمانؓ سے قصاص لیں، جب وہ ایسا کرلیں گے تب ہی ہم ان کے ہاتھ پر بیعت کرینگے۔

اس تفصیل کے سامنے آنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عمروؓ بن العاص پر یہ سبائیوں کا ایک بیہودہ و ناقابل یقین الزام ہے کہ انھوں نے حضرت معاویہؓ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان سے جنگ کریں۔

نیزوں پر قرآن بلند کرانے کی جنگی چال

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان برپا ہونے والی جنگ صفین کے موقع پر حضرت عمروؓ بن العاص پر "جنگی چال" کا الزام عائد کرتے ہوئے ایک مشہور ناقد اصحاب نبیؐ تحریر کرتے ہیں۔

"حضرت عمار کی شہادت کے دوسرے روز، اصفر کو سخت معرکہ برپا

ہوا جس میں حضرت معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہونچ گئی۔
اس وقت حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھالے اور کہے ھٰذا حکم بیننا وبینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے) اس کی مصلحت حضرت عمروؓ نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی، کچھ کہیں گے کہ یہ بات مان لی جائے، اور کچھ کہیں گے کہ نہ مانی جائے ہم مجتمع رہیں گے اور ان کے ہاں تفرقہ برپا ہو جائے گا، اگر وہ مان گئے تو ہمیں مہلت مل جائے گی،، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ محض ایک جنگی چال تھی، قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا، اس مشورہ کے مطابق لشکر معاویہؓ میں قرآن نیزوں پر اٹھایا گیا، اور اس کا وہی نتیجہ ہوا، جس کی حضرت عمروؓ بن العاص کو امید تھی"۔[1]

پوری عبارت کو غور سے پڑھئے، خصوصاً خط کشیدہ جملہ کو بار بار پڑھیئے کیونکہ فاتح مصر، مدبر اعظم، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت عمروؓ بن العاص پر یہ ریمارک کسی "دشمن اصحابؓ" کا نہیں، بلکہ ایک ایسے "علامۂ کلب" جو نہ صرف محقق بلکہ ڈنکے کی چوٹ "مفکر اسلام" ہیں اس روایت میں درج ذیل دعوے کئے گئے۔

۱۔ حضرت معاویہؓ کی فوج کو شکست سے دوچار ہوتے دیکھ کر حضرت عمروؓ بن العاص نے یہ مشورہ دیا کہ ہماری فوج نیزوں پر قرآن بلند کر کے، قرآن کے حکم ماننے کا اعلان کر دے۔

---

[1] خلافت وملوکیت ص ۱۳۹۔

۲۔ ایسا کرنے کی حضرت عمروؓ نے خود ہی یہ مصلحت بتائی کہ اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی، اور اگر انھوں نے ہماری بات مان لی تو ہمیں دتیاری اور دم لینے کی مہلت مل جائے گی۔

۳۔ حضرت عمروؓ کا مقصود قرآن کو حکم بنانا نہیں تھا، بلکہ یہ صرف ان کی ایک "جنگی چال" تھی۔

۴۔ حضرت عمروؓ کے اس مشورہ کے مطابق حضرت معاویہؓ کے لشکر سے نیزوں پر قرآن بلند کر دیئے گئے، اور ان کی امید کے مطابق نتیجہ یہی سامنے آیا کہ حضرت علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی را ور حضرت علیؓ کو اپنی خواہش و اصرار کے خلاف مجبوراً جنگ بند کرنا پڑی۔ موصوف نے حضرت عمروؓ کی اس "جنگی چال" کے لئے جن کتب تاریخ کے حوالے دئے ہیں، ان میں ایک البدایۃ کا بھی ہے ہمیں تعجب ہے کہ اسی حوالہ کی کتاب کے اسی صفحہ پر امام احمد کی وہ باسند روایت ان کو کیوں نظر نہ آسکی جسے حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے؟ پہلے آپ اس روایت کو ملاحظہ کیجئے، جس میں حضرت ابووائلؓ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کنا بصفین فلما استحر	ہم صفین میں تھے، تو جب اہل شام کے
القتال باھل الشام اعتصموا	ساتھ جنگ خوب زور پکڑ گئی، شامی ایک
بتل فقال عمرو بن العاص	ٹیلے پر چڑھ گئے، پھر حضرت عمروؓ بن العاص
لمعاویۃ ارسل الی علی	نے معاویہؓ سے کہا کہ آپ علیؓ کی طرف
بمصحف فادعہ الی کتاب	قرآن بھیجکر ان کو کتاب اللہ کی طرف
اللہ فانہ لن یابی علیک	دعوت دیں، وہ ہرگز اس سے انکار
فجاء بہ رجل فقال	نہ کریں گے، تب قرآن لیکر ایک آدمی
بیننا وبینکم کتاب اللہ	معاویہؓ کی طرف سے آیا، پھر اس نے کہا

فقال علی نعم انا اولٰی بہذا الکتاب بیننا وبینکم کتاب اللّٰہ۔[۱]

کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ اللہ کی کتاب فیصلہ کرنے والی ہے، تو علیؓ نے کہا ہاں میں تو اس کا زیادہ حقدار ہوں، ٹھیک ہے، ہمارے تمہارے درمیان یہ کتاب اللہ ہی فیصلہ کرنیوالی ہے

اس روایت میں حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ صفین میں شرکت کرنیوالے صحابی حضرت ابو وائلؓ درج ذیل باتیں بیان فرما رہے ہیں،

۱۔ جب جنگ شباب پر تھی (اور کسی کی فتح و شکست کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے) اس وقت حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ حضرت علیؓ کو کتاب اللہ کی طرف دعوت دیجئے، اور اسی کے ذریعہ آپسی معاملہ طے کیجئے، امید ہے کہ حضرت علیؓ اس سے انکار نہ کریں گے،

۲۔ حضرت عمروؓ کے اسی مشورہ کے مطابق حضرت معاویہؓ نے اپنا ایک آدمی قرآن مجید لیکر حضرت علیؓ کے پاس بھیجا (نہ یہ کہ نیزوں پر قرآن بلند کرکے اس کی بیحرمتی کی گئی) اور اس نے حضرت علیؓ کو یہ پیش کش کی کہ اس کتاب اللہ کو ہم دونوں فریق اپنا حکم بنالیں، اور اسی کے مطابق فیصلہ کریں۔

۳۔ حضرت علیؓ نے حسب توقع اس پیشکش کو فوراً منظور کرتے ہوئے فرمایا کہ کتاب اللہ پر عمل کرنے اور اس کی دعوت دینے کا میں تو زیادہ حقدار ہوں، لہذا مجھے یہ پیشکش منظور ہے اور اسی کے مطابق ہم دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے گا۔

یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کے سلسلہ میں ہیں، اور اتفاق یہ ہے کہ

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ جلد ۷، ص ۲۷۲، تطہیر الجنان ص ۱۲۲-۱۲۱ - منقول از خلافت وملوکیت از صلاح الدین یوسف ص ۳۹۲ -

حافظ ابن کثیرؒ کی البدایہ میں دونوں موجود ہیں، لیکن ان دونوں کے درمیان درج ذیل تضادات ہیں ۔

۱- پہلی روایت میں حضرت عمروؓ بن العاص کی طرف سے قرآن مجید کو حکم بنانے کا مشورہ دینے کی بات اس وقت کہنے کا ذکر ہے جب حضرت معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہونچ گئی تھی، جبکہ دوسری روایت میں اس کی صاف وضاحت ہے کہ حضرت عمروؓ نے یہ مشورہ عین اس وقت دیا تھا، جب جنگ پورے زور وشور پر تھی، اور فریقین میں سے کسی کی فتح وشکست کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے

۲- پہلی روایت میں ہے کہ حضرت عمروؓ نے نیزوں پر قرآن مجید بلند کرنے کا مشورہ دیا تھا، اور اسی مشورہ کے مطابق ان کی فوج کی طرف سے نیزوں پر قرآن بلند کیا گیا جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمروؓ نے حضرت معاویہؓ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ حضرت علیؓ کے پاس قرآن بھیجکر ان کو قرآن کی طرف آنے اور اسے حکم بنانے کی دعوت دیجئے، اور پھر اسی مشورہ کے مطابق ایک آدمی کو قرآن لے کر حضرت معاویہؓ نے بھیجا، جس نے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو قرآن کو حکم بنانے کی دعوت دی، جسے حضرت علیؓ نے منظور کر لیا۔

۳- پہلی روایت میں ہے کہ حضرت عمروؓ نے قرآن کو حکم بنانے کی پیشکش کی وجہ یہ بیان کی کہ علیؓ کے لشکر میں اس پیشکش کو قبول کرنے، نہ کرنے کے معاملہ کو لیکر پھوٹ پڑ جائے گی، اور ہمارا لشکر متحد رہے گا، اور اگر علیؓ نے ہماری پیشکش قبول کر کے جنگ بندی تسلیم کر لی، تو ہمیں مہلت مل جائے گی، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ صرف ایک "جنگی چال" تھی، جس کے ذریعہ مقابل کے فوج کو کمزور کرنا، اور اس کی طاقت کو منتشر کرنا مقصود تھا، نہ کہ واقعی قرآن کو حکم بنانا، جبکہ دوسری روایت میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی

"جنگی چال" نہیں بلکہ ایک مخلصانہ پیشکش تھی۔

۴۔ پہلی روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ "جنگی چال" کو سمجھ کر اس پیش کش کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ جنگ جاری رہے اور فیصلہ ہو ہی جائے، انھوں نے اپنے لشکر کے لوگوں کو ہر چند سمجھایا کہ یہ صرف ایک "جنگی چال" ہے اور تمہاری فتح بالکل قریب آچکی ہے، لیکن ان کے لشکر کے لوگوں نے ہتھیار ڈال دئیے اور ان کی ایک نہ سنی، جس کی وجہ سے مجبور ہو کر حضرت علیؓ کو بھی جنگ بندی قبول کرنا پڑی، جبکہ دوسری روایت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، اور بتایا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے جنگ بندی کی پیشکش، اور قرآن کو حکم تسلیم کرنے کی بات فوراً منظور کرلی تھی، اور اس پر بطیب خاطر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا،

جب ایک ہی واقعہ کے سلسلہ میں تاریخ کی کتابوں میں دو ایسی متضاد روایتیں ہوں، تو جرح و تعدیل کے اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے راجح روایت کو قبول کرنے اور مرجوح روایت کو رد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے البتہ جن لوگوں نے پہلے سے یہ طے کرلیا ہو کہ تاریخ کے ذخیرہ سے ان ہی روایتوں کا انتخاب کر کے گرما گرم سرخیوں کے ساتھ پیش کرنا ہے جن سے صحابۂ کرام کی عدالت اور ان کا وقار مجروح ہوتا ہو، ان کے لئے کسی اصول کی ضرورت نہیں ہو بس کتابوں کا حوالہ دیدینا ہی کافی ہے۔

ہم جب پوری ایمانداری اور دیانت کے ساتھ دونوں روایتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو دوسری ہی روایت ہر طرح قابل قبول معلوم ہوتی ہے، کیونکہ پہلی روایت اصول روایت اور اصول درایت ہر اعتبار سے قطعاً ناقابل اعتماد ہے جس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اس روایت کا راوی، وہی دروغ گو اور رسوائے زمانہ رافضی ابو مخنف

ہے، جس کی کوئی بھی ایسی روایت جس سے کسی صحابی کی منقصت ظاہر ہوتی ہو، محدثین کے اصول کے لحاظ سے ناقابل قبول ہے۔

۲- اس روایت میں آگے بیان کیا گیا ہیکہ حضرت علیؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کی اس "جنگی چال" کو سمجھ کر اہل عراق کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ معاویہ، اور یہ عمرو بن العاص، یہ ابن ابی معیط، اور حبیب بن مسلمہ یہ ابن ابی سرح، اور ضحاک بن قیس، نہ اصحاب دین ہیں نہ اصحاب قرآن، میں انھیں تم سے زیادہ جانتا ہوں بچپن سے ان کا میرا ساتھ رہا ہے، یہ بدترین بچے تھے اور بدترین مرد ہیں، انھوں نے قرآن بلند کرنے کی یہ حرکت محض دھوکہ دینے کیلئے کی ہے، خود انھیں قرآن سے کچھ تعلق نہیں ہے"

کیا یہ بات کسی بھی طرح قابل یقین ہو سکتی ہے کہ ایک جلیل القدر صحابی حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت ولیدؓ بن عقبہ، حضرت حبیبؓ بن مسلمہ، حضرت عبداللہؓ بن ابی سرح، اور حضرت ضحاکؓ بن قیس جیسے نامی گرامی صحابیوں کے سلسلہ میں اتنی بازاری زبان استعمال کی ہو؟ کیا حضرت علیؓ کو ان اصحابؓ کا مقام معلوم نہ تھا، اور ان کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ ان میں کے اکثر لوگ وہ ہیں جن پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اعتماد فرمایا ہے؟ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اعتماد یافتہ صحابیوں کو حضرت علیؓ دین و ایمان سے خارج گردان سکتے تھے؟ بدترین بچے اور بدترین مرد کون؟ حضرت معاویہؓ جنکو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کتابت وحی کی ذمہ داری سونپی، اور ان کیلئے ھادی ومھدی ہونے کی دعا کی۔ حضرت عمروؓ بن العاص، جنکو آپ نے غزوۂ ذات السلاسل کا کمانڈر مقرر فرمایا، اور ان کی مدد کے لئے ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے اجلہ صحابہؓ کو ان کی

ماتحتی میں جہاد کرنے کے لئے بھیجا، اور اپنی وفات تک ان کو عمان کا والی مقرر کئے رکھا؟ یہی حال دوسرے تمام لوگوں کا بھی تھا، پھر کیا حضرت علیؓ، ان اکابر کے سلسلہ میں ایسی بات کہہ سکتے تھے؟ اور کیا مجمع میں موجود لوگ ایسے معروف لوگوں کے سلسلہ میں ایسی باتیں سنکر برداشت کر سکتے تھے؟۔

۴۔ پھر ذرا نیزوں پر قرآن، بلند کئے جانے کا تصور کیجئے، کیا عملاً اس کی کوئی صورت اس کے سوا ہو سکتی ہے کہ (نعوذ باللہ) قرآن مجید کے اوراق پھاڑ کر ان میں نیزے بھونکے جائیں، اور پھر انھیں بلند کیا جائے؟ کوئی گرے سے گرا مسلمان بھی، کیا قرآن مجید کی یہ بیحرمتی برداشت کر سکے گا؟ پھر کیسے مسلمان تھے حضرت معاویہؓ، اور ان کے ساتھی، کہ ان میں کے ایک دو نہیں، پانچ سو لوگوں نے "نیزوں پر قرآن" بلند کر دیئے؟ اور کیسے مسلمان تھے حضرت علیؓ، اور ان کے ساتھی، کہ کسی ایک نے بھی قرآن کی اس کھلی توہین اور بیحرمتی کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا؟ کیا اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی کبھی نیزوں پر قرآن بلند کرنے کا "حادثہ" پیش آیا ہے؟۔

یہ وہ دلائل ہیں جن سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ ساری کہانی من گھڑت ہے، جو صحابۂ کرامؓ کے کردار کو مجروح کرنے کیلئے وضع کی گئی ہے، اور اس کے جھوٹ ہونے کیلئے ابو مخنف کی "ذات شریف" کا اس روایت کی سند میں موجود ہونا ہی کافی ہے۔

حقیقت وہی ہے جسکو حضرت ابو وائل والی روایت میں بیان کیا گیا ہے اور اس روایت کی رو سے حضرت عمروؓ بن العاص کی کسی بدنیتی یا "جنگی چال" کا نہیں بلکہ ان کے اخلاص کا پتہ چلتا ہے، اور یہی چیز ان جیسے مرتبہ والے انسان کے شایان شان ہے۔

فیصلہ میں بدعہدی

حضرت عمروؓ بن العاص پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے جنگ صفین کے موقع پر ایک ثالث کی حیثیت سے نہ صرف حضرت ابوموسیٰؓ سے بدعہدی کی، بلکہ اپنی طرف سے ایک ایسا فیصلہ دیا جس نے اختلافات کی خلیج کو اور بڑھا دیا،

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے تذکرہ میں جنگ صفین کے سلسلہ میں دو ثالثوں کے تقرر اور ان کے فیصلہ کی تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں، نیز یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ معاہدہ کے رو سے چونکہ حضرت علیؓ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے ثالث حضرت ابوموسیٰؓ، اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے ثالث حضرت عمروؓ بن العاص دونوں اس بات کے پابند تھے کہ وہ اپنا فیصلہ "تحریری" دیں، اور تحریری فیصلہ کے کسی متن کا ذکر کئے بغیر مورخین نے فیصلہ کے موقع پر دونوں ثالثوں کی "تقریروں" کا ذکر کیا ہے، اس لئے نہ ان تقریروں کو "فیصلہ" قرار دیا جا سکتا ہے نہ ہی ان تقریروں کی نسبت ثالثوں کی طرف کرنا درست ہے۔

اس جگہ ہم پھر اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ثالثوں کے فیصلہ کے سلسلہ میں حضرت عمروؓ بن العاص پر بدعہدی بلکہ "چالبازی" کا الزام سراسر غلط اور جھوٹ ہے کیونکہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ فیصلہ کے اجتماع میں حضرت عمروؓ بن العاص نے پہلے حضرت ابوموسیٰؓ اشعریؓ سے تقریر کروا کر ان سے یہ کہلوا لیا تھا کہ "ہم دونوں اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ علیؓ اور معاویہؓ کو معزول کر دیں، پھر لوگ باہمی مشورہ سے جس کو پسند کریں خلیفہ کی حیثیت سے منتخب کر لیں، لہذا میں علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کرتا ہوں"، اس کے بعد خود تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میرے ساتھی نے جو کچھ کہا وہ آپ لوگوں نے

سن لیا کہ انھوں نے اپنے آدمی علیؓ کو معزول کر دیا، میں بھی ان کی ہی طرح علیؓ کو معزول کرتا ہوں، اور اپنے آدمی معاویہؓ کو قائم رکھتا ہوں۔

تو قطع نظر اور تمام باتوں کے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ فیصلہ کی اس "تقریر" کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص کسی کو منھ دکھانے کے لائق نہیں رہ گئے، کیونکہ اولاً تو انھوں نے "اپنی تقریر" میں حضرت ابو موسیٰؓ کی اس بات کی تردید نہیں کی کہ "ہم دونوں اس بات پر متفق ہوگئے ہیں" پھر حضرت ابو موسیٰؓ نے سارے مجمع کے سامنے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو معزول کیا تھا، اور حضرت عمروؓ نے اسی مجمع کے سامنے یہ کہا کہ "انھوں نے اپنے آدمی علیؓ کو معزول کیا ہے" اس کا مطلب یہ تھا کہ ابو موسیٰؓ نے صرف علیؓ کو معزول کیا ہے، اور یہ وہ غلط بیانی ہوتی جس سے سارا مجمع آگاہ تھا، اور حضرت عمروؓ کا "فریب" تمام لوگوں پر آشکارا ہوگیا ہوتا، اور اس واقعہ کے بعد قطری طور پر کوئی بھی حضرت عمروؓ پر اعتماد کرنے کو تیار نہ ہوتا۔ اور وہ گوشۂ گمنامی میں زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور ہوتے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت معاویہؓ کے حکم سے حضرت عمروؓ بن العاص اہل خربتی کی مدد کے لئے مصر گئے تو مصر کے لوگوں نے محمد بن ابی بکرؓ کے مقابلہ میں جو حضرت علیؓ کی طرف سے مصر کے عامل مقرر تھے، حضرت عمروؓ ہی کے ساتھ تعاون کیا، اور حضرت عمروؓ نے آسانی کے ساتھ مصر پر قبضہ کر لیا۔ پھر حضرت معاویہؓ نے ان ہی کو مصر کا عامل مقرر کر دیا اور آخری سانس تک وہ مصر ہی میں رہے، اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ فاروق اعظمؓ کے دور خلافت میں حضرت عمروؓ بن العاص ہی کی قیادت میں مصر فتح ہوا تھا اور فتح کے بعد فاروق اعظمؓ نے ان کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا تھا، کافی طویل عرصہ تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے، اور وہاں کے لوگوں سے ان کے گہرے مراسم قائم ہوگئے تھے، پھر حضرت عثمان غنیؓ نے ان کو مصر کی گورنری سے معزول

کردیا تھا، اب پھر حضرت معاویہؓ نے ان کو اسی عہدہ پر بحال کردیا، تو نہ مصر کیلئے یہ نئے تھے، نہ ہی مصر کے لوگ ان کے لئے نئے، چنانچہ پورے اعزاز و اکرام کیساتھ آخر عمر تک یہ مصر ہی میں رہے، اور وہیں وفات بھی ہوئی ۳۸ھ میں دوبارہ انکی مصر میں تقرری ہوئی اور کم از کم ۴۳ھ میں وفات ہوئی، اس طرح کم سے کم چھ سال یہ مصر میں رہے، مصر باوجودیکہ سبائی تحریک کا سب سے بڑا مرکز رہا تھا، مگر حضرت عمروؓ بن العاص پر یہ اعتراض کسی طرف سے نہیں اٹھایا گیا کہ "آپ نے ثالثی کے فیصلہ کے سلسلہ میں بدعہدی یا فریب سے کام لیا ہے"۔

کیا یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے کہ حضرت عمروؓ بن العاص پر فیصلہ کے سلسلہ میں لگایا جانیوالا الزام سراسر غلط ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ثالثوں کی ہی کوششوں سے عالم اسلام کو ایک زبردست کشمکش اور روحانی عذاب سے نجات ملی تھی، اور خانہ جنگی و خلفشار کا ماحول ختم ہوگیا تھا۔

اور حضرت عمروؓ بن العاص کا یہی وہ کارنامہ تھا جس نے سبائیوں کی تمام محنتوں، اور ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اس لئے انھوں نے اپنے "آخری ہتھکنڈے" کو استعمال کرتے ہوئے حضرت عمروؓ بن العاص کے خلاف کردار کشی کی مہم چلادی۔ افسوس یہ ہے کہ ابو مخنف کے بیانات کو طبری کے صفحات میں دیکھکر بلاتحقیق اسے نقل کرنے والوں نے سبائیوں کے ہاتھ اتنے مضبوط کردئے کہ آج امت کا ایک اچھا خاصہ طبقہ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے معتمد صحابی حضرت عمروؓ بن العاص کی طرف سے سوءِ ظنی کا شکار ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ

وارنا الباطل باطلا وارزقنا

اجتنابہ

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ان جلیل القدر اور ممتاز اصحاب رسولؐ میں سے ہیں، جن کی ذات پر اسلامی تاریخ کو بجا طور پر ناز ہونا چاہیئے تھا لیکن ہماری بدقسمتی، بلکہ بے تدبیری وسہولت پسندی نے ہماری تاریخ کو جن صدموں سے دوچار کیا، ان میں سے ایک بڑا صدمہ یہ بھی ہے کہ اسلامی تاریخ کے نام سے جو سرمایہ ہم معتبر بنا کر پیش کرتے ہیں ان میں غیروں کا شامل کیا ہوا وہ حصہ بھی ہوتا ہے جو ہمارے اسلاف کی فضیحتوں اور ان کی رسوائی کی داستانوں کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ بات کہ ایک طرف تو خدا کی آخری و سچی کتاب قرآن مجید اور خدا کے آخری پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات کی روشنی میں مسلمانوں کا یہ متفقہ عقیدہ ہو کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت ایمان وعمل کے اعتبار سے قیامت تک آنے والے بعد کے تمام مسلمانوں کے لئے رہنما ومقتدیٰ ہے، اور دوسری طرف پھر اسی مقدس جماعت کے افراد کے سلسلہ میں ان تاریخی داستانوں، کو بھی مسلمانوں ہی کی طرف سے "صداقت" کی سند دیدی جائے جن کے ذریعہ صحابۂ کرامؓ اعلیٰ درجہ کے مسلمان کیا معنی، نہایت ہی پست کردار کے لالچی، خودغرض بلکہ منافق تک گردانے جاسکیں؟ قرآن وحدیث کی شہادت کو سچا تسلیم کرلینے کے بعد کیا کسی مسلمان کے لئے اس بات کی گنجائش باقی رہ جاتی

ہے کہ وہ کسی صحابیؓ رسولؐ کے بارے میں ایسے کسی بیان کو تسلیم کرے، جس کے ذریعہ خدا اور رسول کی گواہی مجروح ہوتی ہو؟

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا شمار اسلام کی ان شخصیات میں ہے جن کی ذات سے منسوب صرف ایک مشورہ، کو نظر انداز کرکے ان کی پوری زندگی پر نگاہ ڈالی جائے، تو ان کی اخلاص وللہیت، اور ان کی انتظامی و حربی صلاحیتوں سے ان کا بدترین دشمن بھی انکار نہیں کرسکتا، حضرت مغیرہؓ کی پوری زندگی اسلام کی خدمت میں گذری، وہ غزوۂ حدیبیہ میں شامل ہوئے، اور یہ وہ غزوہ ہے جس میں شامل ہونیوالوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے راضی ہونے کا اعلان اپنی کتاب قرآن مجید میں کر دیا ہے[1]، انھوں نے جنگ قادسیہ میں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے کسریٰ سے لوہا لیا، وہ خلفائے راشدینؓ کے دور میں مختلف صوبوں کے عامل رہے اور اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، اور انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سو سے زائد احادیث روایت کیں۔ یہ وہ فضیلتیں ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، پھر کسی ایک واقعہ کو اس کے "غلط پس منظر" میں رکھ کر ایک ایسی جلیل القدر شخصیت کو مطعون کرنا کہاں کا انصاف ہوسکتا ہے؟

حضرت مغیرہؓ پر کئے جانے والے طعن، اور اس کی حقیقت جاننے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان کی مجموعی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

حیات و خدمات

مغیرہ بن شعبہؓ بن ابی عامر، ان کی دو کنیتیں ہیں، ابو عیسیٰ اور ابو عبداللہ، ان کا خود بیان ہے کہ ان کی کنیت ابو عیسیٰ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اور ابو عبداللہ

---

[1] پارہ ۲۶ آیۃ لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ الخ

حضرت عمر فاروقؓ نے رکھی تھی۔

غزوۂ خندق کے سال اسلام قبول کیا، اور صلح حدیبیہ، جنگ یمامہ، فتوحِ شام، جنگ یرموک، جنگ قادسیہ، فتح نہاوند اور فتح ہمدان وغیرہ میں شرکت کی، جنگ یرموک کے موقع پر ان کی ایک آنکھ راہ خدا میں کام آگئی تھی، صلح حدیبیہ کے موقع پر مشرکین مکہ کے نمائندہ عروہ بن مسعود سے انھوں نے زبردست بحث ومباحثہ کیا تھا، جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے، امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ دُہاۃِ عرب (یعنی ہوشیار اور صاحب رائے وتدبیر اہل عرب) چار شخص تھے، حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، اور حضرت زیادؓ، حضرت معاویہؓ حلم وتدبر کی وجہ سے، حضرت عمروؓ بن العاص دشوار کاموں کو انجام دینے کی صلاحیت کی وجہ سے، حضرت مغیرہ حاضر جوابی کی وجہ سے، اور حضرت زیاد، ہر چھوٹے بڑے کام کی لیاقت کی وجہ سے، حضرت عمرؓ فاروق نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو پہلے بصرہ کا، پھر کوفہ کا حاکم مقرر کیا، اور حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت یہ کوفہ ہی کے حاکم تھے، حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں بھی کچھ دن یہ کوفہ کے حاکم رہے، بعد میں حضرت عثمانؓ نے ان کو معزول کردیا، پھر حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں دوبارہ کوفہ کے حاکم مقرر ہوئے، اور پھر تادمِ وفات اسی منصب پر فائز رہے، حضرت مغیرہؓ اسلام میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے بصرہ کا دفتر مرتب کیا، انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے احادیث بھی روایت کیں، صحابۂ کرام میں ان سے روایت کرنیوالوں میں حضرت ابوامامہ باہلیؓ، حضرت مسور بن مخرمہؓ، اور حضرت قرہ مزنی بھی ہیں، اور تابعین میں ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بیٹے عروہ، اور حمزہ، اور عفار، اور ان کے پوتے وراد، اور مسروق، اور قیس بن ابی حازم، اور ابووائل وغیرہم ہیں، حضرت مغیرہؓ

کی وفات ۵۰ھ میں کوفہ میں ہوئی، اور ان کی وفات کے بعد مصقلہ بن ہبیرہ شیبانی نے ان کی قبر پر کھڑے ہو کر ان کی منقبت میں اشعار پڑھے۔[۱]

نصب و عزل کی وجہ

جیساکہ پچھلی سطور میں گذرا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت مغیرہؓ کو پہلے بصرہ کا گورنر مقرر کیا، اس کے بعد وہاں سے معزول کرکے کوفہ کا گورنر مقرر کیا، پھر حضرت عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت کی ابتدا ہی میں انکو کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا، جہاں تک بصرہ کی گورنری سے معزولی کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں اہل بصرہ کی طرف سے ان پر زنا کی تہمت لگائی گئی تھی، اور اسی بنیاد پر حضرت عمرؓ نے ان کو معزول کیا تھا، اسی طرح کوفہ کی گورنری سے اگرچہ حضرت عثمان غنیؓ نے معزول کیا تھا لیکن طبری کے بیان کے مطابق اس کی بھی حضرت عمرؓ ہی نے وصیت کی تھی[۲] گویا حضرت مغیرہؓ کی بصرہ اور کوفہ دونوں جگہوں کی گورنری سے معزولی حضرت عمرؓ ہی کے حکم سے ہوئی تھی، اور اس بات کو بنیاد بنا کر "بعض دانشوروں" کا یہ کہنا ہے کہ حضرت مغیرہؓ پر حضرت عمرؓ کو اعتماد نہ تھا،

جہاں تک اس "استدلال" کی معقولیت کا معاملہ ہے، تو یہ اسی سے ظاہر ہے کہ باوجود اس کے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت مغیرہؓ کو بصرہ کی گورنری سے "زنا کی شکایت" پر معزول کیا تھا، لیکن اس کے بعد پھر ان کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا، اور کوفہ کا گورنر مقرر کرتے وقت حضرت عمرؓ نے بطور خاص انھیں آگاہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "تم کو یاد ہے کہ بصرہ میں تم پر کیسی تہمت لگائی گئی تھی" مطلب یہ تھا کہ

---

[۱] ترجمہ اسد الغابہ لابن الاثیر جلد ۴ ص ۴۰۱ (ملخصاً) [۲] تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی جلد ۱ ص ۲۷۰۔

بصرہ اور کوفہ کے لوگ بڑے سازشی اور شورہ پشت ہیں، بصرہ میں تم کو ان سے سابقہ پیش آچکا ہے، اب تم کوفہ جا رہے ہو تو ذرا وہاں کے لوگوں سے ہوشیار ہو کر رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی کسی سازش میں پھنس جاؤ۔[1]

حضرت عمرؓ کا بصرہ کی گورنری سے معزول کرنے کے بعد، پھر حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کا گورنر مقرر کرنا، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انھوں نے اہل بصرہ کی سازش پکڑلی تھی، اور انھیں قطعی طور پر اس بات کا یقین تھا کہ حضرت مغیرہؓ پر لگایا جانے والا الزام قطعی غلط ہے، لیکن انتظامی مصلحت کے پیش نظر انھوں نے اس وقت ان کو بصرہ سے ہٹا لینا ہی مناسب سمجھا، کیونکہ بصرہ کے لوگوں کی فتنہ جوئی اور شورہ پشتی سے حضرت عمرؓ بخوبی واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حضرت مغیرہؓ کو ہٹانے کے بعد ان کی جگہ جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کا گورنر مقرر فرمانے کا فیصلہ کیا تو ان کو مخاطب کر کے فرمایا،

انی ارید ان ابعثک الی بلد قد عشش فیہ الشیطان۔	ابوموسیٰ! تم کو ایک ایسے شہر میں (گورنر بنا کر) بھیجنا چاہتا ہوں جہاں شیطان نے گھونسلہ بنا لیا ہے۔

یہ سنکر ابوموسیٰؓ چوکنے ہو گئے اور بولے، تو حضرت! میرے ساتھ کچھ مددگار بھی کر دیجئے، حضرت عمرؓ نے اس کو منظور فرمایا، اور کچھ مددگار ہمراہ کر دیئے۔[2]

رہ گیا حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں کوفہ کی گورنری سے حضرت مغیرہؓ کی معزولی کا معاملہ، تو اولاً یہ کہ حضرت عمرؓ کی وصیت کا ذکر طبری ہی نے کیا ہے، جو ایک ناقابل فہم بات ہے، کیونکہ اگر حضرت عمرؓ کی رائے میں حضرت مغیرہؓ کو

---

[1] عثمان ذوالنورین ص ۱۹۷ [2] عثمان ذوالنورین ص ۱۹۷ بحوالہ فتوح البلدان ص ۳۴۴

کوفہ کی گورنری سے معزول کرنا ضروری ہوتا تو وہ خود ہی ایسا کر گذرتے، کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ خود تو تاحیات ان کو ان کے اس منصب پر باقی رکھتے اور اپنے بعد آنے والے پیشوا و امام کے لئے وصیت کر جاتے کہ تم مغیرہؓ کو بصرہ کی گورنری سے معزول کر دینا، پھر بعد والے خلیفہ پر اس وصیت کو پورا کرنے کی کوئی ذمہ داری بھی نہ تھی کیونکہ گورنروں کا عزل و نصب خالص انتظامی مسئلہ ہوتا ہے اور اس کا دارو مدار حکمراں کی صوابدید اور اس کے اعتماد پر ہوتا ہے، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ معزولی کسی الزام یا نااہلی ہی کی وجہ سے ہو، بلکہ بسا اوقات دیگر خارجی مصالح کی بنا پر بھی معزولی ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو گورنری سے اور حضرت خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالاری سے معزول کیا تھا، لیکن اس بات کی وضاحت فرمادی تھی کہ ان لوگوں کو کسی الزام یا ان کی نااہلی کی وجہ سے نہیں معزول کیا جارہا ہے، بلکہ بتقاضائے مصلحت ان کو معزول کیا جارہا ہے، پھر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ ہی کی طرح حضرت عثمانؓ نے بھی کسی ملکی و انتظامی مصلحت کے پیش نظر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا ہو؟ اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کی گورنری سے حضرت عمرؓ کی وصیت کے مطابق معزول کیا تھا، تو بھی اس سے حضرت مغیرہؓ کے کردار پر کوئی حرف نہیں آتا، اور اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ کو حضرت مغیرہؓ پر اعتماد نہیں تھا، کیونکہ ان کے اعتماد کی سب سے واضح دلیل یہی ہے کہ کوفہ جیسے اہم اور سخت ترین مقام کے گورنر کی حیثیت سے انھوں نے حضرت مغیرہؓ کو اپنی زندگی کی آخری سانس تک قائم رکھا، علاوہ ازیں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں ہی کے حضرت مغیرہؓ پر اعتماد، اور ان کی رائے و تدبیر کی اہمیت تسلیم کرنے پر متعدد شواہد ہیں، منجملہ ان میں کے حضرت عمرؓ کا قادسیہ جیسی مہتم بالشان جنگ

میں حضرت مغیرہؓ کو شریک کرنا، اور پھر حضرت مغیرہؓ کی رستم کی طرف سفارت اور انتہائی جرأت مندانہ گفتگو، اور حضرت عثمانؓ کا باغیوں کے فتنہ اور اپنی محصوری کے زمانہ میں حضرت مغیرہؓ سے مشورہ کرنا اور ان کا انتہائی اخلاص کے ساتھ حضرت عثمانؓ کو مکہ یا یا شام جانے، یا باغیوں پر فوجی یورش کرنے کا مشورہ دینا وغیرہ، یہ وہ مثالیں ہیں جو فریقین کے باہمی اعتماد پر شاہد عدل ہیں۔

حضرت مغیرہؓ اور یزید کی ولیعہدی

حضرت مغیرہؓ کا وہ "ایک کام" جسے بنیاد بنا کر ان پر خود غرضی، مفاد پرستی، اور چاپلوسی ہی نہیں، بلکہ نعوذ باللہ منافقت تک کے الزام عائد کئے جاتے ہیں، وہ ان کا حضرت معاویہؓ کو یزید کے ولی عہد مقرر کرنے کا مشورہ دینا ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ چونکہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کی گورنری سے معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لئے حضرت مغیرہؓ نے یہ "چال" چلی کہ حضرت معاویہؓ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اپنے بعد خلافت کے لئے اپنے فرزند یزید کو اپنا ولیعہد مقرر کر دیجئے، جب حضرت معاویہؓ نے یہ سنا تو خوش ہو کر بولے، کہ یہ کام انجام کیسے پائے گا، اور لوگ یزید کی ولیعہدی کو قبول کیسے کریں گے؟ تو حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا کہ کوفہ کا معاملہ میں دیکھ لونگا، اور بصرہ کو زیاد دیکھ لیں گے، اس کے بعد پھر اسی منصوبہ کے مطابق یزید کو ولیعہد مقرر کر دیا گیا، اس تقرری کے سلسلہ میں جو جو "کارروائیاں" بیان کی جاتی ہیں ان کی تفصیل بھی آگے آرہی ہے، اور یہ سب کچھ حضرت مغیرہؓ کے "مفاد طلبی" کے جذبہ کی وجہ سے ہوا، جس کے ذریعہ وہ کوفہ کی گورنری کو بچالے گئے۔

دراصل اس "کہانی" کو صرف ابن الاثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں بیان کیا ہے جسکو نوک پلک سنوار کر، ایک مشہور "ناقد اصحابؓ مفکر" نے اپنے الفاظ میں

ابن الاثیر کے حوالہ سے یوں نقل کیا ہے۔

"اس تجویز یعنی یزید کی ولیعہدی کی تجویز کی ابتدا حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کیطرف سے ہوئی، حضرت معاویہؓ انھیں کوفہ کی گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، انھیں اس کی خبر مل گئی، فوراً کوفہ سے دمشق پہونچے، اور یزید سے مل کر کہا کہ صحابہؓ کے اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر المومنین تمہارے لئے بیعت لینے میں تامل کیوں کر رہے ہیں" یزید نے اس بات کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا، انھوں نے حضرت مغیرہ کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا بات ہے جو تم نے یزید سے کہی، حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا" امیر المومنین آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمانؓ کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے، اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولیعہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف برپا نہ ہو" حضرت معاویہؓ نے پوچھا" اس کام کو پورا کرنے کی ذمہ داری کون لے گا؟" انھوں نے کہا" اہل کوفہ کو میں سنبھال لوں گا، اور اہل بصرہ کو زیاد، اس کے بعد پھر اور کوئی مخالفت کرنیوالا نہیں ہے"، یہ بات کر کے حضرت مغیرہ کوفہ آئے، اور دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دیکر اس بات پر راضی کیا کہ ایک وفد کی صورت میں حضرت معاویہؓ کے پاس جائیں، اور یزید کی ولیعہدی کے لئے ان سے کہیں، یہ وفد حضرت مغیرہؓ کے بیٹے موسیٰ بن مغیرہ کی سرکردگی میں دمشق گیا، اور اس نے اپنا کام پورا کر دیا، بعد میں حضرت معاویہؓ نے موسیٰ کو الگ بلا کر پوچھا، تمہارے باپ نے ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دین خریدا ہے؟" انھوں

نے کہا ۳۰ ہزار درہم میں، حضرت معاویہؓ نے کہا، تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے ،، ۔ ؎۱

پھر آگے موصوف اس پوری ،، کارروائی ،، پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

،، اس روداد سے دو باتیں بالکل واضح ہیں، ایک یہ کہ یزید کی ولیعہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کرکے اس تجویز کو جنم دیا، اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں، دوسرے یہ کہ یزید بجائے خود اس مرتبے کا آدمی نہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا کہ حضرت معاویہؓ کے بعد امت کی سربراہی کے لئے وہ موزوں ترین آدمی ہے ،، ۔ ؎۲

ابن الاثیر کی روایت اور ،، مفکر اسلام ،، کی اس ترجمانی و تبصرہ کے تجزیہ سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ یزید کی ولی عہدی کی تجویز سب سے پہلے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے پیش ہوئی۔

۲۔ حضرت مغیرہؓ نے یہ تجویز سب سے پہلے یزید کے سامنے رکھی، پھر یزید نے اپنے والد ماجد حضرت معاویہؓ سے اس کا ذکر کیا، اور جب حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ سے اس سلسلہ میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ آپ حضرت

؎۱ خلافت و ملوکیت ص ۱۴۹۔۱۴۸، بحوالہ ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۴۹ ؎۲ خلافت و ملوکیت ص ۱۵۰

عثمانؓ کے قتل کے بعد رونما ہونے والے اختلافات دیکھ ہی چکے ہیں، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنا ولیعہد مقرر کر کے خود ہی اس کی بیعت لے لیں تاکہ بعد میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔

۳۔ حضرت معاویہؓ کے اس استفسار پر کہ اس کام کو پورا کرنے کی ذمہ داری کون لے گا؟ حضرت مغیرہؓ نے خود اپنے کو کوفہ سنبھالنے کا اور زیاد کو بصرہ سنبھالنے کا ذمہ دار قرار دیا، اور پھر خود کوفہ کے دس آدمیوں کو ۳۰ ہزار روپے دکل تیس ہزار روپے) رشوت دیکر اپنے بیٹے موسیٰ کی سرکردگی میں دمشق روانہ کیا کہ یہ سب لوگ حضرت معاویہؓ کے پاس ایک وفد کی شکل میں جا کر ان سے یزید کی ولیعہدی کی بات کریں۔

۴۔ حضرت معاویہؓ سمجھ گئے کہ یہ وفد خود سے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے ارکان حضرت مغیرہؓ کے خریدے ہوئے ہیں، چنانچہ انھوں نے حضرت مغیرہؓ کے بیٹے موسیٰ سے یہ دریافت کیا کہ "تمہارے باپ نے ان لوگوں کا دین کتنے میں خریدا؟" اور جب ان کو یہ علم ہوا کہ ان لوگوں نے اپنا دین صرف تین تین ہزار میں فروخت کر دیا ہے، تو حضرت معاویہؓ نے کہا کہ "تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے"۔

۵۔ نہ حضرت مغیرہؓ نے یزید کی ولیعہدی کی تجویز صحیح جذبے اور خلوص کے ساتھ پیش کی، نہ ہی حضرت معاویہؓ اس تجویز کو قبول کر کے اسے بروئے عمل لانے میں مخلص تھے، بلکہ یہ ان "دونوں بزرگوں" کا اپنے اپنے ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لئے ایک "گٹھ جوڑ" تھا، اور دونوں میں سے کسی کو اس بات کا خوف نہ ہوا کہ وہ اپنے مفاد کے حصول کیلئے امت محمدیہ کو کتنے غلط راستے پر ڈال رہے ہیں اور خدا کو کیا منہ دکھائیں گے؟۔

۶۔ یہ دونوں بزرگ، اپنا اپنا ذاتی مفاد حاصل کرنے میں اس طرح کامیاب ہوگئے کہ حضرت مغیرہؓ کوفہ کی گورنری پر برقرار رہے، اور حضرت معاویہؓ کا نالائق وناہل بیٹا جس کی نااہلی وناموزونی کا حال خود حضرت معاویہؓ کو بھی اچھی طرح معلوم تھا، خلافت کا ولیعہد مقرر ہوگیا۔

اب مسلمان خود ہی اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر اس بات کا فیصلہ کریں کہ کیا علامہ ابن الاثیر کی یہ روایت، اور ایک دوسرے علامہ، کی یہ ترجمانی وتبصرہ صحیح قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا مفاد پرست، خودغرض، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سازش کرنے والا، اور انجامِ آخرت سے بے نیاز ہونا ثابت ہو رہا ہے، اور دوسرے صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا عہدہ کا لالچی ہونا، دھوکہ باز، اور رشوت دیکر مسلمانوں کے دین وایمان سے کھیلنے والا ہونا ثابت ہو رہا ہے؟ اور کیا کسی مسلمان ہی نہیں، بلکہ برخود غلط قسم کے کسی "مفکر اسلام" کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے سچے رسول کی پسندیدہ جماعت کے افراد یعنی دو جلیل القدر صحابیوں پر یہ پھبتی کسے کہ

> "یزید کی ولیعہدی کیلئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ "ایک بزرگ" نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے "دوسرے بزرگ" کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا"؟۔

حقیقت کیا ہے؟

یزید کی ولی عہدی کے سلسلہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے کردار، اور ابن الاثیر کی مذکورہ بالا روایت پر تبصرہ سے پہلے تمہیدی طور پر دو اہم باتوں کا ذہن میں رہنا ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ اس بات سے حضرت معاویہؓ کا بدترین دشمن بھی انکار نہیں کرسکتا کہ جس وقت حضرت حسنؓ سے مصالحت کے بعد حضرت معاویہؓ نے زمام خلافت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ "سبائی تحریک" کو بڑی عظیم الشان کامیابیاں مل چکی تھیں، یکے بعد دیگرے دو خلیفۂ راشد یعنی حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ مرتضیٰ کی شہادت ہوچکی تھی، مسلمان باقاعدہ دو متحارب گروہوں میں تقسیم ہوچکے تھے، اور جنگ جمل، وجنگ صفین، دو موقعوں پر ان کی تلواریں آپس ہی میں ایک دوسرے کے خلاف اٹھ چکی تھیں، حضرت حسنؓ نے اگرچہ "سبائی فتنہ" کا سدِّ باب کرنے کیلئے بے مثل ایثار وضبط نفس سے کام لے کر مصالحت کرکے خلافت کی باگ ڈور، حضرت معاویہؓ کو سونپ دی تھی، لیکن دم توڑتی ہوئی سبائیت نے حضرت حسنؓ کو رسوا کرنے کی مہم چلا رکھی تھی، مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان کم وبیش گذشتہ دس برسوں سے عجیب قسم کے ذہنی کرب دبے چینی کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے، ایسے مشکل حالات میں حضرت معاویہؓ نے جب زمام خلافت اپنے ہاتھ میں لی، تو اپنی خداداد صلاحیتوں، بے پناہ حلم و تدبر، اور انتہائی مخلصانہ کوششوں کے ذریعہ پوری ملت اسلامیہ کو ایک مرتبہ پھر اتحاد و یکجہتی کے راستے پر لگادیا، اور مسلمان اپنے پچھلے اختلافات کو فراموش کرکے اپنے بنیادی مقصد کے حصول کے لئے ایک بار پھر "بنیان مرصوص" کی صورت ہوگئے۔

یہ بالکل فطری بات ہے کہ جس شخص نے برسہا برس کی محنت، اور مدبّرانہ حکمت عملی کے ذریعہ "اتحاد ملت" کا اہم فریضہ انجام دیا، اسے اس بات کی بھی فکر تھی کہ اس اتحاد کو اس کے بعد بھی کوئی نقصان نہ پہنچے، اور سیاست واقتدار کے جس اختلاف نے مسلمانوں میں اختلاف وانتشار پیدا کیا تھا

وہ اختلاف دوبارہ نہ برپا ہونے پائے۔ لہذا حضرت معاویہؓ کی یہ رائے ہوئی کہ وہ اپنے بعد خلافت کے لئے کسی کو نامزد کر جائیں تاکہ اس سلسلہ میں کوئی نزاع نہ ہو۔

دوم یہ کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی شخصیت، یزید کی ولیعہدی کی تحریک سے پہلے غیر متعارف نہ تھی، وہ عرب کے چار نامور ترین دانشوروں میں سے ایک تھے، اور ان کی رائے وتدبیر کی اہمیت عہد رسالت ہی سے تسلیم شدہ تھی۔ حضرت مغیرہؓ کے مشوروں سے حضرت فاروق اعظمؓ جیسے مدبر حکمراں نے استفادہ کیا تھا، نیز ان پر عہدہ ومنصب کے حریص ہونے، یا حکمرانوں کی بے جا خوشامد وچاپلوسی کا الزام کبھی عائد نہیں ہوا تھا۔

مندرجہ بالا دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر ابن الاثیر کی اس "خیال آرائی" پر غور کیجئے کہ "چونکہ حضرت معاویہؓ نے کوفہ کی گورنری سے حضرت مغیرہؓ کو معزول کرنے کا ارادہ کرلیا تھا، اس لئے انھوں نے یزید کی ولیعہدی کی تحریک کردی جس کے نتیجہ میں حضرت معاویہؓ نے ان کو معزول کرنے کا ارادہ ترک کردیا، اور پھر "دونوں بزرگوں" نے مل کر ہر قسم کی بدعنوانیاں کر کے یزید کو ولی عہد مقرر کردیا؟ واقعہ یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی میں نہ تو "دونوں بزرگوں" کے ذاتی مفاد کا معاملہ تھا نہ ہی اس میں کسی بدعنوانی کو دخل تھا، کیونکہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی، تو حضرت معاویہؓ حق تعالیٰ کو مخاطب کر کے یہ دعا کرنے کی ہمت نہ کرپاتے۔

اللھم ان کنت تعلم انی ولیتہ	اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یزید کو
لانہ فیما اراہ اھل	اس لئے ولیعہد بنایا ہے کہ وہ میرے خیال
لذالک فاتمم لہٗ	میں اس کا اہل ہے تو اس ولایت کو اس
ما ولیتہ وان کنت ولیتہ	کے لئے پورا فرما دے، اور اگر میں نے اسکو
لانی احبہ فلا تتمم	اس لئے ولیعہد بنایا ہے کہ میں اس سے

لہ ما ولیتہ — محبت کرتا ہوں (اس کے اندر اس کے
(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۰) — اہلیت نہیں ہے) تو اسکی ولایت کو پورا فرما۔

حضرت مغیرہؓ نے یزید کی ولیعہدی کی تحریک کیوں کی؟ اس کا واضح جواب یہی ہیکہ ان کی ایماندارانہ اور مخلصانہ رائے یہی تھی کہ حضرت معاویہ کے بعد زمام حکومت یزید کے ہاتھ میں آنے سے کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ وہ یزید کو حکومت کا اہل بھی سمجھتے تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ یزید کے علاوہ کسی دوسرے کی ولیعہدی پر بنو امیہ متفق نہیں ہوسکتے، اور اتفاق نہ رہنے کی صورت میں جو بھیانک نتیجے ہوتے، ان کا تجربہ حضرت مغیرہؓ کو ہو ہی چکا تھا، لہٰذا اُمت کی خیر خواہی اور مفاد میں انھوں نے ایک ایسا مشورہ دیا، جس کے ذریعہ ان کے اپنے خیال میں اس اتحاد کے ٹوٹنے کا خطرہ نہیں تھا جو بڑی مشکلوں سے قائم ہوسکا تھا، رہ گیا یہ خیال، کہ حضرت مغیرہؓ نے یہ مشورہ محض اس لئے دیا تھا کہ حضرت معاویہؓ ان کو کوفہ کی گورنری سے معزول نہ کریں، تو قطع نظر اس کے کہ ایک جلیل القدر صحابی رسول کے کردار کے یہ منافی ہے، یوں بھی سوچنا چاہئیے کہ اس وقت حضرت مغیرہؓ کافی ضعیف العمر ہو چکے تھے، اور عمر طبعی کو پہنچ کر بس کسی دم بھی موت کے منتظر تھے، اس مرحلہ میں گرے سے گرا مسلمان بھی حتی المقدور اپنے خدا کی ناراضی کے کاموں سے گریز کرنے لگتا ہے، پھر کیا حضرت مغیرہؓ اتنے بڑے دنیادار، عہدہ و منصب کے حریص، اور آخرت کی جوابدہی سے بے پرواہ شخص تھے کہ چند روزہ دنیاوی زندگی کے ایک عہدہ کی خاطر جس کے "لذتوں سے وہ بہرہ اندوز بھی ہو چکے تھے، اپنی آخرت برباد کرنے، اور اپنی پوری زندگی کے "شاندار ریکارڈ" کو ملیا میٹ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے؟ پناہ بخدا!۔

پھر حافظ ابن کثیرؒ نے ابن جریر طبریؒ سے نقل کرتے ہوئے اسی واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

"حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اپنے ضعف و کبرسنی کی بنا پر کوفہ کی امارت سے استعفیٰ دیدیا، حضرت معاویہؓ نے استعفا منظور کرکے ان کی جگہ پر سعید بن العاص کو مقرر کرنے کا ارادہ کرلیا، مغیرہ کو اس کا علم ہوا تو انھیں اپنے فعل پر ندامت ہوئی، وہ یزید کے پاس آئے، اور اس کو اس کا مشورہ دیا کہ وہ اپنے والد کو اپنے ولی عہد بنانے پر آمادہ کرے، یزید نے ایسا ہی کیا........ [1]

طبری اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق حضرت مغیرہؓ نے کوفہ کی گورنری سے اپنی کبرسنی اور بڑھاپے کے عذر کی بنا پر خود ہی استعفا دیا تھا جسے حضرت معاویہؓ نے منظور کرلیا تھا، اس کے بعد پھر حضرت مغیرہؓ نے یزید سے ملاقات کرکے اسے اس بات کیطرف متوجہ کیا کہ تم اپنے والد ماجد سے کہو کہ وہ تمہیں اپنا ولی عہد مقرر کریں، پھر آگے اس روایت میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مغیرہؓ کو بلا کر ان سے بات کی، اور انھیں پھر سے کوفہ کی گورنری پر بحال کردیا، لیکن اس روایت سے یہ بات صاف ہوگئی کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو اپنی طرف سے معزول کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا، بلکہ خود حضرت مغیرہؓ ہی نے استعفیٰ دے دیا تھا، پھر اس الزام میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے اپنی گورنری بچانے کی خاطر یزید کی ولیعہدی کی تحریک کی تھی؟ البتہ ابن الاثیر کی بے سند روایت میں یہی بات ہے اس لئے اس کا تحلیل و تجزیہ ضروری ہے۔

---

[1] البدایۃ ج ۸ ص ۷۹، الطبری ج ۵ ص ۳۰۱-۲۔

الکامل کی غیر معتبر روایت

ابن الاثیرؒ نے اپنی تاریخ الکامل میں ولی عہدی یزید کے واقعہ کو جس انداز میں روایت کیا ہے، اور پھر اسی روایت کو بنیاد بنا کر ماضی قریب کے ایک "مفکر اسلام" نے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو جلیل القدر صحابیوں ہی کو مطعون نہیں کیا، بلکہ قرآن وحدیث کی شہادت کے خلاف انکو بالواسطہ طور پر "منافق" تک گردانا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے۔

ا۔ الکامل کی یہ روایت بلاسند ہے، گویا ابن الاثیر خود اس واقعہ کے عینی گواہ تھے، جبکہ حقیقت یہ ہیکہ ابن الاثیرؒ کی وفات ۶۳۰ھ میں ہوئی ہے اور ان کا شمار ساتویں صدی ہجری کے علماء میں ہوتا ہے، اس لئے ان کی کوئی روایت اس وقت تک قابل استناد نہیں ہوسکتی جب تک اس کی سند نہ معلوم ہو۔ خصوصًا ایسی صورت میں جبکہ ان کی اس روایت سے صحابۂ کرامؓ کا کردار مجروح ہو رہا ہو۔

۲۔ ابن الاثیرؒ کی اس روایت میں اندرونی طور پر کافی ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے اس کا جعلی اور بے اصل ہونا واضح ہوجاتا ہے، مثلاً

الف: ابن الاثیرؒ کے بیان کے مطابق حضرت مغیرہؓ نے ولی عہدی کی تحریک اس وقت کی جب حضرت معاویہؓ نے ان کو کوفہ کی گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ کیا جبکہ طبری اور ابن کثیرؒ کی ان روایات سے جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ کو معزول ہی نہیں کیا گیا، بلکہ اپنے ضعف اور کبر سنی کی بنا پر انھوں نے خود ہی گورنری سے استعفیٰ دیدیا تھا۔

ب: ابن الاثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت مغیرہؓ سب سے پہلے یزید کے پاس پہونچے اور

اس سے کہا، صحابہؓ کے اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ... لہ ... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر المومنین تمہارے لئے بیعت لینے میں تامل کیوں کر رہے ہیں،، بھلا کون اس بات کا اعتبار کریگا کہ حضرت مغیرہؓ نے یزید سے "صحابہؓ کے اکابر اور قریش کے بڑے لوگوں کے دنیا سے رخصت ہونے" اور یزید کے سب سے اہم اور موزوں ترین آدمی ہونے کی بات اس وقت کہی ہو گی جبکہ صحابۂ کرام ہی میں سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت سعید بن العاصؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ایوبؓ انصاری، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت حسینؓ بن علیؓ، اور ان کے علاوہ

لہ ابن الاثیر کے حوالے سے "خلافت وملوکیت،، میں جو روایت نقل کی گئی ہے، اسمیں یہ عبارت اسی طرح مسلسل ہے، حالانکہ "خلافت وملوکیت" کے مصنف نے ابن الاثیر کی روایت نقل کرنے میں خیانت کرتے ہوئے اپنی پوری فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے اور ترجمہ میں جگہ جگہ کی عبارتیں چھوڑ دی ہیں، چنانچہ درمیان کے اس حصہ میں جہاں نقطے رکھ دیئے گئے ہیں، ایک لمبی عبارت موجود تھی جس میں حضرت مغیرہؓ کی زبان سے یزید کے لئے یہ کہلوایا گیا ہے کہ "اب آپ سے افضل اور بہتر رائے والا، نیز سیاست و سنت کا ماہر عالم اس دنیا میں کوئی موجود نہیں ہے،، مگر اس مقام سے اس عبارت کا، یا اسی طرح ابن الاثیر کی دوسری عبارتوں کا ترجمہ "خلافت وملوکیت،، کے مصنف نے صرف اس لئے چھوڑ دیا اور درمیانی عبارتوں کو حذف کر کے ایک "مسلسل روایت" اس لئے بنایا کہ ان عبارتوں کے سامنے آتے ہی روایت کا جعلی ہونا معلوم ہو جاتا، کیونکہ نہ حضرت مغیرہؓ ایسی خلاف واقعہ باتیں کہہ سکتے تھے، نہ ہی ان کے کہنے پر یزید اعتبار کر سکتا تھا۔

درجنوں صحابہؓ موجود تھے؟ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ حضرت مغیرہؓ نے معاذاللہ محض "چاپلوسی اور خوشامد" میں ایسی خلاف حقیقت بات کہدی، تو خود یزید کو اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ مغیرہؓ کا یہ کہنا درست نہیں ہے اور ان کی بیان کردہ بنیاد پر میں اہل نہیں ہوسکتا ہوں، پھر بھلا وہ مغیرہؓ کی اس تحریک کا ذکر اپنے والد گرامی سے کیونکر کرسکتا تھا؟۔

ج: الکامل کی اس روایت میں ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس استفسار پر کہ اس کام کو پورا کرنے کی ذمہ داری کون لے گا؟ مغیرہؓ نے کہا کہ اہل کوفہ کو میں سنبھال لوں گا، اور اہل بصرہ کو زیاد، "اس کے بعد پھر اور کوئی مخالفت کرنے والا نہیں ہے"۔

حضرت مغیرہؓ جیسا مدبر اور "دہاۃ عرب" میں شمار ہونے والا شخص ایسی بے تدبیری اور بے عقلی کی بات کہہ ہی نہیں سکتا کہ "اہل کوفہ اور اہل بصرہ کے بعد پھر اور کوئی مخالفت کرنے والا نہیں ہے" کیونکہ انھیں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت حسین بن علیؓ، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے خیالات کا بخوبی علم تھا، اور یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کس حیثیت کے لوگ ہیں، پھر حضرت مغیرہؓ کیسے حضرت معاویہؓ سے ایسی کچی بات کہہ سکتے تھے؟ اور حضرت معاویہؓ جیسا فرزانہ و مدبر حکمراں حضرت مغیرہؓ کی اس بات پر یقین کیسے کرسکتا تھا؟

د: اس روایت میں ہے کہ یہ بات کرکے حضرت مغیرہؓ کوفہ آئے اور وہاں اپنے مصاحبین سے آکر بیان کیا کہ "میں نے معاویہؓ کو امت محمدیہ کے خلاف ایسی زبردست گمراہی میں ڈالدیا ہے، اور ان کے درمیان ایسا تفرقہ پیدا کردیا ہے کہ اب وہ کبھی متحد نہ ہوسکیں گے"[1]، یہ الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس روایت میں جعل و فریب کا

---

[1] روایت کے ان الفاظ کا ترجمہ بھی "خلافت و ملوکیت" کے مصنف نے اسی مصلحت کے تحت چھوڑ دیا ہے۔

پورا دخل ہے، اور یہ "سبائی ٹکسال" کی ڈھلی ہوئی روایت ہے، کیونکہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ واقعی یہ بات حضرت مغیرہؓ نے کہی ہے تو پھر ان کا دین وایمان پر قائم رہنا ہی ثابت نہ ہوسکے گا، کیونکہ گمراہی پر ڈال کر اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرکے اس پر خوش ہونیوالا کوئی صحابیٔ رسول ہرگز نہیں ہوسکتا، دشمن دین وایمان "سبائی" ہی ہوسکتا ہے۔

۷: روایت میں ہےکہ "حضرت مغیرہؓ نے اپنے بیٹے موسی کی سرکردگی میں دس آدمیوں کا ایک وفد تیس ہزار روپئے دیکر اس کام کیلئے دمشق بھیجا کہ یہ لوگ حضرت معاویہؓ کے پاس جاکر یزید کی ولی عہدی کا مطالبہ کریں۔ گویا ایک جلیل القدر صحابی رسول نے رشوت دیکر کرائے کے دس آدمی تیار کئے، اور وہ بھی اس کام کے لئے کہ یہ لوگ حضرت معاویہؓ سے یزید کی ولیعہدی کی بات کریں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت مغیرہؓ خود حضرت معاویہؓ اور یزید کے بھی مخلص نہ تھے، اور ان دس آدمیوں کے ذریعے انکو دھوکہ دینا چاہتے تھے، جبکہ پچھلے بیان کے مطابق حضرت مغیرہؓ کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ کوفہ کی رائے عامہ کو یزید کی ولی عہدی کیلئے ہموار کرتے، انھوں نے یہ نہ کرکے دس کرئی وفد حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجدیا، تاکہ حضرت معاویہؓ اس دھوکہ میں آجائیں کہ مغیرہؓ نے کوفہ میں رائے عامہ ہموار کرلی ہے اور وہاں کے عوام خود ہی اب یزید کی ولیعہدی کا مطالبہ کررہے ہیں۔

د: پھر آگے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ اس وفد کی حقیقت سمجھ گئے اور انھوں نے جان لیا کہ یہ کرائے کے لوگ ہیں، چنانچہ انھوں نے حضرت مغیرہؓ کے بیٹے موسیٰ سے الگ بلاکر پوچھا، "تمہارے باپ نے ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دین خریدا؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ تیس ہزار درہم میں، اس پر حضرت معاویہؓ نے کہا "تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے"، بیان کے مطابق حضرت

معاویہؓ کا یہ انداز گفتگو یا تو طنز یہ ہو سکتا ہے، جس سے یہ ثابت ہوگا کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کے "دھوکے" میں پڑنے سے انکار کر دیا، اور اگر یہ گفتگو صرف استفسار کے لئے ہوئی تھی، تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ دین وایمان کا معاملہ ان دونوں بزرگوں کی نگاہ میں "متاع بازار" کی طرح کا تھا کہ نہایت بے تکلفی اور فرحت کیساتھ دین کی خرید وفروخت کی بات کرتے تھے، اور یہ دونوں ہی صورتیں ایسی ہیں جنکا تصور آج پندرہویں صدی کے کسی گرے پڑے مسلمان کے بارے میں بھی نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہؓ جیسے جلیل القدر صحابیوں کی طرف اس کی نسبت ہو سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

یہ چند ایسی اندرونی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ درایتاً بھی یہ روایت معتبر نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہیکہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے حضرت معاویہؓ کو یزید کی ولیعہدی کا مشورہ نہ اس لئے دیا تھا کہ وہ کوفہ کی گورنری پر برقرار رہنا چاہتے تھے، نہ ہی اس لئے دیا تھا کہ وہ یزید کو اس وقت کے تمام لوگوں میں افضل، اور امارت کے لئے "موزوں ترین" شخص سمجھتے تھے، بلکہ انھوں نے پوری دیانت داری اور اخلاص کیساتھ یہ مشورہ صرف اس لئے دیا تھا کہ ان کو اندازہ تھا کہ اگر حضرت معاویہؓ اپنے بعد خلافت کے لئے کسی کو نامزد کر دیں گے، تو فتنہ کا سدباب ہو جائے گا۔ ورنہ حضرت معاویہؓ کے بعد ان کی جانشینی کو لیکر ایک مرتبہ پھر فتنہ کی آگ بھڑک اٹھے گی، نیز انھیں اس کا بھی خیال تھا کہ یزید ہی کی ذات ایک ایسی ہیکہ اس کی نامزدگی پر بنوامیہ کے تمام افراد متفق ہو جائیں گے، اور دوسرے کسی شخص کی حضرت معاویہؓ کی طرف سے بھی ولیعہدی پر سب کو اتفاق نہ ہوگا، اور اس وقت کے سیاسی حالات کے پیش نظر قیام امن کے لئے بنوامیہ کا اتحاد ضروری تھا، یہ تھی وہ بنیادی مصلحت جس کے پیش نظر حضرت مغیرہؓ

نے یزید کی ولیعہدی کا مشورہ دیا، پھر اس سلسلہ میں ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے صرف حضرت مغیرہؓ کے مشورہ ہی پر یزید کو ولیعہد نہیں مقرر کیا بلکہ مملکت کے ارباب حل وعقد، خصوصاً اہل مدینہ سے استصواب رائے کے بعد ہی انھوں نے یزید کی ولیعہدی پر بیعت لی تھی، اور اسی مقصد کے لئے خود مدینہ کا سفر بھی کیا تھا۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں نہ حضرت مغیرہؓ کی اس رائے ومشورہ کو، "ذاتی مفاد" کے حصول سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، نہ ہی یزید کی ولیعہدی کے لئے ان کو تنہا ذمہ دار گردانا جاسکتا ہے۔

بہرحال حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی مظلومیت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ ان کی "بے داغ زندگی"، کو صرف یزید کی ولیعہدی کے ایک مشورہ کے ذریعہ اتنا گھناؤنا بنانے کی کوشش کی گئی گویا انھوں نے زندگی میں بس یہی ایک کام کیا تھا، حالانکہ اس کا اعتراف خود ابن الاثیرؒ کو بھی ہے کہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ عرب کے چار نامور ترین و مسلّم صاحب تدبیر لوگوں میں سے تھے۔



حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

حضرت ابوذر غفاریؓ کا شمار "السابقون الاولون" میں ہے، صحابہ کرامؓ میں سے چوتھے یا پانچویں نمبر پر آپ نے اسلام قبول کیا۔ سنت رسول اللہؐ کے شیدائی اور علم رسولؐ کے بہت بڑے محافظ تھے۔ زہد و تقویٰ اور ترک و تجرید پر سختی کے ساتھ عامل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے احوال کی تحسین فرماتے ہوئے ان کو "مثیل عیسیٰ" قرار دیا۔ اسی بنا پر جماعت صحابہؓ میں یہ اپنی الگ شناخت رکھتے تھے، اور صحابہ کرامؓ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

سبائیوں نے ان کے نام کو اپنی غرض کا نشانہ اس لئے بنایا کہ "سبائی تحریک" کے بانی عبداللہ بن سبا (منافق) نے ان کی سادہ لوحی اور "غلبۂ حال" سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سب سے پہلے ان ہی کے ذریعہ حضرت معاویہؓ پر اعتراض کرایا تھا۔ اور پھر حضرت ابوذرؓ اور حضرت معاویہؓ کی "نظریاتی کشمکش" نے اتنا طول پکڑا تھا کہ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ کی طلب پر حضرت ابوذرؓ کو شام چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا تھا۔ حضرت ابوذرؓ کے "ترک و تجرید کے غلبۂ حال" کو ان کے "معاشی نظریہ" یا "مذہبی اختلاف" سے تعبیر کر کے بعد کے مورخین نے حضرت ابوذرؓ و حضرت معاویہؓ، اور حضرت ابوذرؓ و حضرت عثمان غنیؓ کے درمیان اختلافات کی من گھڑت کہانیاں بیان کر دیں، اور پھر حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ سے عداوت رکھنے والوں نے حضرت ابوذرؓ کا نام اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

تاریخ کی ان مکذوبہ روایات اور بے اساس قیاس آرائیوں کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ایک نظر حضرت ابوذرؓ کی مبارک سیرت پر ڈال لی جائے ۔

حال و مقام

علامہ ابن الاثیرؒ اپنی کتاب اسد الغابہ میں تحریر کرتے ہیں ۔

حضرت ابوذرؓ غفاری کا نام جندب بن جنادہ بن سفیان اور کنیت ابوذرؓ تھی ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مکہ کے زمانہ میں اسلام لائے ، اسلام میں داخل ہونیوالوں میں یہ چوتھے اور بعض لوگوں کے بیان کیمطابق پانچویں شخص تھے ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تین برس قبل ہی سے یہ خدا کی عبادت کیا کرتے تھے ، اسلام قبول کرنے کے بعد پھر اپنی قوم میں واپس لوٹ آئے اور وہیں مقیم رہے ، یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے تو انھوں نے بھی اس وقت مدینہ ہجرت کی جب جنگ بدر ، احد ، اور خندق ہو چکی تھی ، پھر حضورؐ کی وفات تک مدینہ ہی میں رہے ۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد یہ مدینہ سے شام چلے آئے ، پھر شام سے حضرت عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت معاویہؓ کی شکایت پر ان کو بلالیا ، اور ربذہ[1] میں ان کو رہنے کی جگہ دی ۔ حضرت ابوذرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ خدا کی راہ میں ان کو کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہ ہوگا ، اور حق بات کہہ دیا کریں گے چاہے وہ تلخ ہو ۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہیکہ وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ آسمان نے سایہ نہیں کیا اور زمین نے اپنے اوپر نہیں اٹھایا کسی ایسے شخص کو جو ابوذرؓ سے زیادہ سچا ہو ، روایت

---

[1] ربذہ کا مدینہ طیبہ سے ۳ میل کے فاصلہ پر مکہ مکرمہ کی سمت میں ایک دیہات تھا ۔

ہیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو ذرؓ دنیا میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے زہد پر چل رہے ہیں، حضرت ابو ذرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی سلام کیا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث روایت کیں، اور ان سے روایت کرنے والوں میں حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور بہت سے دوسرے صحابہؓ ہیں۔

حضرت ابو ذرؓ کی اہلیہ کا بیان ہیکہ جب ابو ذرؓ کی وفات کا وقت آیا، اور وہ ربذہ میں تھے تو میں رونے لگی، حضرت ابو ذرؓ نے پوچھا کہ کیوں رو رہی ہو؟ میں نے کہا کہ اس لئے روتی ہوں کہ مجھے تمہارے لئے کفن کی ضرورت ہوگی، حالانکہ میرے پاس کوئی ایسا کپڑا نہیں ہے جو تمہارے کفن کے لئے کافی ہو جائے، یہ سنکر حضرت ابو ذرؓ نے کہا کہ تم مت روؤ۔ کیونکہ ایک دن میں چند لوگوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، آپ نے فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص ایک ویران زمین میں وفات پائیگا اور اس کی تجہیز وتکفین میں مومنین کی ایک جماعت شریک ہوگی میرے ساتھ جو لوگ اس مجلس میں شریک تھے سب آبادی اور بستی میں وفات پا چکے ہیں سوا اب کوئی باقی نہیں رہا اور میں ہی ویرانے میں مر رہا ہوں، تو تم راستے میں جا کر انتظار کرو، تم یقیناً وہ بات دیکھ لوگی جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ اور میں خدا کی قسم جھوٹ نہیں بولتا، نہ ہی مجھ سے جھوٹ بیان کیا گیا۔ اہلیہ بولیں کہ یہ کس طرح ہوگا جبکہ اب حاجیوں کا قافلہ بھی نکل چکا، حضرت ابو ذرؓ نے کہا تم راستے میں جا کر انتظار کرو۔ چنانچہ وہ راستے میں جا کر کھڑی ہو گئیں، یکایک انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ اپنی سواریاں دوڑاتے ہوئے آرہے ہیں، جب وہ لوگ قریب آئے تو انھوں نے آکر پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ اہلیہ نے کہا کہ ایک مرد مسلم کی موت کا وقت قریب ہے، تم لوگ اسے کفن دیکر اجر حاصل کرو، ان لوگوں نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ابو ذرؓ! ان لوگوں نے یہ سنکر کہا کہ ہمارے ماں باپ ان پر فدا ہوں،

اور پھر وہ لوگ اپنے اونٹ دوڑاتے ابوذرؓ کے پاس پہونچ گئے۔ حضرت ابوذرؓ نے ان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا، اس کے بعد ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں تم لوگوں کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ مجھے وہ شخص کفن نہ دے جو امیر ہو یا عریف یا قاصد رہا ہو، اتفاق سے ایک انصاری کے سوا جتنے لوگ موجود تھے سب میں کوئی نہ کوئی بات تھی، اس انصاری نے کہا کہ میں اس کام کے قابل ہوں، دو کپڑے میرے پاس ہیں جو میری ماں کی کاتی ہوئی روئی کے ہیں، اور ان دونوں میں سے ایک کپڑا میرے جسم پر ہے، حضرت ابوذرؓ نے یہ سنکر کہا ہاں تم ہی میرے رفیق ہو اور تم ہی مجھے کفن دینا۔

حضرت ابوذرؓ کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی اور ان کی نماز جنازہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے پڑھائی جو اس آنے والے قافلہ میں شامل تھے، پھر یہ لوگ حضرت ابوذرؓ کے اہل و عیال کو خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ کے پاس مدینہ لے گئے، حضرت عثمانؓ نے ان کی صاحبزادی کو اپنے بچوں کے ساتھ ہی رکھ لیا اور کہا کہ اللہ ابوذرؓ پر رحم فرمائے[1]

حضرت ابوذرؓ "اصحاب ترک و تجرید" میں سے تھے، مال و دولت کے سلسلہ میں ان کا اپنا رجحان یہ تھا کہ کسی بھی آدمی کو مال و دولت جمع نہیں کرنا چاہیئے، اور اپنی ضرورت سے زائد مال دوسروں میں تقسیم کر دینا چاہیئے، چونکہ ان کا خود سختی کے ساتھ اسی پر عمل تھا کہ اپنی ضرورت سے زائد ایک حبہ بھی اپنے پاس رکھنا اپنے لئے حرام جانتے تھے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی "زاہدانہ زندگی" میں اپنی ضرورت کا بھی کوئی خانہ نہ تھا، جیسا کہ ان وفات کے وقت کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس کفن تک کے لئے کپڑا نہ تھا، حالانکہ ربذہ میں بھی خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان غنیؓ نے ان کی رہائش کا معقول انتظام کرتے ہوئے دو غلام اور چند اونٹ ان کو دیئے تھے[2]، ان کی زاہدانہ زندگی اور مال و دولت سے گریز

---

[1] ترجمہ اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۴۲ تا ۱۴۵ (ملخصاً) [2] طبری ج ۴ ص ۲۸۴۳،۸۴-۲

واحتیاط کا اندازہ اس ایک مثال سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے شام کے زمانۂ قیام میں حضرت معاویہؓ نے ان کی خدمت میں ایکہزار دینار بھیجے، جسے انھوں نے قبول فرمالیا دوسرے روز حضرت معاویہؓ نے ان کے پاس آدمی بھیجا کہ کلُ الی رقم واپس مانگی ہے، اس کے جواب میں حضرت معاویہؓ کو یہ علم ہو کر انتہائی تعجب ہوا کہ حضرت ابوذرؓ کے پاس اس رقم میں سے اب کچھ نہیں بچا ہے کیونکہ رقم ہاتھ میں آتے ہی انھوں نے سب تقسیم کردی اور اپنے یا اہل وعیال کے لئے کچھ بھی نہیں بچایا۔[1]

حضرت ابوذرؓ سے ابن سبا کی ملاقات

مال ودولت کے سلسلہ میں حضرت ابوذرؓ کی یہ ذاتی رائے، اور ان کی زاہدانہ زندگی کا حال سب ہی کو معلوم تھا۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے زہد کے معاملہ میں ان کو حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے مشابہ قرار دیا تھا، اسی وجہ سے صحابۂ کرام کے درمیان بھی وہ اپنی اس اعلیٰ حالت کی بنا پر "مسیح الاسلام" کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں جب ابن سبا دوسری جگہوں کا دورہ کرتا ہوا شام پہونچا، اور اپنی فساد مہم کے لئے اس کو دوسری جگہوں کی طرح شام سے کوئی آدمی ہم نوائی کے لئے نہ مل سکا اور حضرت معاویہؓ کے مضبوط اور چوکس نظام میں رخنہ ڈالنے کا اسے کوئی راستہ دکھائی نہ دیا، تو اس نے ایک نیا پینترا یہ چلا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے پاس آیا اور ان سے کہا۔

یا اباذر الا تتعجب من معاویۃ	اے ابوذر! کیا آپ کو اس بات پر تعجب نہیں
یقول المال مال اللہ الا ان کل	ہوتا کہ معاویہ کہتے ہیں کہ یہ سب مال اللہ کا ہے؟
شیئ للہ کانہ یرید ان	ویسے تو ہر چیز اللہ کی ہے، مگر وہ گویا یہ چاہتے

---

[1] طبری ج ۴ ص ۳۰۸۔

یحتجنه دون المسلمین — ہیں کہ مسلمانوں کے بجائے خود اس پر قابض ہوجائیں

و یمحو اسم المسلمین۔ — اور مسلمانوں کا نام مٹادیں۔

حضرت ابوذرؓ جس مقام پر تھے اس کا یہی تقاضا تھا کہ وہ برداشت نہ کر سکے، اور فوراً حضرت معاویہؓ کے پاس پہونچے اور ان سے پوچھا" یہ کیا بات ہے کہ آپ مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کہتے ہیں؟" حضرت معاویہؓ نے جواب دیا" ابوذر! اللہ آپ پر رحم فرمائے ہم کیا غلط کہتے ہیں؟ کیا یہ مال اللہ کا نہیں ہے؟ یہ مخلوق اسی کی نہیں ہے، اور کیا حکم صرف اسی کا نہیں ہے؟" حضرت ابوذرؓ نے کہا" یہ ٹھیک ہے، مگر آپ اس طرح کہا مت کیجئے" حضرت معاویہؓ نے (قصہ ختم کرنے اور حضرت ابوذرؓ کو مطمئن کرنے کیلئے) کہا "میں یہ تو نہ کہونگا کہ مال اللہ کا نہیں ہے، البتہ اسے مسلمانوں کا مال کہدیا کرونگا" یوں ابن سبا حضرت ابوذرؓ کے بعد دو اور زاہدوں یعنی حضرت ابوالدرداؓ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کے پاس بھی گیا اور ان سے بھی جاکر اسی طرح حضرت معاویہؓ کی شکایت کی، مگر ان دونوں جگہوں پر اسے کوئی کامیابی نہ مل سکی، کیونکہ حضرت ابوالدرداؓ نے تو اس کی بات سنکر فرمایا، "تو ہے کون؟ مجھے تو یہودی معلوم ہوتا ہے" پھر وہاں سے بھاگ کر جب یہ حضرت عبادہؓ کے پاس پہنچا اور ان سے حضرت معاویہؓ کی یہی بات نقل کی، تو انھوں نے تو اسے پکڑ لیا اور حضرت معاویہؓ کے پاس لیجاکر کہا، "بخدا یہی شخص ہے جس نے ابوذرؓ کو آپکے پاس بھیجا تھا" تب ابن سبا کو شام سے نکالا گیا۔ ؎

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کو حضرت معاویہؓ اور اہل شام کے خلاف ابن سبا نے اکسایا تھا، ورنہ وہ تو برسوں سے شام میں مقیم تھے، یہ الگ بات ہے کہ دولت اور اسکی تقسیم کے سلسلہ میں ان کا اپنا مخصوص نظریہ تھا، اور وہ ضرورت

؎ حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی ص ۴۹، ۵۰ (ماخوذ)

سے زائد ایک حبہ مال رکھنے کو بھی حرام گردانتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ زہد و تقویٰ کے اعلیٰ درجہ کی بات تھی جسے عام قانون کی شکل نہیں دی جاسکتی تھی۔

حضرت ابوذرؓ کی تحریک

اس واقعہ کے بعد حضرت ابوذرؓ نے اپنا یہ معمول بنالیا کہ وہ شام کے مالدار لوگوں کے پاس جاتے اور ان کو وہ آیات قرآنی سناسنا کر جن میں مال جمع کرنے اور خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنے کی مذمت کی گئی ہے، ان لوگوں سے سختی کے ساتھ کہتے کہ تمہارے مال میں تمہارے غریب بھائیوں کا حصہ ہے لہذا اپنی ضرورت سے زائد ان کو دے دو، حضرت ابوذرؓ کی اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ غرباء نے امراء پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا، اور طبقاتی کشمکش شروع ہوگئی، لوگوں نے اس کی شکایت شام کے گورنر حضرت معاویہؓ سے کی۔ انھوں نے پہلے تو خود حضرت ابوذرؓ کو سمجھا کر خاموش کرنا چاہا لیکن جب کامیابی نہ ہوئی تو انھوں نے ان کی شکایت دربار خلافت میں لکھکر بھیج دی، حضرت عثمانؓ نے حضرت معاویہؓ کو جواب میں لکھا کہ فتنہ نے اپنی سونڈ ھ ہلانا شروع کر دی ہے، اس لئے تم اغماض سے کام لو اور زخم مت کریدو، اور ابوذرؓ کو پورے احترام کیساتھ میرے پاس بھیج دو۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے تعمیل حکم کرتے ہوئے حضرت ابوذرؓ کو مدینہ روانہ کر دیا، حضرت عثمانؓ نے ان سے گفتگو کرنے اور "غلبۂ حال" کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایک طرف حضرت ابوذرؓ کو معذور سمجھا کہ وہ اپنے "مقام تقویٰ" سے گفتگو کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ کسی نرمی پر تیار نہیں ہوسکتے، دوسری طرف یہ ناممکن جانا کہ ہر شخص ابوذر بن جاتا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوذرؓ کو رائے دی کہ آپ ربذہ منتقل ہوجائیں، ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ مدینہ آتے رہیئے گا تاکہ آپ پر بدویت غالب نہ ہو۔ حضرت ابوذرؓ خود بھی اسی کو پسند کرتے تھے کہ وہ "کنج عافیت" میں رہیں کیونکہ شہروں کے بدلتے

ہوئے حالات ان کے لئے ناقابل برداشت تھے، چنانچہ وہ ربذہ منتقل ہو گئے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ اسی اثنا میں ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ ربذہ سے مدینہ آئے، اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ جو لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ان کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ان کو اپنے اعزاء، اور پڑوسیوں وغیرہ کے ساتھ صلہ رحمی اور احسان کا معاملہ بھی کرنا چاہیئے۔ حضرت کعب الاحبار بھی اس مجلس میں موجود تھے، انھوں نے کہا کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے اپنے فریضہ سے تو سبکدوش ہو ہی گئے، یہ سنکر حضرت ابوذرؓ کو اتنا غصہ آیا کہ اپنی سپر اٹھا کر ان کو زخمی کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے سپر حضرت ابوذرؓ کے ہاتھ سے لے لی اور فرمایا ابوذرؓ خدا کا خوف کرو اور اپنی زبان اور ہاتھ کو قابو میں رکھو۔[۱]

حضرت ابوذرؓ کے اپنے موقف پر اس طرح اصرار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ "وارفتہ حال" تھے۔ اور اگر وہ ربذہ منتقل نہ ہو جاتے تو ممکن تھا کہ ابن سبا جیسے دوسرے سیاہ باطن لوگ ان کی آڑ میں بڑا فتنہ برپا کر دیتے۔

کیا حضرت ابوذرؓ کو جلاوطن کیا گیا؟

جن لوگوں کے دل مریض اور باطن خبیث ہیں، ان کو صحابۂ کرامؓ کے سلسلہ میں جہاں کوئی پھانس ملی، اسے بانس بنا ڈالتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوذرؓ کی اس تحریک، اور پھر حضرت عثمان غنیؓ کے مشورہ سے ان کی ربذہ منتقلی کو بعض لوگوں نے اس نگاہ سے دیکھا کہ "چونکہ ابوذرؓ ابن سبا کے آلۂ کار بن گئے تھے، اور اس کے ایما پر شام میں اور پھر مدینہ میں فساد برپا کرنا چاہتے تھے اس لئے مجبوراً حضرت عثمانؓ نے ان کو جلاوطن کر کے ربذہ بھیج دیا" دوسرے بعض لوگوں کو حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ کے سلسلہ میں اپنے بغض کے اظہار

---

[۱] عثمان ذوالنورین ص ۱۷۵، ۱۷۶ (ملخصاً) بحوالہ طبری۔

کاموقع مل گیا، اور انھوں نے اسی واقعہ کو یوں پیش کیا کہ جلیل القدر صحابی رسول حضرت ابوذر غفاریؓ کی اس مخلصانہ تحریک پر کہ ذخیرہ اندوزی، اور مال جمع کرنیکی ممانعت کیگئی ہے، اس لئے مالدار لوگ اپنے مالوں میں اپنے غریب بھائیوں کا بھی حق سمجھ کر ان کا حصہ ادا کریں، ان کو حضرت معاویہؓ نے شام سے مدینہ بھیجدیا، اور پھر حضرت عثمانؓ نے مدینے سے ربذہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہیکہ حضرت ابوذرؓ کو حضرت عثمانؓ نے جلاوطن کیا ہی نہیں، نہ مجبوراً نہ ہی سزا کے طور پر، یا ظلماً۔ بلکہ حضرت عثمانؓ کی اولین خواہش تو یہی تھی کہ حضرت ابوذرؓ ان ہی کے پاس مدینہ میں رہیں، مگر مدینہ میں بھی بدلے ہوئے حالات اور دولت کی ریل پیل دیکھ کر خود حضرت ابوذرؓ گھبرا گئے، چنانچہ علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

"خدا کی قسم! حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو جلاوطن نہیں کیا تھا، بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ابوذر! جب مدینہ کی تعمیرات سلع تک پہونچ جائیں تو تم مدینہ چھوڑ دینا، ایک شخص نے حسن بصریؒ سے پوچھا، کیا حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو جلاوطن کیا تھا؟ انھوں نے فرمایا: پناہ بخدا! ایسا کیوں ہوتا (سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۵۲) ذہبی کا بیان یہ بھی ہیکہ ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ساتھیوں میں رہیں، ورنہ مجھ کو آپ کے بارہ میں جاہل لوگوں کی طرف سے اندیشہ ہے (ایضاً ص ۵۰)"[1]

اس تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کی مدینہ سے ربذہ منتقلی کو جلاوطنی سے تعبیر کرنا بدباطنی کے سوا کسی دوسرے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ایک طرف حضرت ابوذرؓ کے "حال" کو کسی بھی طرح متہم نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ یہ زہد و تقویٰ

---

[1] عثمان ذوالنورین (حاشیہ) ص ۱۷۹-۸۰۔

اور ترک وتجرید کا اعلیٰ مقام تھا کہ حدود شرعی کے اندر جس مال وزر کا جمع کرنا مباح ہے اسے بھی حضرت ابوذرؓ مباح نہیں گردانتے تھے اور اس کے ساتھ حرام جیسا معاملہ کرتے تھے، یہ عین اس سنت پر عمل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال کے معاملہ میں اپنی ذات کی حد تک اس قدر محتاط رہے کہ ایک حبہ مال بھی گھر میں رکھ کر رات گزارنا گوارہ نہ فرماتے، دوسری طرف حضرت عثمانؓ یا حضرت معاویہؓ پر بھی کوئی الزام اسلئے عائد نہیں ہوتا کہ حکمران کی حیثیت سے وہ خدا اور اس کے رسول کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے تھے، اور یہ عام قانون لاگو نہیں کر سکتے تھے کہ ضرورت سے زائد تمام مال بہر حال تقسیم کر دیا جائے۔

ان حالات میں آویزش اور ٹکراؤ سے بچنے کے لئے اگر حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو ربذہ میں سکونت اختیار کرنے کا مشورہ دیا، اور وہ بطیب خاطر وہاں منتقل ہو گئے تو اسے "جلاوطنی" سے کیونکر تعبیر کیا جا سکتا ہے، بلکہ علامہ ذہبی کے بیان کے مطابق تو حضرت ابوذرؓ نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں مدینہ چھوڑ کر ربذہ میں سکونت اختیار کی تھی، یہی وجہ ہیکہ ان کے مدینہ آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی، بلکہ خود حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمائش کی تھی کہ "آپ مدینہ آتے رہیئے گا تاکہ آپ پر بدویت غالب آنے پائے" اور حضرت ابوذرؓ ربذہ کی سکونت اختیار کرنے کے بعد بھی مدینہ برابر آتے رہتے تھے۔ اگر ان کو جلاوطن کیا گیا ہوتا تو اس طرح آزادانہ آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

کیا ابوذرؓ اشتراکی تھے؟

عبداللہ ابن سبا، اقتصادیات کے سلسلہ میں اشتراکی (کمیونسٹ) تھا، اس کی تحریک کی کامیابی میں اس چیز کا بھی بڑا دخل تھا کہ وہ اشتراکیوں (کمیونسٹوں) کی طرح مالداروں پر چوٹیں کرتا، اور غریبوں کو اس بات پر ابھارتا کہ مالداروں کا مال لوٹ لو، یہ

تمہارا ہی حق ہے جو مال دار لوگ دبائے بیٹھے ہیں۔ حضرت ابو ذرؓ نے اگرچہ اشتراکیوں والا طریقہ کبھی نہیں اپنایا، نہ ہی انھوں نے کسی کو دوسروں کے مال پر دست درازی کے لئے ابھارا اور آمادہ کیا، لیکن چونکہ وہ مال جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کرنے کے مخالف تھے اس لئے خود ابن سبا نے بھی ان کو استعمال کرنے کی کوشش کی، اور اس کے بعد ان لوگوں نے بھی جن کے دلوں میں ابن سبا کے لئے "نرم گوشہ" تھا، حضرت ابو ذر غفاریؓ کے ایمان افروز نظریہ کے ڈانڈے ابن سبا کی اسلام مخالف تحریک سے ملانے کیلئے حضرت ابو ذرؓ کو "اوّل اشتراکی فی الاسلام" (اسلام کے پہلے کیمونسٹ) کے نام سے یاد کیا۔

واقعہ یہ ہیکہ حضرت ابو ذر غفاریؓ جیسے بلند پایہ صحابی کی شاید اس سے بڑھ کر کوئی توہین ہو ہی نہیں سکتی کہ انھیں "اشتراکی" قرار دیتے ہوئے ایک باطل نظریہ کو قبول کر لینے کی ان کی طرف نسبت کیجائے، دراں حالیکہ ان کے سامنے اسلام کا جامع اقتصادی نظام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ تھا، جو کہ اشتراکیت (کمیونزم) اور سرمایہ داری (کیپٹل ازم) دونوں سے کسی سے میل نہیں کھاتا۔

اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی اور اس کی ملکیت کا تصور ہی نہیں ہے، جبکہ حضرت ابو ذرؓ نے نہ کبھی ایسی بات کہی، نہ ہی وہ کہہ سکتے تھے، کیونکہ ان کے سامنے قرآن وحدیث کی واضح تعلیمات، اور اسلام کا مربوط اقتصادی نظام تھا۔ جس میں غربت و امارت دونوں کا تصور ہے، اور غرباء و امراء دونوں کے حقوق و فرائض بیان کئے گئے ہیں، یہ صحیح ہے کہ حضرت ابو ذرؓ اپنے "غلبہ حال" کی بنا پر مال و دولت کو اپنے لئے حرام گردانتے تھے، اور دنیا کی بے ثباتی، اور مال و دولت کی ناپائیداری کے پیش نظر وہ کسی کے لئے بھی مال جمع کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ مال کے مالک کی اس کے مال پر ملکیت کے ہرگز منکر نہ تھے، جیسا کہ بخاری شریف کی

اس روایت سے جس میں حضرت ابوذرؓ نے اپنے اور حضرت معاویہؓ کے درمیان واقع ہونیوالے اختلاف کو بیان کیا ہے، ظاہر ہوجاتا ہے، روایت حسب ذیل ہے ۔

عن زید بن وهب قال	حضرت زید بن وہب سے روایت ہے کہ انھوں
مررت بالربذة فاذا	نے کہا کہ میں ایک مرتبہ ربذہ سے گذرا تو
انا بابی ذر فقلت له	دیکھا کہ وہاں حضرت ابوذرؓ موجود ہیں، میں نے
ما انزلك منزلك	ان سے پوچھا کہ آپ کے یہاں آنے کی کیا
هذا قال کنت بالشام	وجہ پیش آئی ؟[۱] انھوں نے کہا کہ میں شام
فاختلفت انا ومعاوية	میں تھا پس وہاں میرا اور معاویہؓ کا اس آیۃ
فی الذین یکنزون الذهب	الّذین یکنزون الخ (وہ لوگ جو سونا چاندی
والفضة ولا ینفقونها	جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ
فی سبیل الله قال	نہیں کرتے) کے سلسلہ میں اختلاف ہوگیا
معاویة نزلت فی اهل	حضرت معاویہؓ نے کہا کہ یہ آیت اہل کتاب کے
الکتاب فقلت نزلت	سلسلہ میں نازل ہوئی ہے[۲] میں نے کہا کہ یہ آیت
فینا وفیهم فکان	ہمارے اور انکے دونوں کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے[۳]

---

[۱] حضرت زید کے اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ سے بغض رکھنے والے ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ انھوں نے ابوذرؓ کو ربذہ میں ڈالدیا ہے، حالانکہ آگے آنیوالے ابوذرؓ کے بیان سے پتہ چل جاتا ہے کہ ربذہ میں انکا آنا ان کی اپنی مرضی سے تھا (قسطلانی)

[۲] حضرت معاویہؓ نے یہ بات ماسبق کے مضمون کی رعایت کرتے ہوئے کہی تھی کیونکہ آیتہ یایھا الذین امنوا ان کثیراً من الاحبار والرھبان الخ میں صاف طور پر اہل کتاب ہی کا ذکر ہے جو لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھاجاتے تھے (قسطلانی)

[۳] حضرت ابوذرؓ نے آیت کے عموم کے پیش نظر اپنی رائے پیش کی تھی ۔ (قسطلانی)

بینی وبینہ فی ذالک	تو میرے اور انکے درمیان اسی بات پر نزاع ہوا
فکتب الی عثمان یشکونی	انھوں نے حضرت عثمانؓ کو میری شکایت لکھ
فکتب الیّ عثمان ان اقدم	کر بھیجدی، عثمانؓ نے مجھے لکھا کہ تم مدینہ آجاؤ،
المدینۃ فقدمتھا فکثر	چنانچہ میں مدینہ آگیا، وہاں لوگ اس کثرت سے
علیّ الناس حتی کانھم	میرے پاس آنے لگے گویا انھوں نے اس
لم یرونی قبل ذالک	سے پہلے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں تھا، تو میں
فذکرت ذالک لعثمان فقال	نے اس کا ذکر عثمانؓ سے کیا، انھوں نے مجھ
لی ان شئت تنحیت فکنت	سے کہا کہ اگر آپ یہاں سے ہٹنا چاہیں تو
قریبًا فذالک الذی	قریب ہی چلے جائیں، بس یہی ہے وجہ جس نے
انزلنی ھٰذا المنزل و	مجھے یہاں پہونچا دیا، اور اگر لوگ مجھ پر حبشی غلام
لو امروا علیّ حبشیا لسمعت	کو حاکم مقرر کردیں تو میں اس کی بھی سنونگا
واطعت لہ	اور اطاعت کرونگا۔

اس روایت میں جہاں اس بات کی وضاحت ہیکہ حضرت ابوذرؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان کوئی ذاتی اختلاف نہ تھا، بلکہ ایک خالص علمی اختلاف تھا، اور چونکہ حضرت ابوذرؓ کے موقف سے حضرت معاویہؓ کو اختلال وفتنہ کا اندیشہ ہوا، اس لئے انھوں نے اس کی اطلاع حضرت عثمان غنیؓ کو دیدی جو خلیفۃ المسلمین تھے، اور یہ کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذر کو لوگوں کے ضرر سے محفوظ کرنے کے لئے مدینہ سے ہٹ جانے کا مشورہ دیا تھا، اور اسی مشورہ کے مطابق حضرت ابوذرؓ اپنی خوشی سے ربذہ جاکر مقیم ہوئے تھے، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ اشتراکی نظام کے ہرگز حامی

لہ بخاری جلد ا ص ۱۸۹ باب ما ادی زکاتہ فلیس بکنز۔

نہ تھے کہ انھیں "اسلام کا پہلا اشتراکی" قرار دیا جا سکے، بلکہ قرآنی آیت سے وہ اس بات پر استدلال کرتے تھے کہ مال و زر جمع کرنے کے بجائے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کردینا چاہیئے۔[1]

حضرت ابوذرؓ کی مظلومیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی خادم اور آپ کے اعتماد یافتہ صحابی حضرت ابوذرؓ کی اس سے زیادہ مظلومیت اور کیا ہوگی کہ ان کو "سبائی تحریک" سے متاثر گردان کر حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں کا مخالف باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے؟ اور ایک اسلام مخالف تحریک "اشتراکیت" سے ان کا تعلق جوڑ کر ان کے بارے میں یہاں تک کہنے کی جرأت کی گئی کہ "هو اول اشتراکی فی الاسلام" (وہ اسلام میں پہلے اشتراکی (کمیونسٹ) تھے) اور حضرت عثمانؓ کے مخلصانہ و برادرانہ مشورہ پر ان کی مدینہ سے ربذہ منتقلی کو ان کی جلاوطنی سے تعبیر کیا گیا؟ ظاہر ہے کہ یہ ساری کارروائیاں اور "بات کو بتنگڑ" بنانے کی ساری کوششیں ان ہی لوگوں کی طرف سے کی گئیں جو صحابۂ کرامؓ کے مقدس پیکر کو مسخ کر کے اسلام کا مضبوط قلعہ منہدم کرنا چاہتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نہ حضرت عثمانؓ و معاویہؓ اور حضرت ابوذرؓ کے درمیان کوئی ذاتی مخالفت ہوئی نہ ہی جانبین سے قدر شناسی میں کسی قسم کی کوتاہی کی گئی، اور نہ ہی حضرت ابوذرؓ اور "سبائی تحریک" کے درمیان کسی قسم کا علاقہ یا رشتہ قائم ہوا۔

---

[1] امام بخاریؒ نے اس روایت کو جس باب کے ذیل میں ذکر کیا ہے اس سے انکا بھی یہی مسلک واضح ہوتا ہے کہ ممانعت کنز کرنے کی ہے، اور جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی گئی ہو، وہ کنز کی تعریف میں آتا ہی نہیں ہے یہ بالکل وہی مسلک ہے جو حضرت کعب الاحبارؓ نے حضرت ابوذرؓ کے سامنے پیش کیا تھا، اور جس کا ذکر پہلے ہو چکا، اور یہی امت کا متفق علیہ موقف ہے، رہا حضرت ابوذرؓ کا موقف، تو وہ مقام زہد و ترک کی بات ہے جسے عمومی قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح، حضرت عثمانؓ غنی کے دودھ شریک بھائی تھے، ان کی والدہ نے حضرت عثمانؓ کو دودھ پلایا تھا، فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور ہجرت کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضورؐ نے ان کو کاتب وحی مقرر فرمایا، پھر یہ مرتد ہوکر مشرکین مکہ سے جا ملے لیکن فتح مکہ کے بعد حضرت عثمانؓ غنی کے ساتھ دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا، حضرت عثمانؓ کی سفارش پر حضورؐ نے ان کا پچھلا قصور معاف کردیا، اور اب یہ اپنے اسلام پر اس طرح ثابت قدم ہوئے کہ پھر ان سے کوئی قابل ملامت بات سرزد نہیں ہوئی۔ ان کا شمار قریش کے دانشمندوں اور بزرگوں میں ہوتا تھا، حضرت عثمانؓ غنی نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو ۲۵ھ میں مصر کا عامل مقرر کیا۔ اور حق تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں افریقہ کو فتح کرایا۔ یہ ایسی بڑی فتح تھی کہ اس میں سواروں کو تین ہزار مثقال اور پیادوں کو ایک ہزار مثقال سونا ملا۔ اس فتح میں ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص بھی تھے افریقہ کے بعد انھوں نے سرزمین نوبہ میں حبشیوں سے جنگ کی، اور ان کو ایسا پست

کیا کہ اس کا اثر آج تک باقی ہے۔ انھوں نے سمندر میں بھی روم تک جہاد کیا۔
حضرت عبداللہؓ بن سعد نے دعا کی تھی کہ، اے خدا میرا آخری عمل نماز ہو، چنانچہ ان کی یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ ایک دن فجر کی نماز پڑھی، پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ اور والعادیات پڑھی، دوسری میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت پڑھی، اور داہنی طرف سلام پھیرنے کے بعد بائیں طرف سلام پھیر رہے تھے کہ اسی حالت میں وفات ہوگئی۔ ان کی وفات عسقلان میں ہوئی۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ افریقہ میں ۳۶ھ یا ۳۷ھ میں انتقال ہوا، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے اخیر زمانہ تک یہ حیات رہے، اور ۵۹ھ میں ان کا انتقال ہوا، لیکن پہلا قول اصح ہے، انھوں نے نہ حضرت علیؓ کی بیعت کی تھی اور حضرت معاویہؓ کی بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنگ صفین میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ شریک ہوئے تھے اور بعض لوگوں کا کہنا ہیکہ نہیں شریک ہوئے تھے، اور یہی بات صحیح ہے۔[1]

یہ ہے حضرت عبداللہ بن سعدؓ کی زندگی کی ایک جھلک، جس سے درج ذیل امور کا علم ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن سعدؓ کا شمار قریش کے دانش مند لوگوں میں تھا، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے کتابت وحی کی اہم ذمہ داری ان کے سپرد کی تھی۔

۲۔ حضرت عبداللہؓ کے ہاتھوں پر افریقہ فتح ہوا، اور ان کے زیر قیادت لشکر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص جیسے اکابر نے بھی شرکت کی تھی، اور اس فتح میں اتنا مال غنیمت ہاتھ

---

[1] ترجمہ اسد الغابہ ج ۵ ص ۲۳۷-۳۸ (ملخصاً)

آیا تھا، کہ انہیں شریک ہر سوار کو تین ہزار مثقال اور ہر پیادہ کو ایک ہزار مثقال سونا ملا تھا۔

۳۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں ہونیوالی پہلی بحری جنگ میں بھی حضرت عبداللہ بن سعدؓ نے شرکت کی (اور خلیفہ کے حکم سے اپنے ساتھ مصر سے ایک جماعت لیکر شریکِ جہاد ہوئے) اور یہ وہ جنگ ہے جس کے شرکاء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت عطا فرمائی ہے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن سعدؓ کی وفات نماز کی حالت میں ہوئی، جو بجائے خود ایک بڑی فضیلت کے علاوہ ان کی اس دعا کی قبولیت کی علامت ہے کہ ان کا دنیا میں آخری عمل نماز ہو۔

ایک طرف یہ فضائل ہیں، تو دوسری طرف سبائیوں کے وہ الزامات ہیں، جن کی بنیاد پر اسلامی تاریخ کے اس مایہ ناز فرزند کو مطعون کیا جاتا ہے، اور بجائے اس کے کہ ان کے روشن کارناموں کو اخلاف کے سامنے بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا۔ "اسلام کی صحیح تاریخ" لکھنے کا دعویٰ کرنیوالے مسلمان اہلِ قلم بھی حضرت عبداللہ بن سعدؓ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی خوبیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور وہ اسلامی تاریخ کے "ایک مجرم" کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، ذیل میں ایسے ہی الزامات اور ان کی حقیقت بیان کی جارہی ہے۔

عبداللہ بن سعد کا ارتداد

واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے عبداللہ بن سعد نے اسلام قبول کر کے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، اور پھر مرتد ہو کر مشرکین مکہ سے جا ملے تھے، اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کا حکم دیدیا تھا، چاہے یہ کعبہ کے پردوں میں چھپے ہوئے ملیں۔ لیکن یہ حضرت عثمان غنیؓ کے پاس بھاگ کر چلے گئے اور انھوں نے انکو

چھپالیا۔ پھر جب مکہ میں اطمینان ہوگیا تو حضرت عثمانؓ ان کو لیکر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے معافی طلب کرنے اور حضرت عثمانؓ کے سفارش کرنے پر حضورؐ نے ان کو معاف کردیا، اور ان کے دوبارہ اسلام کو قبول کرلیا۔[1]

اس واقعہ کو بنیاد بنا کر حضرت عبداللہؓ بن سعد ہی کو ارتداد کا طعنہ نہیں دیا جاتا، بلکہ حضرت عثمان غنیؓ پر بھی "مرتد کی پشت پناہی" اور اس کی "بے جا سفارش" کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔

یقیناً ارتداد بہت بڑا جرم ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہیکہ اسلامی قانون کے مطابق مرتد واجب القتل ہوتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن سعد کے قتل کا حکم بھی دیدیا تھا۔ لیکن کیا ان کے لئے توبہ کا دروازہ بھی بند ہوگیا تھا؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن سعد کی توبہ کو قبول نہیں فرلیا تھا؟ پھر کیا توبہ کے بعد اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے توبہ قبول کرلینے کے بعد کسی کو یہ حق حاصل ہیکہ عبداللہ بن سعد کو ارتداد کا طعنہ دے؟ اور کیا توبہ کے بعد حضرت عبداللہ بن سعدؓ نے اپنی زندگی کے ایک ایک عمل سے اپنی توبۃ النصوح کا ثبوت نہیں فراہم کردیا؟ پھر کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی الاسلام تھدم ما کان قبلھا کے یہ مصداق نہیں ہوئے؟۔

رہ گیا اس سلسلہ میں حضرت عثمانؓ غنی پر الزام کا معاملہ، تو اس کی حقیقت اسی سے واضح ہیکہ ان ہی کی فہمائش اور کوشش سے حضرت عبداللہ بن سعد کو دوبارہ اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، جسے حضرت عثمانؓ کی خیرخواہی اور دینی حمیت کے بجائے "مرتد کی پشت پناہی" سے وہی لوگ تعبیر کرسکتے ہیں جو خوف خدا سے عاری اور انجام آخرت سے بالکل ہی بے پرواہ ہوگئے ہوں۔ ورنہ ظاہر ہیکہ حضرت عثمان غنیؓ

---

[1] ترجمہ اسد الغابہ ج ۵ ص ۲۳۷۔

نے تو ایک گم کردہ راہ شخص کو راہ ہدایت دکھا کر اس کی نیز اپنی آخرت کی بھلائی کا کام کیا تھا، اور اس کام کو بُرا کہنے اور اس پر طعنہ زنی کرنے کی ہمت وہ شخص کیسے کر سکتا ہے جس کو اسلام کی صداقت اور آخرت کی جوابدہی کا یقین ہو؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مرتد کو تجدیدِ اسلام پر آمادہ کرنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے، خصوصاً ایسی صورت میں کہ مرتد سے جسمانی طور پر کوئی رشتہ بھی ہو، کیونکہ رشتہ کا بھی یہی تقاضا ہوتا ہے کہ انجام آخرت کی فکر کی جائے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کی مبارک زندگیاں ارشاد و ہدایت کے اسی عظیم الشان کام کے لئے وقف رہیں۔

پھر مرتد کی توبہ قبول ہونے کا واقعہ کوئی ایسا تو نہیں جو صرف عبداللہ بن سعد ہی کے ساتھ خاص ہوا اور اس کے احکام معلوم نہ ہوں؟ خلیفۂ اوّل سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں اشعث بن قیس نامی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا، جب یہ شخص قتال مرتدین کے موقع پر گرفتار ہو کر آیا اور جان بخشی کی درخواست کی تو حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اسکو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اپنی بہن ام فروہ کا اسکے ساتھ نکاح بھی کر دیا۔[1]

تو پھر عبداللہ بن سعد کا ہی جرم ناقابلِ معافی کیوں ٹھہرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توبہ قبول کر لینے کے باوجود ان پر طعنہ زنی کرنے کا حق کسی کو کیسے حاصل ہو جائے۔

افریقہ کے خمس کا معاملہ

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ حضرت عبداللہؓ بن سعد افریقہ کے فاتح تھے، اس سلسلہ میں ان پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مالِ غنیمت میں سے خمس (پانچواں حصہ) خود اپنے لئے نکال لیا۔ گویا حضرت عبداللہ بن سعد پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے افریقہ کے مالِ غنیمت میں خیانت کی اور کل مال بھیجنے کے بجائے پانچواں حصہ خود اپنے

---

[1] عثمان ذوالنورین ص ۱۹۳ بحوالہ الیعقوبی ج ۲ ص ۱۲۹۔

لئے روک لیا ۹۔

اس الزام کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ افریقہ کی مہم بہت سخت تھی، اس لئے حضرت عبداللہ بن سعد کا حوصلہ بڑھانے کے لئے خود خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان غنیؓ نے ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تمہارے ہاتھوں پر افریقہ فتح ہوگیا، تو مال غنیمت کا وہ حصّہ جو بیت المال کا ہوگا یعنی کل مال کا خمس (پانچواں حصّہ) اس کا خمس (یعنی کل مال کا پچیسواں حصّہ) تم کو بطور انعام ملے گا۔ چنانچہ جب افریقہ فتح ہوگیا تو خلیفہ کے وعدہ کے مطابق اتنا ہی حصّہ یعنی بیت المال والے حصّہ کا خمس حضرت عبداللہ بن سعد نے اپنے لئے روک لیا تھا، پھر خلیفہ کے مطالبہ کرنے پر یہ حصّہ بھی انھوں نے واپس کردیا تھا۔

ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

> ۲۷ھ میں عثمان غنیؓ نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو افریقہ پر لشکر کشی کا حکم دیا تو ترغیباً اور جہاد کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ان سے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس علاقہ کو تمہارے ہاتھوں فتح کردیا تو مال غنیمت کے خمس کا خمس تمہارا انعام ہوگا۔ عبداللہ بن سعد نے فتح کے بعد مال غنیمت کے چار حصّے تو حسب ضابطہ مجاہدین میں تقسیم کردیئے، اور پانچویں حصّہ (یعنی بیت المال والا حصّہ) کا پانچواں حصّہ (یعنی کل مال غنیمت کے خمس کا خمس) خود لے لیا، یہ بات لوگوں کو ناگوار ہوئی، اور ایک وفد نے جاکر اس کی شکایت حضرت عثمانؓ سے کی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ جہاد کا حوصلہ بڑھانے کے لئے خمس کا خمس زیادہ دینے کا میں نے ہی ان سے وعدہ کیا تھا، ایسا حضرت عمرؓ بھی کرتے تھے، اب معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے، اگر تم لوگ اس سے خوش ہو تو یہ حصّہ ان کا ہوگیا، اور اگر ناخوش ہو تو واپس ہو جائیگا۔ وفد کے لوگوں نے کہا کہ ہم اس سے خوش نہیں ہیں تو حضرت

عثمانؓ نے کہا کہ پھر واپس ہے ، اور عبداللہ بن سعد کو لکھ دیا کہ خمس کا خمس واپس کر دو ، [1]

اس تفصیلی روایت کی درج ذیل باتیں لائق توجہ ہیں ، جن سے خیانت کا الزام خود بخود بے حقیقت بن جاتا ہے ۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن سعد نے خمس (پانچواں حصہ) نہیں لیا تھا ، بلکہ ضابطہ کے مطابق کل مال غنیمت کے چار حصّے مجاہدین میں تقسیم کر دیئے تھے ، اور بیت المال کے حصّہ میں کا خمس (یعنی کل مال کا پچیسواں حصہ) خلیفہ کے وعدہ کے مطابق اپنے لئے نکال لیا تھا ۔

۲۔ یہ خمس کا خمس بھی حضرت عبداللہ نے من مانی کر کے نہیں نکالا تھا ، بلکہ خلیفۂ وقت نے وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ مہم تمہارے ہاتھوں سر ہو گئی تو اتنا تمہیں انعام ملے گا ، بس یہ وہی انعامی رقم تھی جس کا خلیفہ نے وعدہ کیا تھا ۔

۳۔ حوصلہ افزائی کے لئے اس قسم کے خصوصی انعامات دینا حضرت عثمان کی اختراع یا کنبہ پروری نہیں تھی ، بلکہ حضرت عمرؓ بھی ایسا کیا کرتے تھے [2] جس سے علم ہوا کہ امام کو مال غنیمت میں سے اس قسم کے "تشجیعی انعامات" دینے کا حق حاصل ہے ۔

---

[1] طبری ج ۳ ص ۳۱۲ ۔ [2] چنانچہ حضرت عمرؓ نے جنگ بویب کے موقع پر اسی طرح حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ کو خمس کا چوتھائی حصّہ دیا تھا (فتوح البلدان ص ۲۶۷) خود رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ طائف کے موقع پر مؤلفۃ القلوب کو اتنا زیادہ مال دے دیا تھا کہ انصار کو شکایت پیدا ہو گئی تھی جس کا ازالہ حضور نے فرمایا تھا (بخاری ، غزوۂ طائف) نیز اسی قسم کے احکام حضرت ابو بکرؓ نے بھی جاری کئے ۔

(طبری ج ۳ ص ۳۸۴)

۴۔ لوگوں کے اعتراض پر، باوجود قانونی حق حاصل ہونے کے حضرت عثمانؓ نے یہ رقم بھی حضرت عبداللہ بن سعد سے واپس طلب کرلی تاکہ کسی کو یہ غلط فہمی نہ باقی رہے کہ یہ خصوصی انعام صرف اس لئے ہے کہ عبداللہ ان کے رضاعی بھائی ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں حضرت عبداللہؓ بن سعد پر خیانت کا، یا حضرت عثمانؓ پر اقربا پروری کا الزام لغو ہونا بالکل واضح ہوجاتا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں ایک طرف حضرت عثمانؓ کی رعایا پروری اور رائے عامہ کے احترام کی پالیسی ظاہر ہوتی ہے وہیں حضرت عبداللہؓ بن سعد کی بے نفسی اور استغناء کا بھی علم ہوتا ہے کہ ایک جائز حق ہونے کے باوجود محض غلط فہمی کے ازالہ کے لئے وہ اس سے دستبردار ہوگئے، لیکن کس قدر افسوسناک ہے یہ بات کہ اس ایثار کے باوجود "سبائی پروپیگنڈہ" آج بھی جاری ہے؟۔

مصر کی گورنری کا معاملہ

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں جب حضرت عمروؓ بن العاص کی قیادت میں مصر فتح ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے مصر کے نشیبی حصہ کا گورنر حضرت عمروؓ ہی کو مقرر کیا، اور بالائی حصہ کا گورنر حضرت عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا، پھر حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور خلافت میں پورے مصر کو ایک صوبہ بنا کر وہاں کے انتظام کو دو حصوں میں تقسیم کردیا حضرت عمروؓ بن العاص کو گورنر اور فوج کا کمانڈر اور حضرت عبداللہ بن سعد کو بیت المال کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا۔ حضرت عمرؓ کو اپنے دور خلافت میں حضرت عمروؓ بن العاص سے یہ شکایت تھی کہ مصر جیسے سرسبز و شاداب علاقہ سے جتنا خراج وصول ہونا چاہیئے اتنا نہیں ہورہا ہے، پھر حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بھی یہ شکایت رفع نہیں ہوئی، اور بیت المال کے افسر کی حیثیت سے حضرت عبداللہؓ بن سعد نے حضرت عثمانؓ کو یہ اطلاع دی کہ عمروؓ بن العاص کیوجہ سے خراج کم وصول ہورہا ہے

اسی طرح حضرت عمروؓ نے حضرت عثمانؓ کے پاس یہ لکھ کر بھیجا کہ عبداللہ بن سعد میری جنگی تدبیروں کو کمزور کر رہے ہیں، حضرت عثمانؓ نے ان دونوں بزرگوں کے درمیان بڑھتی ہوئی تلخی کو دیکھ کر حضرت عمرو بن العاصؓ کو معزول کر کے حضرت عبداللہ بن سعد ہی کو گورنر بھی مقرر کر دیا[1]

حضرت عبداللہؓ بن سعد کے اس تقرر پر اعتراض کرتے ہوئے بڑی عجیب اور لچر بات یہ کہی جاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ان کو صرف اس لئے گورنر بنا دیا کہ وہ ان کے دودھ شریکی بھائی تھے۔ حالانکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عبداللہ نہ مصر کے لئے نئے تھے نہ ہی ان کو پہلی مرتبہ عہدہ ملا تھا۔ بلکہ جیسا کہ بیان ہوا کہ ان کو مصر کے بالائی حصہ کا حاکم حضرت عمرؓ ہی نے مقرر کر دیا تھا۔ پھر جیسا کہ تفصیل سے واضح ہوا کہ ان کے اور حضرت عمروؓ بن العاص کے درمیان پالیسی کا اختلاف پیدا ہو گیا تھا کیونکہ حضرت عمروؓ مالیات سے زیادہ فوجی وعسکری انتظام پر توجہ دیتے تھے اور مالیات کو اس کا تابع رکھنا چاہتے تھے جبکہ حضرت عبداللہؓ مملکت کے استحکام کے لئے مالیات کی فراہمی پر اولین توجہ مبذول کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی لئے دونوں کے مذاق و مزاج کی رعایت کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ نے دونوں کو عہدے دیئے تھے لیکن پالیسی کے اس اختلاف نے جب نزاع کی صورت اختیار کر لی اور دونوں نے خلیفہ کے پاس شکایت لکھ کر بھیجی تو حضرت عثمانؓ نے حضرت عمروؓ کو معزول کر دیا۔ اور انتظامیہ و مالیہ دونوں شعبوں کو یکجا کر کے اس کا منتظم حضرت عبداللہ کو مقرر کر دیا، اب رہا یہ سوال کہ معزولی حضرت عمروؓ کے بجائے حضرت عبداللہؓ کی بھی ہو سکتی تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نظام مملکت کے لئے مالیات کی جو اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، حضرت عمروؓ کا معاملہ یہ تھا کہ اس طرف ان کی بالکل توجہ ہی نہ تھی جس کی شکایت حضرت عمرؓ کو بھی رہی۔ اور حضرت عبداللہؓ کے توجہ دلانے کے

---

[1] الکامل ج ۳ ص ۸۸۔

باوجود انھوں نے اپنی پالیسی میں تبدیلی گوارہ نہ کی، جب خود حضرت عثمانؓ نے ان سے اس کی شکایت کی تو انھوں نے صاف جواب دیدیا کہ "اونٹنی اتنا ہی دودھ دے سکتی ہے جتنا اس کے تھنوں میں ہو" اس جواب کے بعد حضرت عثمانؓ کو یقین ہوگیا کہ حضرت عمروؓ اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے اور ان کے رہتے مصر کی آمدنی میں اضافہ نہ ہوسکے گا۔ تب انھوں نے ان کو معزول کرکے حضرت عبداللہؓ ہی کو گورنر بھی مقرر کردیا۔ اس تقرری کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا، اور مصر کے خراج کی آمدنی ۲۰ لاکھ سالانہ سے بڑھ کر ۴۰ لاکھ سالانہ ہوگئی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمروؓ کو مخاطب کرکے یہ کہا بھی۔

یاعمرو هل تعلم ان تلك	اے عمروؓ! کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری سبکدوشی
اللقاح درت بعدك (طبری ج ۵)	کے بعد ان ہی اونٹنیوں نے دودھ دیا۔

حضرت عمروؓ بن العاص کی معزولی اور ان کی جگہ حضرت عبداللہؓ بن سعد کی تقرری کو ایک عام انتظامی کارروائی سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے، پھر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس کارروائی کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ حضرت عبداللہؓ بن سعد انتظامی طور پر کامیاب گورنر ثابت ہوئے یا ناکام؟ اور بیت المال کی آمدنی میں اضافہ ہوا یا نہیں؟ تو ان دونوں سوالوں کا واضح جواب یہی ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے اپنے تقرر کو ہر طرح جائز ثابت کردکھایا اور خراج کی آمدنی بھی دوگنی کردی، مگر "سبائی عینک" ان چیزوں کو کہاں دیکھتی ہے سبائیوں کو تو بس اسلامی شخصیات کو مجروح کرنے اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے ہی سے دلچسپی ہے، چنانچہ جب حضرت عبداللہؓ بن سعد کے تقرر کو ناجائز ثابت کرنا ہوتا ہے تو سبائی قلم حضرت عمروؓ بن العاص کو "فاتح مصر" اور اعلیٰ کمالات کا حامل گردانتا ہے لیکن پھر یہی عمروؓ بن العاص جنگ صفین کے موقع "گردن زدنی" قرار دیدیئے جاتے ہیں۔ بس یہی ہے وہ شاطرانہ چال جس کی زد میں پوری اسلامی تاریخ آگئی۔ والی اللہ المشتکی

جہانتک حضرت عبداللہؓ بن سعد اور حضرت عمروؓ بن العاص کے درمیان ہونے والے اس اختلاف کا معاملہ ہے تو خود ان دونوں بزرگوں، ان کے ہمعصروں اور ان کے اخلاف نے اسے خالص انتظامی اختلاف رائے ہی سمجھا اور بس، اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حضرت عمروؓ بن العاص کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے جو خود ایک جلیل القدر صحابی تھے افریقہ کی مہم میں حضرت عبداللہ بن سعد کی ماتحتی میں جنگ میں شرکت کی. کیا اس کے بعد بھی سبائیوں کو حضرت عبداللہؓ بن سعد کی تقرری پر اعتراض کا حق ہے؟۔





شیعیت کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ہے



ایک طرف مذہب اسلام اور دوسری طرف مذہب شیعہ

مولانا عبد العلی فاروقی کے قلم سے

قیمت

حضرت ولید بن عقبہ

مولانا محمد شفیق الدین

ناشر: مکتبہ "البدر" کاکوری، لکھنؤ